کائنات اور انسان

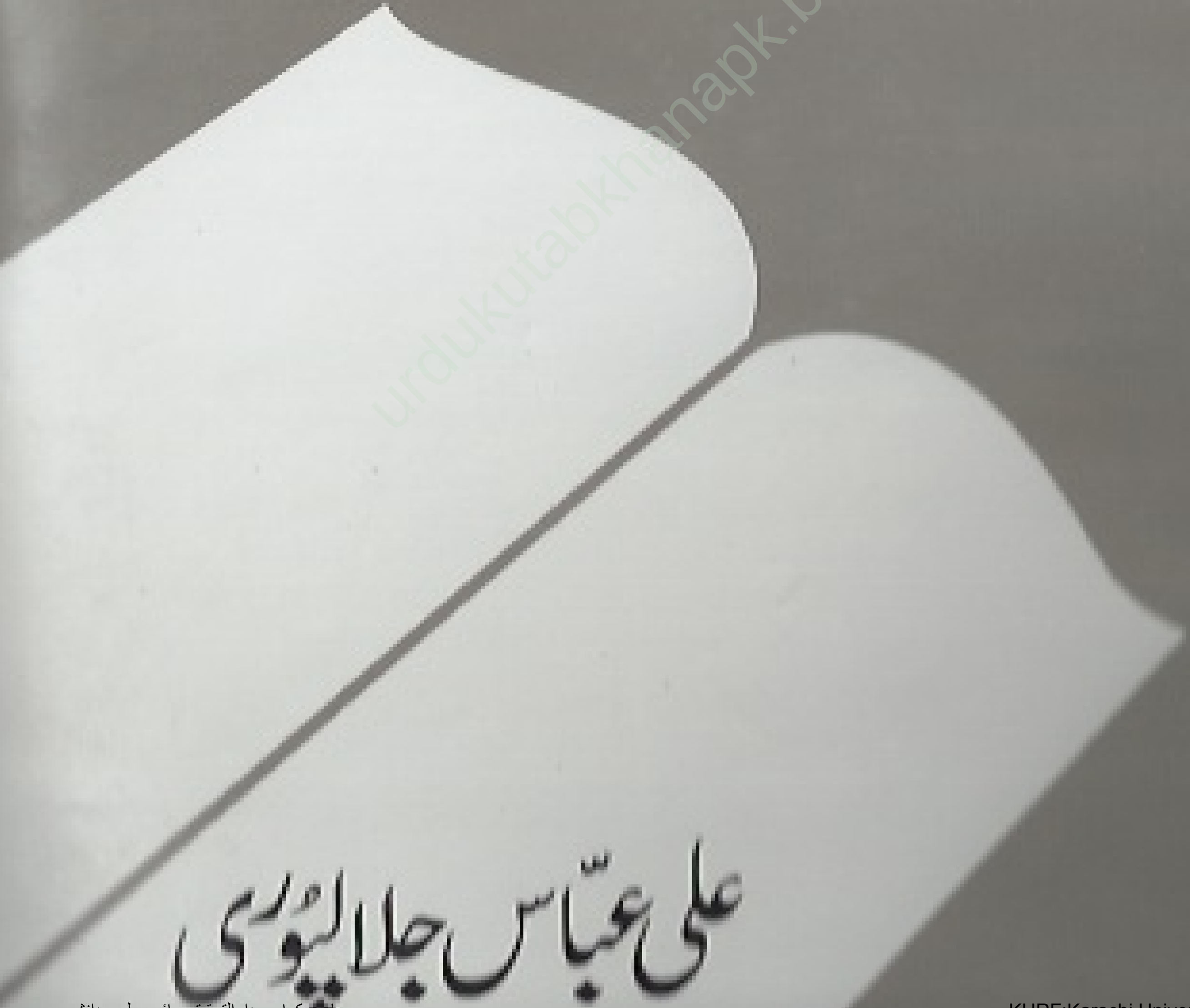

علی عبّاس جلالپوری

KURF:Karachi University Research Forum

اُردو کُتب خانہ

URDUKUTABKHANAPK.BLOGSPOT

نام کتاب : کائنات اور انسان

ناشر : تخلیقات' لاہور۔

اہتمام : لیاقت علی

سنِ اشاعت : 2011ء

پرنٹر : اکرم پریس لاہور۔

ضخامت : 228 صفحات

قیمت : 220/- روپے

اپنے چھوٹے بھائی علی اصغر مرحوم

کی

یاد میں

اُردو کُتب خانہ
URDUKUTABKHANAPK.BLOGSPOT

اردو کتب خانہ
URDUKUTABKHANAPK.BLOGSPOT

"ایک اچھا باغبان غیر ضروری خود رَو جڑی بوٹیوں
کو اس لیئے نہیں اکھاڑ پھینکتا کہ وہ اُن سے
نفرت کرتا ہے بلکہ اِس لیئے کہ اسے پھولوں
سے محبت ہوتی ہے"

اردو کتب خانہ
URDUKUTABKHANAPK.BLOGSPOT

پیش لفظ

مدت ہوئی میں نے لائف کے جریدے میں ایک عکسی تصویر دیکھی تھی جس میں ایک دل کش سرسبز وادی کا منظر ہے ۔ یہ وادی چاروں طرف سے نیلگوں پہاڑیوں میں گھری ہوئی ہے ۔ اس کے عین بیچ ایک ندی بہہ رہی ہے جس میں پیٹ کے بل لیٹے ہوئے چند مادر زاد ننگے وحشی پانی پی رہے ہیں آسمان پر کہکشاں کے رنگین عکس جھلملا رہے ہیں جن کے نظر افروز رنگ کیمرے میں محفوظ کر لئے گئے ہیں اس عکسی تصویر کے نیچے لکھا ہوا ہے کہ انسان کا آغاز وحشت سے ہوا تھا لیکن ذہن کے ارتقا اور سائنس کی ترقی کے طفیل آج وہ اس قابل ہو گیا ہے کہ نظام ستارگاں کے بوقلموں رنگوں کا عکس لے سکے پیٹ کے بل لیٹ کر پانی پینے والے وحشی کا سفر کہکشاں کی رنگین تصویر کشی تک ـــــ بس یہی داستان آئندہ اوراق میں بیان کی گئی ہے ۔

علی عباس جلالپوری

جلال پور شریف
۴ ر فروری سنہ ۱۹۸۴ء

رُوحوں کا مت

انسان کے قدیم آباؤ اجداد لنگور، چمپانزی اور گوریلا کے چچیرے بھائی تھے ابتدا میں اُنہیں
رح درختوں میں بسیرا کرتے تھے۔ تاریخ کے طویل زمانوں میں جب جنگل برفانی تودوں کی لپیٹ میں آ
گئے وہ پہاڑوں کی کھوہوں میں رہنے لگے۔ زمانے کے گذرنے کے ساتھ انہوں نے دو ٹانگوں کے بل
لنا سیکھ لیا جس سے ان کے ہاتھ کام کے لئے آزاد ہو گئے اور وہ لٹھ تھام کر گھومنے پھرنے لگے
ٹھ ان کے بچاؤ کا ہتھیار بن گیا اور وہ اس سے جانوروں کا شکار بھی کھیلنے لگے۔ قدیم پتھر کے زمانے ہی
ں انہوں نے لکڑیاں رگڑ کر آگ سلگانے اور اسے محفوظ کرنے کا طریقہ معلوم کر لیا تھا۔ آگ کے الاؤ اُن
ل اندھیری راتوں کو روشن بھی کرتے تھے اور درندوں کو غار کے قریب پھٹکنے سے روکتے بھی تھے۔ لٹھ
ور آگ کے استعمال سے ایک نیا حیوان وجود میں آیا جسے نیم انسان کہا جاتا ہے۔ نیم انسان نے قدرت
کے جبر کو توڑ کے رکھ دیا جس سے دوسرے حیوانات آج تک آزاد نہیں ہو سکے۔ رفتہ رفتہ اُس نے لٹھ کے
سرے سے نوکیلا پتھر باندھ کر برچھا بنا لیا جب کہ دوسرے درندے بدستور پنجوں اور دانتوں سے کام
تے رہے۔ اس ہنرمندی کی تہ میں وہ تبدیلیاں کارفرما تھیں جو تاریخ کے زمانوں میں قُدرت کے شدائد کے
خلاف طویل کشمکش کرتے ہوئے اس کے مغزِ سر میں واقع ہوئی تھیں۔ ایک تو یہ کہ اس کے مغزِ سر کے حجم
یں اضافہ ہو گیا اور دوسرے یہ کہ مغزِ سر کے اس حصے میں جسے نیو کارٹکس کہتے ہیں سوچ اور خودشعوری کی
صلاحیتیں بیدار ہو گئیں۔ اس جوہرِ ذہن کی نشوونما نے جہاں اس کے ذہن میں عقدوں کا شعور پیدا کیا وہاں
یں سلجھانے کے نئے وسائل بھی فراہم کر گئے۔ وہ مل جل کے دوسرے حیوانات درندے اور پرندے

بدستور جبلتوں کے اسیر رہے اور آج بھی ہیں جب کہ نیم انسان کے ذہنی ارتقاء نے ان جبلتوں کے تصرف کو توڑ دیا اور اپنی نئی فطری صلاحیتوں کے طفیل اس نے فطرت کے قوانین کو سمجھنے اور انہیں اپنے حق میں ڈھالنے کا آغاز کیا۔ برچھے کے استعمال، آگ کی دریافت، پہیئے اور کشتی کی ایجادات اور گفتگو نے اس کے اعتماد نفس میں اضافہ کیا۔ اس نے ہڈی کی سوئی اور چمڑے کے تسمے سے کھالیں سی کر جاڑے کی ٹھٹھر سے محفوظ رہنے کا راز بھی معلوم کر لیا اور گوشت کے ٹکڑوں کو آگ پر بھون کر زیادہ خستہ اور مزیدار بنا لیا۔ اس نے ذہنی ترقی کے باعث جہاں اپنے خارجی ماحول کے ساتھ مفاہمت پیدا کرنے کی کوشش کی وہاں اس کی داخلی دنیا میں بھی عجیب و غریب تبدیلیاں رونما ہونے لگیں۔ نفسیات کا ایک قانون ہے کہ انسانی ذہن سدا حرکت میں رہتا ہے۔ وہ ہر وقت کوئی نہ کوئی بات سوچتا رہتا ہے۔ ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ ایک صحیح الدماغ شخص کا ذہن جامد ہو جائے یا سوچنا چھوڑ دے۔ سوچ کا یہ عمل بیداری ہی سے خاص نہیں ہے بلکہ سوتے میں بھی جاری رہتا ہے۔ اسی کے کارن ہم خواب دیکھتے ہیں جو انسان سے خاص ہے۔ بے شک حیوانات اور پرندے بھی ذہن رکھتے ہیں لیکن خود شعوری کے نہ ہونے کے سبب وہ خواب نہیں دیکھ سکتے نہ بے زبان اپنے خیالات اور جذبات کا اظہار کر سکتے ہیں۔

ہمارے نیم انسان کو اپنے مخصوص ذہنی جوہر کے طفیل ہتھیار بنانے، خوراک ذخیرہ کرنے تن ڈھانپنے یا کتے اور گدھے وغیرہ کو سدھانے میں کچھ زیادہ دقت محسوس نہیں ہوئی لیکن خواب اس کے لئے خاصی پریشانی کا باعث بن گئے ہوں گے۔ یہ بات تو ممکن نہیں تھی کہ وہ خوابوں کے بارے میں نہ سوچتا یا خوابوں کی دنیا سے کنارہ کشی اختیار کر لیتا چنانچہ خارجی مظاہر کے اسباب کی تلاش کے ساتھ ساتھ اس نے داخلی عالم پر بھی غور کرنا شروع کیا اور اپنی توفیق کے مطابق اسے سمجھنے کی کوشش بھی کی۔ وہ دیکھتا کہ سوتے میں اس کا جسم تو غار میں دراز ہے لیکن وہ جنگلوں میں شکار کھیلتا پھرتا ہے یا اپنے مرے ہوئے عزیزوں سے ملاقاتیں کر رہا ہے۔ اس عجیب و غریب

صورت احوال کی یہی توجیہہ کی جا سکتی تھی کہ اس کے اندر کوئی شے ایسی بھی موجود ہے جو سوتے میں اس کے جسم سے جدا ہو جاتی ہے اور جاگنے پر لوٹ آتی ہے اس کے ساتھ اس کا روزمرہ کا مشاہدہ تھا کہ اس کی زندگی کا انحصار سانس کی ڈوری پر ہے۔ جب تک یہ ڈوری باقی ہے انسان زندہ رہتا ہے اور اس کے ٹوٹ جانے سے مر جاتا ہے۔ سانس کی اس ڈوری یا ہوا کے اس جھونکے کو ابتدا میں وہ روح سمجھتا رہا۔ چنانچہ قدیم زبانوں میں روح ——— عربی میں ہوا کا جھونکا کے لئے جو الفاظ مستعمل ہیں ان کا لغوی معنی ہوا کا جھونکا یا سانس ہی ہے جیسا کہ رواح (عبرانی)، سائکی (یونانی)، آتما (سنسکرت)، اینے ما (لاطینی)، کے لغوی معنی سے ظاہر ہے۔ شدہ شدہ ان الفاظ کے لغوی معنی تو سانس یا ہوا کا جھونکا ہی رہے لیکن اصطلاحی معنی بدل گئے اور روح کا اطلاق بھوت۔ چلتی پھرتی کایا یا ہمزاد پر ہونے لگا جو انسان کی ہم شکل ہے۔ اس کی پیدائش کے ساتھ معرض وجود میں آتی ہے اور موت کے بعد کسی دوسرے پُراسرار عالم کو چلی جاتی ہے۔ روح کے مفہوم کی یہ تبدیلی بنی نوع انسان کی تاریخ میں بڑی انقلاب آفریں اور دور رس ثابت ہوئی کیونکہ مذاہب عالم کی بنیاد اسی تصور پر اٹھائی گئی تھی۔

پتھر کے زمانوں کے انسان کی ذہنی و قلبی واردات کو سمجھنے کے لئے آسٹریلیا، افریقہ ملائشیا وغیرہ کے وحشی قبائل کے مشاہدے اور نفسیات طفلی سے رجوع لایا جاتا ہے۔ انسان کے قدیم آباء بھی آج کل کے وحشی قبائلیوں اور بچوں کی طرح حقیقت خارجی اور تخیل میں فرق روا نہیں رکھتے تھے یعنی تخیلاتی عالم ہی کو حقیقی عالم سمجھتے تھے۔ ہمارا روزمرہ کا مشاہدہ ہے کہ بچے کھلونوں کو اپنے آپ پر قیاس کر کے انہیں بھی اپنی ہی طرح کی جیتی جاگتی اور باشعور ہستیاں مان لیتے ہیں، وہ اپنے کھلونوں سے باتیں کرتے ہیں، انہیں کھانا کھلاتے ہیں، انہیں کپڑے پہناتے ہیں، ان کے رہنے کے لئے مکان بناتے ہیں، ان کا بیاہ رچاتے ہیں۔ ایک بچہ

کہتا ہے "ہٹ جاؤ! میرا اُلّو کاٹ کھائے گا۔" دوسرا کہتا ہے "میرا گھوڑا پیاسا ہے۔ اس کے لئے پانی لاؤ"۔ ایک بچی کہتی ہے "میری گڑیا تمہارے گڈے سے روٹھ گئی ہے۔ دیکھو وہ اس کی طرف پیٹھ کئے بیٹھی ہے" دوسری کہتی ہے "میں اپنے گڈے کے لئے مٹھائی لا رہی ہوں بے چارہ کل سے بھوکا بیٹھا ہے"۔ اس طرح بچے اپنے ہی خیالات اور احساسات کو اپنے کھلونوں سے منسوب کر لیتے ہیں اور یوں اپنی تخیلاتی دنیا کو حقیقی مان لیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب یہ بچے بڑے ہو جاتے ہیں تو ذہنی بلوغت کے ساتھ ان پر تخیلاتی عالم اور حقیقی عالم کا فرق واضح ہو جاتا ہے اور وہ اپنے بچپن کے کھلونوں کو بے شعور اور بے جان مان لیتے ہیں۔ لیکن پتھر کے زمانے کا انسان ہزاروں برسوں تک ذہنی بلوغت سے ناآشنا رہا اور بعض پہلوؤں سے وہ آج بھی ذہنیاً نابالغ ہے۔ وہ عمر بھر اپنے تخیلات کے بنائے ہوئے عالم ہی کو حقیقی سمجھتا رہا ہمارے بچوں کی طرح وہ بھی بے جان اشیا کو اپنے آپ پر قیاس کر کے ذی حیات اور ذی روح خیال کرتا اور ان سے اپنے ہی جیسے احساسات و جذبات منسوب کیا کرتا تھا جب سے روحوں کے مت کا آغاز ہوا۔ اسے اس بات کا یقین تھا کہ دنیا کی ہر شے میں روح کا بسیرا ہے۔ سورج چاند، دھرتی، تارے، چشمے، دریا، جھیلیں، پہاڑ، پتھر، درخت، پھل پھول، پرندے چرندے سب اسی کی طرح زندہ اور ذی روح ہیں اور اسی کی طرح ایک دوسرے سے پیار یا نفرت کرتے ہیں، لڑتے جھگڑتے ہیں، کھاتے پیتے ہیں بیاہ کرتے ہیں روٹھ جاتے ہیں من جاتے ہیں۔

قدیم انسان کے ذہن میں خارجی و داخلی یا معروضی اور نفسیاتی کا فرق بھی ناپید تھا آج کل کے وحشی قبائلیوں کی طرح اس کا بھی عقیدہ تھا کہ جو واردات انسان کے خارج میں واقع ہوتے ہیں وہی اس کے داخل میں بھی رونما ہوتے ہیں۔

مندرجہ بالا تصریحات کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں۔ کہ روحوں کے مت کی تشکیل پذیری

دو مراحل میں ہوئی تھی۔

۱۔ بے جان اشیاء سے رُوحیں منسوب کرنا[1]

۲۔ ہر ذی حیات کو ذی رُوح سمجھنا[2]

کائنات کے مظاہر اور اشیاء کو اپنی ہی طرح کی رُوحیں منسوب کر کے قدیم انسان نے پہلے پہل کائنات سے اپنا ذہنی اور جذباتی رشتہ جوڑنے کی کوشش کی۔ رُوحوں کے اس مت کے اثرات و نتائج بنی نوع انسان کے دل و دماغ پر بڑے گہرے ہوئے علم انسان کے طلبہ نے جادو، شمن مت، دیو مالا، مذہب، ہسٹریت سے لے کر لوک بات لوک شاعری، لوک گیتوں، لوک کہانیوں اور توہمات میں ان آثار کا کھوج لگایا ہے۔ شمن اور جادوگر اپنے ٹونے ٹوٹکوں میں ہمیشہ نیک اور بد رُوحوں سے مدد مانگتے رہے ہیں، آسمان سُورج، چاند، تاروں وغیرہ پر قابو پانے کے طریقے بتاتے رہے ہیں۔ آسمان، سُورج چاند تاروں، بادل، دھرتی وغیرہ میں رُوحوں کا بسیرا تسلیم کرنے سے دیو مالا کی تدوین عمل میں آئی۔ مذاہب عالم کی بنیاد بھی رُوح کی بقا کے تصور پر رکھی گئی ہے۔ صُوفی اور ویدانتی انفرادی رُوح کو رُوحِ کُل کا عضویاتی حصہ مانتے رہے ہیں اور اس میں کھو جانے کے لئے تپ جپ اور ریاضت کرتے رہے ہیں۔ شاعری کے اسالیب اور تمثیلیں اس قیاس کی تخلیق ہیں کہ آسمان، بادل، پھول درخت وغیرہ ذی رُوح و ذی حیات ہیں اس لئے شاعر ان سے قلبی رابطہ پیدا کر لیتا ہے۔

آئندہ ابواب میں ہم جادو، دیو مالا اور مذہب کا ذکر تفصیل سے کریں گے ان سب پر رُوحوں کے مت کے گہرے اثرات ثبت ہوئے ہیں اور انہیں رُوحوں کے

---

[1] ANIMISM

[2] ANIMATISM.

منت کی طرح کائنات سے ساتھ انسان کے ذہنی و جذباتی رابطے کی مختلف صُورتیں سمجھا جاسکتا ہے ۔ فی الوقت ہم ان آثار و روایات اور توہمات کو سپردِ قلم کریں گے جو رُوحوں کے منت سے یادگار ہیں ۔

عام عقیدہ یہ ہے کہ رُوحیں جو آدمی کی زندگی پر اثر انداز ہوتی ہیں وہ دو قسم کی ہیں ۔ خبیث اور سعید یا نیک اور بد ۔ نیک رُوحیں آباؤ واجداد کی ہیں جو وقتاً فوقتاً اپنے عزیزوں کے آڑے آتی ہیں اور لوگ مشکل وقت میں ان سے رجُوع لاتے ہیں ۔ آباء پرستی اسی عقیدے کی پیداوار ہے ۔ روم اور چین (انقلاب سے پہلے کا چین) میں خاص اہتمام سے اجداد کی رُوحوں کی پُوجا کی جاتی تھی ۔ ان کے لئے خوبصورت معبد تعمیر کیئے جاتے تھے ۔ اُن کے بتوں کے سامنے کھانے چُن دیئے جاتے تھے ۔ رُومیوں کے ہاں بُرے لوگوں کی رُوحوں کو لاروے اور نیک لوگوں کی رُوحوں کو مانس کہا جاتا تھا ۔ وہ لاروے سے خوفزدہ رہتے تھے اور مانس کی تکریم کرتے تھے ۔ مُغل اور تاتار رُوحوں کے مسکن کو تنگری کہتے تھے اور ان کے لئے چڑھاوے لے جاتے تھے ۔ وہ پروہت یا شمن کے توسط سے ان رُوحوں سے رابطہ قائم کرتے تھے ۔

اکثر اقوام میں یہ عقیدہ موجُود رہا ہے کہ خاص تقریبات پر بزرگوں یا پُرکھوں کی رُوحیں اپنے سابقہ مسکن کو لَوٹ آتی ہیں چنانچہ لذیذ کھانوں کا دسترخوان ان کے لئے بچھایا جاتا تھا ۔ عام مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ نیک لوگوں کی رُوحیں اپنے مزاروں میں زندہ موجود ہیں اور اپنے عقیدت مندوں کی مشکلات دور کرنے پر قدرت رکھتی ہیں ۔ اسی لئے لوگ مزاروں پر منتیں مانتے ہیں اور قیمتی چڑھاوے نذر کرتے ہیں مُراد بر آنے پر یہ لوگ ان مزاروں پر

جاکر چوکی بھرتے ہیں اور منت کے چاول پکوا کر بطور تبرک لے جاتے ہیں ۔ بانجھ عورتیں
مزار کے قریب اُگے ہوئے پیڑ کی ٹہنیوں پر رنگ برنگی دھجیاں باندھ کر حصولِ اولاد کی
خاطر منتیں مانتی ہیں ۔ سندھ میں ایسے درخت کو ولی مانا جاتا ہے ۔ اور اسے تھگڑ ٹیر کہا جاتا
ہے (تھگڑ بہ معنی دھجی) بلوچی عورتیں اسی مقصد کے لئے شاہ و سادا کے مزار پر اُگے ہوئے
رخت سے ہم کنار ہوتی تھیں ۔ ہندو عورتیں پیپل کے درخت کو زندہ تسلیم کرتی ہیں ۔ اور
ولاد کی خاطر اس کا پرکمّا (طواف) کرتی ہیں ۔ اسی طرح تلسی ، کنول ، پلاس کی پوجا
ی جاتی ہے۔ گویے گوالیار میں تان سین کی قبر پر اُگے ہوئے املی کے درخت کے پتے چباتے
یں تاکہ ان کا گلا سُریلا ہو جائے ۔ نجد میں عورتیں اولادِ نرینہ کے لئے حضرار بن ازور کی قبر
کے قریب اُگے ہوئے پیڑ سے ہم کنار ہو کر منت مانتی تھیں چنانچہ اسے بدعت سمجھ کر محمد بن
دالوہاب نے کٹوا دیا تھا۔

بدروحوں میں شیاطین ، بھوت پریت ، غول ، نسناس ، آل ، راکھشس ، دیو ، پری
ں ، شیخ سدو ، چڑیل ، ڈائن ، عفریت وغیرہ کا ذکر لوک کہانیوں میں تواتر سے آتا ہے اور
ہ لوح عوام کے ساتھ بعض اچھے خاصے پڑھے لکھے لوگ بھی ان پر عقیدہ رکھتے ہیں ۔
ابوں میں قلیانوس کو شیطان کا باپ بتایا گیا ہے جو سوماس بن جان کا بیٹا تھا ۔ کہا جاتا ہے
یطان کے چار ماتحت ہیں ۔ ملیتہ ، جاموس ، مبلوط اور یوسف اور نو بیٹے ہیں ذوالبیون
ین ، اوان ، جنان ، مرآ ، لقیس ، ہزبوت ، داسم اور دلہان ۔ ان میں ہر ایک کے سپرد ایک
کام کیا گیا ہے ۔ مثلاً ذوالبیون بازاروں میں گھومتا پھرتا ہے اور لوگوں کو گمراہ کرتا ہے
آدمی کو غم اور اندیشے دیتا ہے ، اوان بادشاہوں کا درباری اور ندیم ہے ۔ اور

انہیں ظلم وستم پر اکساتا ہے، حقان شرابیوں کا سرپرست ہے، مرّ گانے بجانے والوں اور ناچنے والیوں کے پاس رہتا ہے۔ لقیس آتش پرستوں کا آقا ہے، مزبوت افواہیں پھیلاتا ہے، داسم میاں بیوی میں پھوٹ ڈالنے کا فریضہ انجام دیتا ہے۔ ان کی اولاد بے شمار ہے جو دنیا میں ہر کہیں پھیلی ہوئی ہے۔ اور لوگوں کو برائی پر آمادہ کرتی رہتی ہے۔ مسلمانوں کا ایک فرقہ یزیدیہ جو ملک شام میں پایا جاتا ہے۔ شیطان کو ملک طاؤس کہتا ہے جو کوئی شیطان کو بُرا کہے یہ لوگ اُسے جان سے مار دیتے ہیں۔

اسلامی روایات میں شیطان ایک جن تھا جسے آگ سے پیدا کیا گیا تھا۔ شروع میں وہ بڑا عابد و زاہد تھا لیکن جب خدا نے اُسے آدم کو سجدہ کرنے کا حُکم دیا تو اس نے سرکشی کی جس کی پاداش میں وہ راندۂ درگاہ ہوا۔ اسے بنی آدم کا کُھلا دشمن قرار دیا گیا اور اس کے ہتھکنڈوں سے بچنے کی تلقین کی گئی۔ آدم اور حوا کے ساتھ اسے بھی جنت سے نکال کر اس مادی عالم میں بھیج دیا گیا جہاں وہ ان کی اولاد کو ورغلا کر گناہ کرنے کی ترغیب دیتا ہے۔ بعض ارباب تاویل مثلاً اخوان الصفا اور سر سید احمد خان نے شیطان کی شخصیت سے انکار کیا ہے اور اُسے شر کا میلان قرار دیا ہے جو ہر شخص کی طینت میں موجود ہے۔ دوسری طرف منصور حلاج ابن عربی اور ان کے پیرو شیطان کو ایک جوانمرد موحد سمجھتے ہیں۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ شیطان نے آدم کو سجدہ کرنے سے انکار کر کے خدا کی وحدانیت کا اثبات کیا تھا کیوں کہ غیر اللہ کے سامنے سجدہ کرنا شرک ہے۔ اسی بنا پر سرمد شیطان کی پیروی کی تلقین کرتے ہیں۔ ؎

سرمد تو حدیث کعبہ و دیر مکن　　در کوچۂ شک چو گمرہاں سیر مکن
رَو راہ روی ز شیطان آموز　　یک قبلہ گزیں و سجدۂ غیر مکن

بعض شاعروں نے شیطان کو بطلِ جلیل یا ہیرو کا درجہ دیا ہے۔ کیوں کہ اس نے ہمیشہ کی ذلت اور رسوائی قبول کرلی لیکن اپنی آزادیِ فکر پر آنچ نہ آنے دی چنانچہ بلیک ملٹن اور اقبال آزادیِ اظہار اور حفظِ خودی کے باعث اُسے ہیرو مانتے ہیں۔

شیطان کا تصور مجوسیت سے یادگار ہے۔ بنی اسرائیل ابتدا میں شیطان کے قائل نہیں تھے بلکہ اپنے خداوند خدا یہواہ کو خیر اور شر کا منبع سمجھتے تھے۔ جب بنوکدنضر شاہِ بابل نے یروشلم پر قبضہ کیا تو تمام بنی اسرائیل کو قیدی بنا کر بابل لے گیا جہاں وہ کم و بیش اسّی برس تک اسیری کی حالت میں مقیم رہے۔ اسی دوران میں انھوں نے بابل سے میلادِ آدم، جنتِ عدن، طوفانِ نوح، شجرِ حیات وغیرہ کے ساتھ شیطان کا تصور بھی مستعار لیا۔ مجوسی اسے اہرمن کہتے تھے جو شر کا خالق بھی ہے اور اس کا نمائندہ بھی سمجھا جاتا ہے۔ اس طرح یہودیوں میں الہیاتی دوئی نے بار پایا: ہرمزد اور اہرمن یا یہواہ اور شیطان کی دوئی جس میں ہرمزد اور یہواہ اس کائنات میں خیر کے اصول ہیں اور اہرمن اور شیطان شر کی علامتیں ہیں جن میں ازل سے کشمکش جاری ہے کبھی اصولِ خیر کی فتح ہوتی ہے۔ اور کبھی اصولِ شر غالب آجاتا ہے۔ لفظ شیطان حبشی زبان سے عبرانی میں آیا۔ اس کا لغوی معنی سرکش اور باغی کا ہے۔ عزازیل، بعلزبول، لوسی فر، ابلیس اور خناس بھی اسی کے نام ہیں۔ شیخ عبدالکریم الجیلی نے اپنی کتاب "انسانِ کامل" میں لکھا ہے کہ لفظ ابلیس تلبیس سے مشتق ہے۔ جس کا معنی ہے شبے میں پڑ جانا۔ شیطان چونکہ شبے میں پڑ گیا تھا کہ آدم کو سجدہ کروں یا نہ کروں اس لئے اُسے ابلیس کہا گیا۔ یہ درست نہیں ہے۔ ابلیس کا لفظ یونانی زبان سے ماخوذ ہے۔ لہ

جیسا کہ ہم ذکر کر چکے ہیں شیطان کو جن مانا گیا ہے۔ اہلِ بابل جن کو ایک پوشیدہ مخلوق سمجھتے تھے اوستا میں اسے جنی کہا گیا ہے۔ عربی میں جن کا مادہ پوشیدگی کا مفہوم رکھتا ہے۔ جیسے جنین: وہ بچہ

لہ یونانی زبان کا لفظ DIABOLOS ہے۔ انگریزی DEVIL اور فرانسیسی [illegible] اسی ترکیب کا پہلا جزو [illegible] ابلیس ہوا
جزو سے ہے۔

جو رحم مادر میں چھپا ہوا ہو۔ جنت: وہ زمین، جو درختوں کی کثرت سے ڈھک گئی ہو۔ مجنون: وہ شخص جس کی عقل پر پردہ پڑ گیا ہو وغیرہ۔ اسی بنا پر سر سید احمد خان نے جنات سے مراد پوشیدہ مخلوق ہی لی ہے، جیسے کہ مثلاً جراثیم یا دوسرے ملکوں کے صحرائی اور بدوی جو متمدن معاشرے سے الگ تھلگ رہتے ہیں۔ بعض کتب تفسیر میں جنوں کی دو قسمیں بیان کی گئی ہیں: مسلمان اور کافر۔ نیک اور بد۔ مسلمان جن کسی کو نہیں ستاتے جب کہ کافر جن لوگوں کے درپے ایذا رہتے ہیں۔ بعض احادیث کی رُو سے جنوں کے کئی قبائل نے اسلام قبول کر لیا تھا جن کی اولاد آج بھی باقی ہے۔ اثنا عشری فرقے کی ایک روایت ہے کہ جناب علیؑ ابن ابی طالب نے جنوں سے لڑائی کر کے انہیں شکست دی تھی اور مسلمان کیا تھا کہا جاتا ہے کہ جن بھی عام آدمیوں ہی کی طرح کھاتے پیتے ہیں اور شادی بیاہ کرتے ہیں۔ ان کی پہچان یہ ہے کہ وہ آنکھ نہیں جھپکتے۔

عام عقیدے کے مطابق جن ایک طاقت ور مخلوق ہے اور وہ کسی شخص کے قبضے میں آجائے تو اس کے سارے کام سنوار دیتا ہے۔ جیسا کہ مثلاً الٰہ دین چراغ کی کہانی کا جن تھا۔ تسخیر جن کی روایت کلدانی ہے۔ اسلامی ممالک میں تسخیر جن کے لئے چلے کاٹے جاتے ہیں۔ اس مقصد کے لئے پیرزادے اور مشائخ چالیس روز تک گوشۂ خلوت میں ایک دائرہ کھینچ کر اس میں بیٹھ جاتے ہیں، اور ورد وظیفہ میں مصروف رہتے ہیں۔ وہ کھانا پینا چھوڑ دیتے ہیں۔ پہلے روز ایک بادام کھاتے ہیں اور پھر ہر روز ایک بادام کا اضافہ کرتے جاتے ہیں۔ پندرہ بیس روز کے بعد جنات شیر، بھیڑیے اور چیتے کی خوفناک شکلوں میں ان کے سامنے آنے لگتے ہیں تاکہ وہ ڈر کر بھاگ جائیں۔ جو شخص اس چلے میں ثابت قدم رہے وہ تسخیر جن پر قادر ہو جاتا ہے اور وہ جن اس کی ہر خواہش پوری کرتا ہے۔ آخری روز جنات کا بادشاہ آتا ہے اور اس کے ساتھ نمک اور روٹی کھا کر بھائی چارہ

قائم کرلیتا ہے۔ ڈاکٹر براؤن کو ایک ایرانی نے بتلایا کہ چلے کاٹنے والے تنہائی، فاقہ زدگی اور توقعات کے باعث واہموں میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور اسی حالت میں انہیں عجیب و غریب صورتیں بھی دکھائی دینے لگتی ہیں[1] ۔

ملک خطشان جنات کا بادشاہ ہے جو کوہ قاف پر رہتا ہے۔ تفسیر کبیر میں لکھا ہے کہ جنات کے چار قبائل ہیں

(۱) فلکیہ : یہ جو آسمان پر رہتے ہیں (۲) قطبیہ : قطب شمال کے مکیں (۳) وہمیہ : ان کا مسکن آدمیوں کے اوہام میں ہے۔ (۴) فردوسیہ : یہ جنت میں رہتے ہیں ۔

یہودیوں کی ایک روایت میں حوا سے پہلے آدم کی زوجہ للت تھی جسے جنت سے باہر نکال دیا گیا اور وہ شیاطین و جنات کی ملکہ بن گئی ۔ ماقبل اسلام کے عربوں کا عقیدہ تھا کہ جن شاعروں پر کلام القا کرتے ہیں ۔ کئی عرب شاعروں نے اپنے کلام میں جنوں سے ملاقات کرنے کا دعوے کیا ہے ۔ عرب جل پریوں کو غواصہ کہتے تھے اور انہیں جنوں کی اولاد سمجھتے تھے ۔ کتاب الاغانی میں ہارون الرشید کے درباری گویے اسحٰق موصلی کے بارے میں لکھا ہے کہ اس کے دعوے کے مطابق اس کے مشہور نغمے لحن ماخوری کی دھن شیطان نے اسے سکھائی ایک دن شیطان ایک معزز شیخ کی صورت میں اس کے پاس آیا اور اسے یہ دھن سکھا کر غائب ہوگیا ۔ ڈوزی اپنی تاریخ اندلس میں لکھتا ہے کہ مشہور مغنی زریاب کو اس بات کا یقین تھا کہ وہ سوتے میں جنات کا گانا سنتا ہے چنانچہ وہ راتوں کو خواب میں چونک کر اٹھ بیٹھتا اور اپنی کنیزوں غزلان اور ہندہ سے کہتا کہ بھاگ کر آؤ اور اپنی بانسریاں لیتی آؤ اور وہ آجاتیں اور زریاب انہیں وہ گانا سکھا دیتا جو جنات نے سوتے میں اسے سنایا تھا ۔ عرب ایک شاعر ابو محمد عبد السلام کو دیک الجن (جن کا مرغا) کہتے تھے

---

[1] A YEAR AMONG THE PERSIANS

کیوں کہ ان کے خیال میں وہ جنّوں کے زیرِ اثر شعر کہا کرتا تھا۔

حامد عبدالقادر لکھتے ہیں کہ بابل کے باشندوں کے عقیدے کے مطابق جب کوئی شخص بیمار پڑتا ہے تو یہ ارواحِ خبیثہ یعنی شیاطین اور جنّات کی کارروائی ہوتی ہے۔ یا پھر مردِ بیمار کے اعمالِ بد یا دشمنوں کے ٹونے ٹوٹکوں کا اثر ہوتا ہے۔ وہ کہتے تھے کہ ہر مرض کا الگ شیطان ہوتا ہے خود مرض کچھ نہیں گتا۔ شیاطین پر قابو پانے اور ان کے اثرات کو زائل کرنے کے لئے کاہنوں کا ایک مستقل طبقہ موجود تھا جو بدارواح پر قابو پاکر انہیں بے بس کر دیتا تھا۔ یہ کاہن مذہبی پیشوا بھی تھے اور ارواح پر ان کا تسلّط تسلیم کیا جاتا تھا۔ کاہن بدرُوح کو اس کا نام لے کر پُکارتا تھا اور پھر منتر پڑھ کر اسے بھگا دیتا تھا۔ ہمارے یہاں کے عامل، جن گیر یا سیانے اُنہیں بابل کا ہنوں کی اولادِ معنوی ہیں۔ عالم اسلام میں یہ عقیدہ ہر کہیں موجود ہے کہ جنّات امراض لگاتے ہیں اور مصائب نازل کرتے ہیں۔ جنّوں کا بسیرا کھنڈروں، اُجڑے ہوئے مکانوں، جنگل بیابان کے درختوں، پہاڑی کھوہوں اور ویران باؤلیوں میں ہوتا ہے۔ الف لیلہ ولیلہ میں کئی کہانیاں ہیں جن میں بیان کیا گیا ہے کہ کسی شخص نے جنگل میں سے گزرتے ہوئے کسی درخت کے نیچے بیٹھ کر کھجوریں کھائیں اور ایک گٹھلی اس زور سے پھینکی کہ کسی جن کے بچے کی آنکھ پھوڑ دی۔ اس پر جن نے اسے پکڑ لیا یا کسی شخص نے ایک درخت کے نیچے جہاں جنّوں کا مسکن تھا پیشاب کر دیا اور جنّوں کا عتاب اس پر نازل ہوا۔

ہمارے دیہات میں جب کوئی جن کسی خوبصورت جوان لڑکی کو پکڑ لیتا ہے تو وہ ہاتھ پاؤں چلانے لگتی ہے اور واہی تباہی بکنا شروع دیتی ہے۔ لڑکی کے ماں باپ جن نکالنے کے لئے کسی عامل کو بُلاتے ہیں جو جن کو حاضر کرنے کے لئے اُسے حضرت سلیمان کا واسطہ دیتا ہے

---

[1] العلاج النفسانی۔

ہیں حضرت سلیمان کے نام سے سخت خائف ہیں اور ان کا نام آتے ہی تھر تھر کانپنے لگتے ہیں کیوں کہ حضرت سلیمان نے ان کے ایک طاقتور سردار صخرا لجنی کو بحیرۂ طبریہ میں قید کر دیا تھا چنانچہ ان کا ہیبت ناک نام سنتے ہی جن لڑکی کو چھوڑ کر بھاگ جاتا ہے۔ ایران میں جن نکالنے کے عمل کو دعوت کہتے ہیں۔ جس عورت کو جن نے پکڑ رکھا ہو اسے دائرے میں بٹھا کر اس کے گرد کالی مرغی یا بھیڑ کا خون چھڑک دیتے ہیں اور افسوں پڑھتے ہیں۔ مریضہ کے قریب خوشبویات عنبر، عود صندل، عبیر وغیرہ رکھتے ہیں یا بخور جلاتے ہیں۔ افسوں مختلف جنوں کے ناموں پر مشتمل ہوتا ہے اور خاتم سلیمانی کے نام پر جن کو بلایا جاتا ہے۔ ہمارے ہاں عامل یا جن گیر کو سیانا کہتے ہیں جو بعض اوقات حاضرات جن کے لیے کسی معصوم بچے کو وسیلہ (میڈیم) بنالیتا ہے۔ سیانا پکڑ والی عورت کی باتیں بڑے غور سے سنتا ہے کیوں کہ عورت کی زبان سے جن بول رہا ہوتا ہے۔ کوئی جن سرکشی پر اتر آئے اور عورت کا پیچھا نہ چھوڑے تو عورت کو نہایت بے دردی سے پیٹتے ہیں۔ بزعم خود وہ جن کو مار رہے ہوتے ہیں۔ کئی دفعہ سیانا پکڑ والی عورت کی ناک میں سرخ مرچوں کی دھونی دیتا ہے۔ بعض اوقات نوجوان سیانے پکڑ والی خوش رو لڑکیوں کو بہلا پھسلا کر لے بھاگتے ہیں۔ اس قسم کی پکڑ کی تہہ میں دو ہی اسباب ہوتے ہیں۔ (۱) ذہنی امراض ہسٹیریا وغیرہ (۲) تریا چلتر۔ یا تو مریضہ ہسٹیریا، فتورِ ذہن یا مرگی میں مبتلا ہوتی ہے یا وہ اپنے آشنا سے جدا ہو جانے کے باعث پکڑ کا ڈھونگ رچا لیتی ہے۔ راقم کو ایک پکڑ کا قصہ یاد ہے۔ بیاہ سے پہلے ایک لڑکی کی ایک نوجوان سے آشنائی تھی۔ بیاہ کے بعد وہ سسرال چلی گئی تو جن نے اسے پکڑ لیا۔ جب کبھی وہ میکے آتی پکڑ بھی غائب ہو جاتی تھی۔ کہیں کہیں چراغ میں دم کیا ہوا پلیتہ جلا کر بھی جن نکالا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جن فولاد سے ڈرتے ہیں اس لیے سفر میں جس شخص کے پاس، چھری، کلہاڑی وغیرہ ہو اس سے جن

چھیڑ چھاڑ نہیں کرتے ۔ زرد یا سیاہ مرغی کے خون سے لکھا ہوا افسوں جن کو دفع کرتا ہے ۔ سفید مرغے کو فرشتہ سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس کی بانگ سے جن بھوت بھاگ جاتے ہیں ۔ فارسی کی ایک کتاب مجمع الدعوات میں جنوں سے بچنے کے لئے افسوں اور دعائیں درج کی گئی ہیں ۔ منگل اور سنیچر کی راتوں کو جنوں کی راتیں کہا جاتا ہے ۔ کہتے ہیں کہ رات کو جب کوئی کتّا مسلسل غوں غوں کرتا ہے یا گدھا ہینگنے لگے تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ جن باہر نکلے ہوئے ہیں ۔ یہ دونوں جانور جنوں کو پہچان لیتے ہیں ۔ یہ توہم بھی عام ہے کہ جب کسی مرد عورت پر جن یا پری کا سایہ پڑ جائے وہ کسی نہ کسی مرض میں مبتلا ہو جاتا ہے ۔ اور اس کے ہوش وحواس مخبط ہو جاتے ہیں ۔ اسے پرچھائیں یا آسیب کہتے ہیں ۔

عورتوں کے خیال میں بانجھ پن کی وجہ آسیب ہی ہوتا ہے ۔ اس کے وظیفے کے لئے عامل سبز الائچی ، لونگ یا قند دم کرکے کھلاتے ہیں اور تعویذ یا گنڈا عورت کے پیڑو سے باندھ دیتے ہیں یا اس کے گلے میں لٹکا دیتے ہیں ۔

اس مقصد کے لئے کسی بزرگ کے مزار پر تنے ہوئے شامیانے کی چوبوں کے ساتھ رنگ برنگ کے فیتے یا دھاگے لٹکائے جاتے ہیں[1]

مغربی ممالک میں شیطان[2] کا مت جو وسطی زمانوں میں ہر کہیں رائج تھا آج بھی اکثر شہروں میں موجود ہے اس کے ماننے والے حلِ مشکلات کے لئے شیطان سے رجوع لاتے ہیں ۔ عارفیوں[3] کا عقیدہ ہے کہ کائنات کی تخلیق خدا نے نہیں شیطان نے کی ہے ۔ وہ یہودا اسکریوتی کو جس نے مخبری کرکے جناب عیسٰے کو گرفتار کروایا تھا سچا نبی مانتے ہیں اور جناب عیسٰی کے سخت دشمن ہیں ۔ وہ کہتے ہیں کہ کوئی فرد (شیطان) نے خدا کے خلاف

---

[1] قانونِ اسلام ، جعفر شریف

[2] CULT OF SATAN

[3] GNOSTICS

عبادت کی تھی تو اچھا ہی کیا تھا۔ عارفی خدا کی بجائے شیطان کی عبادت کرتے ہیں یہی عقیدہ وسطی زمانوں کی جادوگرنیوں کا بھی تھا! اور اسی پر آج کے شیطان پرست[1] قائم ہیں یہ لوگ شیطان کا تصور ایک دراز قد سیاہ پوش کی صورت میں کرتے ہیں جس کے سر پر سینگ ہیں۔ ٹانگوں پر گھنے بال ہیں۔ اس کی دُم بھی ہے اور بکرا اس کا خاص جانور ہے۔ شیطان پرستوں کا ذکر ہم جادو کے باب میں تفصیلاً کریں گے۔

انیسویں صدی کے اواخر میں امریکہ اور یورپ میں حاضراتِ ارواح[2] کا چکر چلا جو قدیم شمن مت سے یادگار ہے۔ شمن کا لفظ اصل میں سنسکرت کا سمن ہے جس کا معنی تپسوی کا ہے۔ افریقہ، آسٹریلیا، ملائشیا، انڈونیشیا، میلانیشیا، جزائر غرب الہند کے قبائل اور امریکی لال ہندیوں کے اپنے اپنے شمن ہوتے ہیں۔ جو بیک وقت طبیب، کاہن اور فال گیر ہوتے ہیں۔ وہ ایک مدت کسی پہاڑ کی کھوہ یا ریگستان کی تنہائی میں گذارتے ہیں اور منتر پڑھتے رہتے ہیں حتیٰ کہ ان میں "روحانی قوت" پیدا ہو جاتی ہے۔ جس کے بل پر لوگوں کے عُقدے حل کرتے ہیں، بیماروں کا علاج کرتے ہیں اور مُردوں کی ارواح کو حاضر کر کے ان سے مدد مانگتے ہیں۔ ان کا دعویٰ ہے کہ ان کا رابطہ روحوں سے بلاواسطہ قائم ہے۔ ہمارے ہاں بھی یہ عقیدہ ہے کہ فاتحوں میں روحیں حاضر ہوتی ہیں اس لئے ان کی ضیافت کے لئے طرح طرح کے کھانے پکا کر چُن دیئے جاتے ہیں۔ بعض عورتیں حاضراتِ ارواح بھی کرتی ہیں۔ افاداتِ سلیم میں لکھا ہے۔

"عورتیں روحوں کو بلانے کے لئے بیٹھک دیتی ہیں۔ یا حاضرات کرتی ہیں جو عورت یہ کام کرتی ہے۔ وہ جمعرات کے دن خوشبو، زیور اور عُمدہ پوشاک

---

[1] SATANISTS

[2] SPIRITUALISM.

سے آراستہ ہو کر بیٹھ جاتی اور گانا سُنتی ہے۔ جب کوئی پری یا رُوح اسکے سر پر آتی ہے تو وہ اپنا سر ہلانے لگتی ہے۔ دوسری عورتیں اپنی اپنی حاجتیں اس کے سامنے پیش کرتی ہیں اور وہ ہر ایک کے سوال کا جواب دیتی جاتی ہے۔

شمن مت کی حاضرات میں وہی عناصر پائے جاتے ہیں جو مغربی رُوحانیت کی خصوصیات ہیں یعنی (۱) بیٹھک (۲) ازخود رفتگی (۳) واسطہ (۴) رُوح کا حاضر ہونا۔ (۵) واسطے کی زبان سے سوالات کا جواب دینا۔

مغرب میں حاضرات ارواح کا آغاز ۱۸۴۸ء میں اضلاع متحدہ امریکہ سے ہوا۔ نیویارک کے نواح میں ایک بستی تھی جسے ہائڈس ول کہتے تھے۔ وہاں ایک کنبہ رہتا تھا مسٹر جے ڈی فاکس، اس کی بیوی اور دو بیٹیاں مارگریٹ اور کیٹ۔ یہ لوگ راتوں کو دستک کی آوازیں سُنا کرتے تھے جنہیں وہ ارواح سے منسوب کرتے تھے۔ شُدہ شُدہ اس بات کا چرچا ملک بھر میں ہونے لگا جس سے حاضراتِ ارواح کی شروعات ہوئی اور واسطوں کے کاروبار کو فروغ ہوا۔ واسطے دو قسم کے تھے جسمانی اور ذہنی۔ جسمانی واسطے تاریک کمرے میں رُوح کو نورانی دُھندلکے کی صورت میں دکھاتے تھے اور دستک کی آواز سُنواتے تھے اور وزنی اشیاء کو متحرک کرتے تھے۔ جب کہ ذہنی واسطے ارواح سے باتیں کرواتے تھے اور ان کی زبان سے رُوحیں سوالوں کے جواب دیتی تھیں۔

امریکیوں نے حاضراتِ ارواح کا یہ ادارہ لال ہندیوں سے لیا ہے۔ لال ہندیوں کے شمن مُردہ عزیزوں کی رُوحوں کو بلا کر ان کی ملاقات زندہ عزیزوں سے کرواتے

رہے ہیں۔ امریکیوں نے لال ہندیوں کی تکنیک[1] اور شمن[2] کے واسطے کو اپنا لیا۔ راتوں کو ایک خاص کمرے میں اکٹھا ہونا۔ حاضرین کا واسطے کی فوق الطبع قوت پر کامل اعتماد، واسطے کا اپنے آپ پر بے خودی[3] کی کیفیت طاری کر لینا اور اس عالم میں روحوں کو دکھانا۔ ان کی آوازیں سنوانا یا ان کے سوالوں کے جوابات پوچھنا یہ سب رسوم لال ہندیوں کے شمن مت سے لی گئی ہیں۔ البتہ ان پر سائنس کی اصطلاحات کے پردے ضرور ڈال دیئے گئے ہیں۔ قبائلی شمن مت میں لوگ سعید اور شقی روحوں پر عقیدہ رکھتے تھے اور ان سے مدد مانگتے تھے یا ان کی خوشنودی طلب کرتے تھے جب کہ حاضرات ارواح میں مردوں کی روحوں کو بلانے اور ان سے رابطہ قائم کرنے ہی پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ دوسرا فرق یہ ہے کہ قبائلی شمن مرد ہوتے ہیں جب کہ حاضرات ارواح میں عام طور سے عورتیں واسطے کا کام کرتی ہیں۔ ان حقائق کے پیش نظر حاضرات ارواح کو قدیم شمن مت ہی کی بدلی ہوئی صورت کہا جا سکتا ہے۔

حاضرات ارواح کا کاروبار دو باتوں سے فروغ پاتا رہا ہے (۱) مکر و فریب (۲) فریب نفس یعنی واسطوں کی فریب کاری اور ناظرین کی فریب خوردگی۔ انیسویں صدی کے اواخر میں حاضرات ارواح کا چرچا زور و شور سے ہوا تو ان لوگوں نے جو سائنس کے انکشافات کے باوجود قدیم توہمات سے اپنا ذہنی رابطہ قائم کرنے پر مصر تھے نہایت جوش و خروش سے اس کا خیر مقدم کیا۔ اور اس کے حوالے سے "روحانیت" کی ازلی و ابدی صداقتوں کی توثیق کرنے کی کوشش کی۔ ان کا دعویٰ

---

[1]

[2] MEDIUM

[3] TRANCE

تھا اور آج بھی ہے کہ روحانی عالم سائنس دانوں کی دسترس سے ماورا ہے اور سائنس خواہ کتنی ہی ترقی کر جائے اس پُر اسرار عالم تک اس کی رسائی نہیں ہو سکتی۔ جس طرح ایگزنڈر نے منکوسکی کے تصورِ زمان و مکان کو حسبِ منشا توڑ موڑ کر ارتقائے بروزی[1] کے حق میں استدلال کیا، جس طرح برگساں نے جوششِ حیات کے مفروضے سے قدیم نو اشراقیت کا احیاء کرنے کا جتن کیا، جس طرح اڈنگٹن اور جیمز جینز نے اضافیت اور مقادیرِ عنصر کی مثالیاتی ترجمانی کی بعینہٖ حاضراتِ ارواح کرنے والوں نے قدیم شمن مت کو جدید سائنس کی زبان میں پیش کر کے اسے علمی نظریہ کی صورت دینے کا حیلہ کیا۔ سائنس دانوں نے ان کے دعوے کو تحقیق کی کسوٹی پر پرکھا تو معلوم ہوا کہ اکثر و بیشتر عورتیں جو واسطوں کا کام کرتی ہیں . رجوتی ہیں اور حاضراتِ ارواح کی بیٹھک میں سائنس کے جدید ترین میکانکی آلات سے کام لے کر سادہ لوح اور زود اعتقاد ناظرین کو دھوکا دیتی ہیں۔ قدیم دور کے شمنوں کی طرح ان واسطوں نے پُر اسرار ہونے کا جامہ اوڑھ رکھا ہے اور مرجعیت اور کسبِ زر کے لیئے لوگوں کو چکمے دیتی رہتی ہیں۔ جو شخص اپنے کسی مُردہ عزیز کی روح سے ملنے کے شوق میں ان کی بیٹھک میں آتا ہے وہ قبولیت اور اثر پذیری[2] کے تحت دھندلکے میں سفید پوش مرد یا عورت کو دیکھ کر جھٹ اسے پہچان لیتا ہے اور واسطے کی فوق العادہ روحانی قوت پر ایمان لے آتا ہے۔ نفسیات کی رو سے اثر پذیر طبائع جھٹ سمعی و بصری واہموں[3] میں مبتلا ہو جاتی ہیں اور ایسی شکلیں دیکھنے لگتی ہیں جن کا

---

[1] ـ EMERGENT EVOLUTION

[2] ـ SUGGESTIBILITY

[3] ـ VISUAL AND AUDITORY HALLUCINATION

ل اوا قع کوئی وجود نہیں ہوتا۔ اور ایسی آوازیں سُنتی ہیں جن کا بولنے والا کوئی نہیں ہوتا۔ جادو، ہپناٹسس اور حاضرات کی اکثر حالتیں اسی اثر پذیری کے کرشمے ہیں۔ اسی اثر پذیری کے تحت لوگوں کو جن، بھوت اور چڑیلیں دکھائی دیتی ہیں۔ حاضرات ارواح والے، غیب بین اور ٹیلی پیتھی والے اثر اندازی اور اثر پذیری کی کیفیات کا منفی استعمال کر رہے ہیں۔

حاضراتِ ارواح کے واسطوں کے بارے میں جن علمائے نفسیات نے تحقیقی کام کیا ہے ان میں ژنگ، فلورنوئے اور ولیم براؤن مشہور ہیں۔ اِن کے خیال میں عورتیں جو واسطے کا کام کرتی ہیں یا تو ہسٹیریا میں مبتلا ہوتی ہیں اور منقسم شخصیت رکھتی ہیں۔ اور یا دانستہ فریب دجل سے کام لیتی ہیں۔ واسطے کا کام کرنے والی پیشہ ور عورتیں تکنیکی وسائل سے کام لیتی ہیں۔ سائنس والوں نے ان عورتوں کے مشاہدے سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ یہ پیشہ ور عورتیں زندگی کی تلخیوں اور جذباتی ناکامیوں سے فرار حاصل کرنے کے لئے حاضرات سے رُجوع لاتی ہیں۔ ان کی ذہنی سطح طفلانہ ہوتی ہے اور عالمِ وجد و حال میں جو اکثر منشیات کی کارفرمائی ہوتی ہے وہ بچوں جیسی حرکتیں کرتی ہیں چنانچہ حاضر ہونے والی رُوح کا ذہن واسطے کے ذہن جیسا ہی ہوتا ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ واسطے کے ذہن سے ماورا کوئی رُوح موجود نہیں ہوتی۔ حیرانی کی بات یہ ہے کہ حاضرات والوں کی شعبدہ بازی اور ابلہ فریبی کو بارہا بے نقاب کیا جاچکا ہے لیکن زُود اعتقاد اور وہم پرست لوگ پھر بھی دھوکا کھا جاتے ہیں اور ان کی سادہ لوحی سے فائدہ اٹھا کر حاضرات کا کاروبار کرنے والے کروڑوں ڈالر کما رہے ہیں۔ جولین ہکسلے نے ڈی ایچ راکلف کی کتاب کے مقدمے میں لکھا ہے۔

“اس نے بتایا کہ اس دور میں علمی تحقیق اور تجربے سے کام لینے کے بجائے بعض مسائل میں پُراسرار اور معجزانہ اثبات سے رجوع لایا جاتا ہے۔ میں ایک تحقیقی جماعت کا رکن تھا۔ جس نے حاضرات کرنے والے ایک واسطے کے فریب کو پکڑا تھا اس کے باوجود روحانیت کے ایک قائل نے جو وہاں موجود تھا اسے فریب و جعل ماننے سے انکار کر دیا۔ اور ایک رسالے میں لکھا کہ بے چارے واسطے کو ناحق بدنام کیا گیا ہے۔ یہی واسطہ کچھ عرصے کے بعد پھر حاضرات کرنے لگا .... رالکلف کی یہ تنبیہ قابل قدر ہے کہ خرد دشمنی اور پُراسراریت سے دامن بچانا بہرطور ضروری ہے[1]۔”

بریت پر عقیدہ رکھنا عالمگیر توہمات میں سے ہے۔ یہ بد ارواح ہیں جو انسان کے درپئے ا ہیں۔ بعض زبانوں میں روح اور بھوت کے لیے ایک ہی لفظ پایا جاتا ہے[2]۔ کہا کہ بھوتوں پریتوں کا بسیرا ویرانوں میں ہوتا ہے۔ لیکن راتوں کو یہ بستیوں کا رخ کرتے

---

[1] ILLUSIONS AND DELUSIONS

[2] ی میں SPIRIT اور GHOST کا معنی روح کا بھی ہے اور بھوت کا بھی یہی
زبان کے لفظ GEIST میں ہے۔

ہیں۔ وہ دن کی روشنی سے خائف ہوتے ہیں۔ اسلئے رات کے اندھیرے میں ظاہر ہوتے ہیں
وگوں کو ناحق قتل کر دیا جائے ان کی روحیں بھوت بن کر جائے واردات کے قریب منڈلا
ہیں۔ لوک کہانیوں اور رومانی قصوں میں بھوتوں کا ذکر اکثر ملتا ہے۔ شیکسپیئر کے ناٹک میکبتھ
بنکو کا بھوت اس کی معروف مثال ہے۔ اسی طرح ہیملٹ کا مقتول باپ بھوت کی شکل میں
اپنے بیٹے کے سامنے ظاہر ہوتا ہے اور اسے اپنے چچا سے انتقام لینے پر اکساتا ہے۔ ا
اور اجڑی ہوئی حویلیاں بھوتوں کے مسکن بن جاتی ہیں جیسا کہ فارسی والے کہتے ہیں خانۂ خا
را دیو می گیرد کئی لوگوں نے بھوتوں کو دیکھنے اور اُن سے باتیں کرنے کا دعویٰ کیا ہے لیکن تحقیق
معلوم ہوا کہ یہ اُن کے بصری واہمے تھے۔ ہندوؤں کے ہاں یہ عقیدہ ہے کہ جس شخص کی موت
شرادھ کی رسم ادا نہ کی جائے اس کی آتما بھوت بن کر گھر کے قریب منڈلاتی رہتی ہے شرادھ کی تق
پر گھی، شکر، شہد وغیرہ سے بنایا ہوا ایک بڑا سا لڈو برہمنوں کو کھلایا جاتا ہے۔ اور یہ سلسلہ عر
تک جاری رہتا ہے۔ تب کہیں آتما کو چین ملتا ہے۔ جب کسی ہندو کی پتنی مر جائے اور وہ د
بیاہ کرے تو پہلی عورت کا پریت دوسری پتنی کو ستانے لگتا ہے۔ اس سے بچاؤ کے لئے دوسر
پتنی پہلی پتنی کا ایک چھوٹا سا ٹھپا کسی دھات کا بنوا کر اپنے گلے میں لٹکا لیتی ہے۔ جب
وہ کھانا کھانے بیٹھتی ہے تو پہلے اس ٹھپے کو نوالہ پیش کرتی ہے تاکہ وہ خوش ہو جائے

ہد میں خود کھاتی ہے۔ خیال یہ ہے کہ اس طریقے سے پہلی پتنی کا پریت خوش ہو کر اُسے ستانا چھوڑ
یتا ہے۔ ہندوؤں کے خیال میں بیرا اور پوُن وہ بد رُوحیں ہیں، جنہیں کوئی جادوگر کسی شخص کو آزار
بینے کے لئے بھیجتا ہے۔ پوُن بٹھانے اور پوُن دوڑانے کے محاورے اسی توہم سے یادگار ر
یں۔ چڑیلیں اور ڈائنیں بھی خبیث رُوحیں ہیں۔ کہتے ہیں کہ جب کوئی عورت دردِ زہ کی حالت
ں مر جاتی ہے تو وہ چڑیل یا ڈائن بن جاتی ہے۔ چڑیل کے پاؤں پیچھے کی جانب مُڑے ہوتے
یں۔ ڈائن سیاہ فام اور بد صُورت ہوتی ہے جس کی آنکھیں مشعل کی طرح چمکتی ہیں۔ ڈائنیں خوبصورت
جوانوں کا کلیجہ نکال لیتی ہیں اور وہ بے چارہ تڑپ تڑپ کر مر جاتا ہے۔ میر شیر علی افسوس[1] لکھتا ہے

" ڈائنیں بھی بھٹے کی مشہور ہیں کہ لڑکوں کے کلیجے منتر کے زور سے تُرت نکال لے
اتی ہیں اور ان کی ماؤں کے دلوں میں داغ دے جاتی ہیں۔ کھانا تو اُن کے حضور کسی کو کھلانا
زم نہیں کیوں کہ اُسی وقت اُن کا تیرِ نظر جس پر چلے اسے مار ہی رکھے سوائے اس کے کھو
بھُوا ایسی حالت اُن پر طاری ہوتی ہے کہ اس وقت جس کو دیکھتی ہیں ہوش میں وہ نہیں رہتا پھر
ی دانے انار کے مانند اُن کے پاس سے اُس کے ہاتھ لگتے ہیں۔ کسی حکمت سے ایک لمحہ اُن
اپنی پنڈلیوں کے اندر رکھ چھوڑتی ہے۔ جب تک وہ بے چارہ بیہوش پڑا رہتا ہے۔ نہ ان
ے پر اُن کو رکھ دیتی ہے۔ جب وہ چھیل کر طاق کی صورت پکڑتے ہیں تب اپنی تمام ہم جنسوں
ں بھٹے کر کے کھا جاتی ہے۔ وہاں اس کا کام تمام ہو جاتا ہے۔ اتفاقاً اگر وہ بد ذات پکڑی
ے تو لازم ہے کہ اُس کی پنڈلیوں کو چیر ڈالیں فوراً وہ دانے نکل پڑیں گے چاہیے کہ

---

[1] آرائشِ محفل

جس کے جگر کو صدمہ پہنچا ہو اسے کھلا دیں، خدا کی قدرت سے وہ شفا پانے لگا اور کلیجہ اُس کا ٹھنڈا ہو جائے گا۔"

دوآبے کی عورتیں ایک خبیث آدمی شیخ سدو کو اپنا مرشد مانتی ہیں۔ جسے جنوں نے چیر پھاڑ ڈالا تھا اور جس کی رُوح سے وہ اپنے ٹونے ٹوٹکے کرتی ہیں۔ مدار کی چھڑیوں کی پُوجا کا بھی رواج ہے مدار کے پیرو نعرے لگاتے پھرتے ہیں" دم دم مدار" لوک کہانیوں میں ایسے دیوؤں کا ذکر ملتا ہے جو اپنی رُوح کو طوطے کے رُوپ میں پنجرے میں بند کر کے چھُپا دیتے تھے۔ جب اُن کے دشمن اس پنجرے کو ڈھونڈ کر طوطے کی گردن مروڑ دیتے تو دیو وہیں مر کر ڈھیر ہو جاتے تھے۔ ہندوؤں کے ہاں ایک علم ہے اندر جال: جو شخص یہ علم جانتا ہو وہ اپنی رُوح کو کسی بھی قالب میں منتقل کر سکتا ہے۔ یا دوسرے قالب سے نکال لیتا ہے۔ راجہ گندھرپ سین والئ اُجین کی آتما کو کسی یوگی نے خفا ہو کر گدھے کے قالب میں منتقل کر دیا تھا۔ وہ دن بھر گدھا رہتا اور رات کو اپنے اصل رُوپ میں آجاتا تھا۔ اسی عالم میں اس کا بیاہ رچایا گیا۔ اور اس کے گھر راجہ بکرماجیت پیدا ہوا۔

بدرُوحوں کا ذکر اناجیل میں بھی آیا ہے۔ جناب عیسےٰ ابن مریم کا ایک معجزہ یہ تھا کہ وہ اپنے ہاتھ کے لمس سے بدرُوحیں نکال دیتے۔

——— "جب شام ہوئی تو اس کے پاس بہت سے لوگوں کو لائے جن میں بد رُوحیں تھیں۔ اُس نے اُن کو زبان ہی سے کہہ کر نکال دیا اور سب بیماروں کو اچھا کر دیا۔"

(متی)

——— "اور سُورج کے ڈُوبتے وقت وہ سب لوگ جن کے ہاں طرح طرح

کئی بیماریوں کے مریض تھے انہیں اُس کے پاس لائے اور اُس نے ان میں سے ہر ایک پر ہاتھ رکھ کر انہیں اچھا کیا اور بدروحیں بھی چلا کر اور یہ کہہ کر کہ تو خدا کا بیٹا ہے بہتوں میں سے نکل گئیں اور وہ انہیں جھڑکتا اور بولنے نہ دیتا تھا کیونکہ وہ جانتی تھیں کہ یہ مسیح ہے ۔ (لوقا)

فریسیوں نے جناب عیسیٰ پہ الزام لگایا کہ وہ بعلزبول (شیطان) کی مدد سے روحیں نکالتے ہیں ۔

پھر وہ ایک گونگی بدروح کو نکال رہا تھا ۔ اور جب وہ بدروح نکل گئی تو ایسا ہوا کہ گونگا بولا اور لوگوں نے تعجب کیا لیکن ان میں سے بعض نے کہا یہ تو بدروحوں کے سردار بعلزبول کی مدد سے روحوں کو نکالتا ہے ۔

ایک دفعہ جناب عیسیٰ نے بدروحیں سوروں میں منتقل کر دی تھیں ۔

جب وہ اُس پار گدرینیوں کے ملک میں پہنچا تو دو آدمی جن میں بدروحیں تھیں وہ قبروں سے نکل کر اس سے ملے ۔ وہ ایسے تندمزاج تھے کہ کوئی راستے سے گذر نہیں سکتا تھا ۔ اور دیکھو انہوں نے چلا کر کہا اے خدا کے بیٹے ہمیں تجھ سے کیا کام؟ کیا تو اس لئے یہاں آیا ہے کہ وقت سے پہلے ہمیں عذاب میں ڈالے ۔ اُن سے کچھ دور بہت سے سوروں کا غول چر رہا تھا ۔ پس بدروحوں نے اس کی منت کر کے کہا اگر تو ہم کو نکالتا ہے تو ہمیں سوروں کے غول میں بھیج دے ۔ اس نے اُن سے کہا جاؤ! وہ نکل کر سوروں کے اندر چلی گئیں ۔ اور دیکھو سارا غول کڑاڑے پر سے جھپٹ کر جھیل میں جا پڑا ۔ اور پانی میں ڈوب مرا (متی)

ان اقتباسات سے مفہوم ہوتا ہے کہ کلدانیوں کی طرح یہودیوں اور عیسائیوں کے

عقیدے کے مطابق بھی بدروحیں مرگی، جذام، تپ، گونگے پن وغیرہ امراض کا باعث ہوتی ہیں اور جب انہیں نکالا جاتا ہے تو وہ چیختی ہوئی بھاگ نکلتی ہیں اور انہیں انسانوں سے حیوانوں میں منتقل بھی کیا جاسکتا ہے۔ جناب داؤد کے بارے میں عہد نامۂ قدیم میں لکھا ہے کہ ان کے سُریلے نغمے سن کر بدروحیں ستانا چھوڑ دیتی تھیں۔ بنی اسرائیل کے بادشاہ ساؤل کو بدرُوح ستاتی تو وہ جناب داؤد کو بلوا بھیجتا اور اُن سے گانا سنا کرتا جس سے وہ بدرُوح اُسے ستانا چھوڑ دیتی تھی۔

بدارواح کا تصوّر ایرانیوں کی اخلاقیات میں بھی بار پا گیا تھا۔ مشہور ایرانی دانش مند بزرگ مہر نے دس بدرُوحیں گنائی ہیں جو انسان کی عقل و خرد پر غالب آجاتی ہیں اور جن سے دامن بچانا ضروری ہے۔ یہ ہیں۔ آز (طمع)، نیاز (احتیاج)، خشم، رشک، کینہ، ننگ، نمام (تہمت)، دورُوئی (منافقت)، ناسپاسی (ناشکراپن)، ناپاکدین (بدمذہبی)[1]۔

قدیم اقوام میں یہ عقیدہ عام تھا کہ شیطان خدا کے نیک بندوں کو آزماتا رہتا ہے۔ ازمنۂ وسطیٰ کے یورپ میں خیال کیا جاتا تھا کہ شیطان بعض لوگوں سے ان کی رُوح کے عوض معاہدے کرتا رہتا ہے۔ گوئٹے کے مشہور ناٹک فاؤسٹ کا مرکزی خیال یہی ہے۔ شیطان فاؤسٹ سے کہتا ہے کہ تمہاری رُوح کے عوض میں تمہیں دولت، حکومت اور حسین عورتوں کی محبت دوں گا۔ گوتم بدھ کے سوانح میں ہے کہ جب وہ بڑ کے درخت کے نیچے سمادھی میں بیٹھا تو مارا (شیطان) نے اُسے ہر طریقے سے بہکانے کی کوشش کی۔ گوتم نے دیکھا کہ نیم برہنہ

---

[1] شاہنامۂ فردوسی۔

حسین عورتیں نہایت ترغیب آور انداز میں آنکھیں مٹکا مٹکا کر اور کولھے ہلا ہلا کر اس کے سامنے ناچ رہی ہیں۔ یہ مارا کی کارستانی تھی۔ ولی انتھونی کو بھی شیطان نے اسی طریقے سے گمراہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ شیطان نے جناب عیسیٰ کو بھی آزمایا تھا۔

° اور فی الفور رُوح نے اُسے بیابان میں بھیج دیا اور وہ بیابان میں چالیس روز تک شیطان سے آزمایا گیا۔

پنجاب میں ایک نہایت خوفناک توہم یہ ہے کہ بانجھ عورت اولادِ نرینہ کے حصول کے لئے کسی دوسری عورت کے بیٹے کو کانسی کی چھُری سے ذبح کر کے اس کے لہو میں نہائے تو مقتول کی رُوح اس کے رحم میں چلی جاتی ہے اور وہ بیٹے کو جنم دیتی ہے۔ پولیس نے ایسی کئی خونی عورتوں کا سراغ لگایا ہے۔ ہنگری کی شہزادی مادام باتھوری اپنے شباب کو بحال رکھنے اور دوسروں کی جوان رُوحیں اپنے بدن میں منتقل کرنے کے لئے اپنی جوان لونڈیوں کو قتل کر کے ان کے خون میں نہایا کرتی تھی۔

عرب اور ایران کی لوک بات میں دیو، عفریت، غول، آل، پالیس، بچہ خور جیسی بد رُوحوں کا ذکر ملتا ہے جو انسان کی دشمن ہیں اور اس کی جان لینے کی فکر میں رہتی ہیں۔ غول (لغوی معنی ہے مصیبت، دہشت) کا تصور ماقبل اسلام کے عربوں سے یادگار ہے۔ عرب کہتے ہیں کہ غول راستہ چلتے مسافروں کو بہکا کر ایک طرف لے جاتے ہیں اور جان سے مار دیتے ہیں۔ وہ اپنی شکل بدلنے میں بھی حاذق ہوتے ہیں۔

ایک عرب شاعر تابط شرا نے اپنے اشعار میں اکثر غولوں کا ذکر کیا ہے۔ کعب بن زہیر کا شعر ہے ؎

فما تدوم علی حالٍ تکون بها ۔ کما تلوّن فی اثوابها الغول

(وہ کبھی ایک حالت میں نہیں رہتی ۔ غول کی طرح جو ہمیشہ کپڑے بدلتا رہتا ہے ۔)

نسناس (نصف الناس یعنی آدھا آدمی) ایرانیوں کا تسمہ پا ہے جو کسی ندی کے کنارے بیٹھا رہتا ہے جب کوئی مسافر پار جانا چاہے تو وہ عاجزی سے گڑگڑا کر اس کی منّت کرتا ہے کہ مجھے بھی اٹھا کر لے چلو ۔ مسافر رحم کھا کر اُسے اپنے کندھوں پر بٹھا لیتا ہے ۔ ندی پار کرتے ہوئے نسناس مسافر کی گردن کو اپنی ٹانگوں میں جکڑ لیتا ہے ۔ اور اُسے ہلاک کر دیتا ہے پالیس سوئے ہوئے مسافروں کے پاؤں کے تلوے چاٹ چاٹ کر انھیں موت کے گھاٹ اتار دیتا ہے ۔ آل ایک خطرناک رُوح ہے جو زچہ کا کلیجا چبا جاتی ہے ۔ اس سے بچنے کے لئے ایرانی زچہ کے پاس تلوار رکھتے ہیں ۔ بچہ خور ایک بلا ہے جو بانجھ عورت کے رحم میں رہتی ہے جو جنین کو کھا جاتی ہے ایرانی عورتیں آل سے سخت خائف رہتی ہیں کیوں کہ وہ نومولود بچوں کو کھا جاتی ہے ۔ بچے کی پیدائش کے بعد ماں اور بچے کو آل سے بچانے کے لئے ایک پیاز ماں کے سر پر رکھتے ہیں تاکہ آل دُور رہے آل کے چار پاؤں اور ایک دُم ہوتی ہے ۔ گردن اونٹ کی طرح لمبی اور منہ گدھے کا ہوتا ہے ۔ فولاد سے ڈر کر بھاگ جاتی ہے ۔ دیوؤں، عفریتوں اور پریوں کا ذکر مشرقِ وسطیٰ کی لوک کہانیوں میں اکثر آتا ہے ۔ ایرانیوں کے خیال میں دیو اور عفریت کوہِ دماوند پر بسیرا کرتے ہیں ۔ وہ نہایت عظیم الجثّہ اور ڈراؤنی شکل کے ہوتے ہیں سر پر دو سینگ ہوتے ہیں اور ہوا میں اُڑ سکتے ہیں ۔ فردوسی نے شاہ نامے میں ان کا ذکر کیا ہے ۔ رُستم کے باپ زال کو سیمرغ اور سفید دیو نے پالا تھا اور رستم نے شاہ کیکاؤس کو دیوؤں کی قید سے نجات دلانے کے لئے تلوار اٹھائی تھی ۔ عفریت مادہ دیو ہوتی ہے اور نہایت مکار ہوتی ہے ۔ وہ خوبصورت جوان لڑکیوں کے رُوپ میں جوانوں کو بہکاتی

ہے۔ اور کچھ عرصے کے بعد انہیں جان سے مار دیتی ہے۔ پریاں اور پری زاد نہایت حسین اور طرحدار ہوتے ہیں۔ اُن کا بادشاہ شہپال کوہِ قاف میں رہتا ہے۔ پریاں راتوں کو اُڑتی پھرتی ہیں اور کوئی خوبصورت جوان دکھائی دے تو اسے اپنے تخت پر بٹھا کر پرستان لے جاتی ہیں۔ داستانوں میں ان کا اکثر ذکر آیا ہے پری زاد اور دیو ایک دوسرے کے دشمن ہوتے ہیں۔ پریاں انسانوں کو آزار نہیں پہنچاتیں البتہ کسی پری کا سایہ کسی آدم زاد پر پڑ جائے تو وہ آسیب زدہ ہو جاتا ہے۔

ہندوستان کے ادب میں راکھشسوں کا ذکر آیا ہے۔ جو نہایت خوفناک، قوی ہیکل اور خونخوار ہوتے ہیں۔ راون جو سیتا کو لے بھاگا تھا اور راہو جو سورج چاند کو نگل کر گرہن لگا دیتا ہے راکھشس ہی تھے شیو اور کالی دیوی راکھشسوں کے خلاف لڑتے رہے ہیں۔ گندھرو اور اپسرائیں راجہ اندر کے سورگ کے غلمان اور حوریں ہیں۔ گندھرو خوش گلو موسیقار ہیں جن کی سُر اور تال پر حسین اپسرائیں جوش پرور انداز میں بھاؤ بتا بتا کر ناچتی ہیں۔ اور راجہ اندر اور اس کے درباریوں کو رجھاتی ہیں۔ سنسکرت کے قصوں اور ناٹکوں میں بعض اپسراؤں اور انسانوں کے معاشقوں کا بھی ذکر آیا ہے۔ کالیداس کے مشہور ناٹک شکنتلا کی ہیروئن ایک اپسرا کے بطن سے تھی۔

مانا کا تصور بھی روحوں کے مت سے وابستہ رہا ہے۔ جیمز ڈریور[1] نے اس کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ مانا عالم ارواح کے لئے میلانیشیا والوں کا دیا ہوا نام ہے، اس سے غیر شخصی

---

[1] A DICTIONARY OF PSYCHOLOGY

تقدس یا وہ پُراسرار توانائی بھی مُراد لی جاتی ہے جو بعض اشیاء میں نفوذ کر جاتی ہے۔ کوڈرنگٹن[1] کہتا ہے کہ مانا کا تصور میلانیشیوں کے ذہن و دماغ پر چھایا ہوا ہے۔ ان کے عقیدے کے مطابق مانا ایک قسم کی فوق الطبع توانائی یا تاثیر ہے جو بعض اشیاء یا اشخاص میں موجود ہوتی ہے اس کے طفیل بادشاہوں، سرداروں، کاہنوں اور سیانوں میں غیر معمولی قوت پیدا ہو جاتی ہے۔ کوڈرنگٹن کے اس خیال کی تشریح کرتے ہوئے ژُنگ[2] لکھتا ہے کہ مانا کا عقیدہ نہ صرف ہماری نفسیاتی توانائی کے تصور کا پیش رو ہے بلکہ تمام توانائی کا سرچشمہ ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ابتدائی دور کی غیر شخصی توانائی یا تاثیر کو بعد میں خاص خاص اشخاص، درختوں، جانوروں، پرندوں، چٹانوں، دریاؤں، آبشاروں، جادوگروں، شمنوں، کاہنوں، دیوتاؤں اور ان کے اوتاروں سے منسوب کر دیا گیا۔

مانا کا تصور آج بھی افریقہ، آسٹریلیا، میلانیشیا، انڈونیشیا کے وحشی قبائل اور کئی مہذب اقوام میں پایا جاتا ہے۔ شمالی امریکہ کے لال ہندی مانا کو اورنڈا، واکن یا مانیٹو کہتے ہیں۔ دوسرے عرب ممالک میں اسے برکہ (برکت) کا نام دیا جاتا ہے۔ ہندو اسے شکتی کہتے

---

[1] THE MELANESIANS

[2] CONTRIBUTIONS TO ANALYTICAL PSYCHOLOGY

ہیں جو ان کے عقیدے کے مطابق اوتاروں اور دیوتاؤں کی مُورتیوں میں موجود ہوتی ہے۔ شیو کی زوجہ کالی کو بھی شکتی کہا جاتا ہے کیوں کہ وہ شیو کی توانائی کی صورت ہے۔ تخلیقی آفاقی توانائی کی شکل میں دنیا بھر کی اشیا پر اپنا اثر ڈالتی رہتی ہے۔ جنوبی ہند میں یہ عقیدہ ہے کہ شکتی ہر مرئی، غیر مرئی، ذی رُوح یا غیر ذی رُوح میں موجود ہوتی ہے اور لوگوں کے خیالات اور احساسات تک میں پائی جاتی ہے۔ یہ شر اور خیر دونوں کے لئے ہوتی ہے۔ اس کے اچھے اثرات بھی ہوتے ہیں اور بُرے بھی جنہیں انشٹ کہتے ہیں۔ جنوبی ہند کے مسلمان شکتی کو قُدرت کہتے ہیں۔ قُدرت کے اچھے اثرات کو برکت اور بُرے اثرات کو حرکت کہتے ہیں۔ اُن کا کہنا ہے حلال میں برکت، حرام میں حرکت[1]۔ ہندوؤں کے خیال میں گئو، سانپ، مور، تُلسی، سالگ رام کے پتھر، کنول کے پھول اور پیپل کے درخت میں فائدہ پہنچانے والی شکتی ہوتی ہے۔ مراکو میں صالح توانائی یا مانا کو برکہ (برکت) کہا جاتا ہے جو وہاں کے باشندوں کے خیال کے مطابق اولیا و سادات، عاملوں، مجذوبوں اور سرداروں میں ہوتی ہے اور جس کے باعث عاملوں وغیرہ کے دَم کرنے یا چھُونے سے مریض شفایاب ہو جاتے ہیں۔ ایران قدیم میں اِسی پُراسرار توانائی کو فر کہا جاتا تھا۔ فرِ کاویانی کی ترکیب اِسی سے یادگار ہے۔ فردوسی نے شاہنامے میں لکھا ہے کہ بادشاہوں کے جاہ و جلال، رعب، ہیبت اور حشمت کی تہ میں فرِ شاہی ہی ہوتا ہے۔

---

[1] THE KEY OF POWER.J.ABBOTT.

مقدس جانور کے تصور کا آغاز بھی مانا ہی کے عقیدہ سے ہوا تھا۔ رابرٹسن سمتھ نے لکھا ہے کہ سامیوں کے ہاں یہ عقیدہ عام تھا کہ مقدس جانور کا گوشت کھانے سے اس کی مانا کھانے والے میں حلول کر جاتی ہے اور وہ بھی جانور کی توانائی اور تقدس سے بہرہ ور ہو جاتا ہے اس مقصد کے لئے مقدس ضیافت کا اہتمام کیا جاتا تھا۔ دائیونیسیس کے پیرو نشے کے عالم میں بیلوں اور بکروں کو چیر پھاڑ کر کھا جاتے تھے۔ ہندو گائے کو نہایت مقدس مانتے ہیں لیکن شاستروں میں لکھا ہے کہ خاص خاص تقاریب پر اس کا گوشت بھی کھایا جاتا تھا تاکہ اس کی شکتی کھانے والے میں حلول کر جائے۔ اسی طرح اشو میدھ یگ کی تقریب پر قربانی کے گھوڑے کا گوشت بھی کھاتے تھے۔

وحشی قبائل بھی بعض جانوروں میں مانا تسلیم کر کے انہیں مقدس سمجھتے تھے اور اپنا قبائلی نشان یا ٹوٹم بنا لیتے تھے۔ جن کا گوشت کھانا ٹیبو یعنی حرام تھا۔ لفظ ٹیبو میں احترام اور امتناع دونوں مفہوم پائے جاتے ہیں جیسا کہ لفظ حرام میں دونوں مفہوم موجود ہیں۔ عام حالات میں ان جانوروں کو مارنا سخت ممنوع تھا لیکن خاص تقاریب پر ان کا گوشت کھا لیا جاتا تھا۔ قدیم مصری جن جانوروں کو مقدس مانتے تھے ان کے لئے عالی شان مندر تعمیر کرتے تھے انہوں نے مقدس سانڈ اے پس اور مقدس بکرے کے لئے معبد تعمیر کر رکھے تھے کیوں کہ وہ انہیں غیر معمولی توانائی اور طلسماتی قوت سے بہرہ ور سمجھتے تھے۔ مرنے پر ان کی ممیاں بنا کر دفن کیا کرتے تھے۔ گائے بیل کا تقدس زرعی معاشرے میں ہر کہیں موجود تھا۔ منوسمرتی میں لکھا ہے کہ کوئی برہمن کسی چنڈال، حائضہ عورت، شودر، زچہ، منش یا بندی کو چھو کر ناپاک

ہو جائے تو وہ گائے کو چھونے سے پاک ہو جاتا ہے۔ آج بھی پاک ہونے کے لئے برہمن پنچ گوتیہ (گائے کا دودھ، دہی، گھی، پیشاب اور گوبر ملایا ہوا) پیتے ہیں۔ کوٹلیہ کے ارتھ شاستر میں لکھا ہے کہ دربار میں جانے سے پہلے راجہ کے لئے لازم ہے کہ وہ گائے، بیل اور بچھڑے کو نمسکار کرے۔ قدامت پسند ہندو مرنے سے پہلے گائے کو چھوتے ہیں تاکہ سیدھے سورگ میں چلے جائیں۔ مولوی محمد حسین آزاد "سخندانِ فارس" میں لکھتے ہیں۔

> "پارسی لوگ مہرگان کے دن عید کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ آج کی رات ایک گائے ظاہر ہوتی ہے۔ سونے کے سینگ اور چاندی کے کھر۔ ایک جلوہ دکھا کر غائب ہو جاتی ہے جسے نظر آتی ہے اس کا تمام سال عیش اور خوشحالی میں گزرتا ہے۔"

پارسیوں میں "نوراتوں کی عبادت" میں گائے کا بول پیتے ہیں۔

سانپ کے ساتھ ابتدائے تاریخ سے ایک عجیب قسم کی طلسماتی کشش اور ہیبت وابستہ رہی ہے اور لوگ اسے حیاتِ نو اور جنسی ترغیب کی علامت سمجھتے رہے ہیں۔ ناگ پوجا کا رواج دراوڑوں کے یہاں عام تھا۔ آج بھی ہندوستان اور کشمیر میں جا بجا ناگ کے مندر دکھائی دیتے ہیں جہاں ناگ دیوتا کی پوجا کی جاتی ہے۔ ہندو سانپ کو مارنا مہا پاپ سمجھتے ہیں اور اسے دودھ پلاتے ہیں کہا جاتا ہے کہ دفینوں کی حفاظت سانپ کرتے ہیں۔ ایک روایت ہے کہ زمین ناگ راجا جسے بشیش ناگ اور کرکوٹا بھی کہتے ہیں کے پھن پر رکھی ہے۔ بودھوں کی جاتک کہانیوں میں شیر اور ریچھ بہادری، گیدڑ اور لومڑ دانائی اور سیاست دانی، دراج جنس، پپیہا اور کوئل عشق و محبت، کوّے اور اُلّو نحوست اور گدھا حماقت میں خاص پایہ رکھتا ہے

کہا جاتا ہے کہ کوّے گذشتہ جنم میں باتونی عورتیں تھیں جو کوّوں کے روپ میں کائیں کائیں کرتی رہتی ہیں ۔

آریا اقوام میں ہر کہیں گھوڑے کو مقدّس مانا جاتا تھا ۔ جب ۲۰۰۰ ق م کے لگ بھگ وسط ایشیا میں گھوڑے کو سدھالیا گیا تو گویا تاریخِ عالم میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوا ۔ گھڑ سوار قبیلے فتح و نصرت کے پرچم اُڑاتے دور دراز کی اقوام پر غالب آگئے ۔ یونان اور ہندوستان میں سفید اور سیاہ گھوڑے کی قربانی دی جاتی تھی ۔ مسلمانوں میں گھوڑے کو "غازی مرد" کہا جاتا ہے ، ہندو بھی اسے فرشتہ مانتے ہیں ۔ ایران میں گھوڑے کا سُم چشم زخم سے بچنے کے لئے آج بھی دروازے پر لٹکاتے ہیں یا ٹرکوں کے پیچھے باندھ لیتے ہیں ۔ یونان اور ایران میں دستور تھا کہ جب کوئی سُورما لڑائی میں مارا جاتا تو اُس کے گھوڑے کو اُسی کے ہتھیاروں سے سجا کر اس کا جلوس نکالتے تھے ۔ اور اس کے پیچھے پیچھے ماتم کرتے ہوئے جاتے تھے ۔ یونانی ریاست تھیباس کے مُقدّس دستے کا سردار پلیوپاڈلیس جنگ میں مارا گیا تو اس کے سپاہیوں نے اپنے سر مُنڈوا دیئے اور ماتم کرتے ہوئے اُس کے گھوڑے کے پیچھے پیچھے چلے ۔ سکندر اعظم نے اپنے دوست ہیفےسٹس اور ایرانیوں نے اسفندیار کی موت پر اُن کے گھوڑوں کے جلوس اسی طرح نکالے تھے ۔ سلیمان زریں کے علَم پر گھوڑوں کی سات دُمیں بطور تبرک لٹکائی جاتی تھیں ۔ چنگیز خاں کی قبر پر اُس کے چالیس بہترین گھوڑے ذبح کئے گئے تھے ۔ لوک کہانیوں میں اُڑنے والے کَل کے گھوڑے کا ذکر کیا جاتا ہے ۔ جسے رُومی پیگاسس کہتے تھے ۔ ہندو کہتے ہیں کہ گدھے میں بدشگنی ہوتی ہے ۔ اور اس کا رابطہ بھوتوں پریتوں کے ساتھ ہوتا ہے ۔ مسلمان ممالک میں روایت ہے کہ گدھا ابلیس کا ساتھی ہے ۔ کیونکہ ابلیس

گدھے کی دُم پکڑ کر کشتیٔ نوحؑ میں داخل ہوا تھا۔ دجال بھی گدھے پر سوار ہو کر نمودار ہوگا۔ بعض پرندوں سے بھی مانا یا غیر معمولی طلسماتی قوت منسوب کی جاتی ہے۔ مسلمان کبوتر اور ہُدہُد کو مبارک خیال کرتے ہیں اور انہیں جان سے مارنے سے گریز کرتے ہیں۔ ہندو بھی کبوتر کو شبھ کہتے ہیں۔ رُومی ہُدہُد کو مقدس مانتے تھے کیونکہ انہوں نے ننھے رومولس کو جگا دے کر اس کی جان بچائی تھی۔ ہمارے ہاں اُلّو کو نحس مانتے ہیں لیکن قدیم ایتھنز میں اُسے دانش و خرد کی علامت سمجھا جاتا تھا اور سکّے پر اس کا نقش کندہ کیا جاتا تھا۔ قدیم عربوں کے ہاں کبوتر وصال، خوشی اور امن کی علامت بن گیا تھا۔ اکثر اقوام میں فاختہ امن، صلح اور محبت کی علامت تھی کیونکہ وہ حُسن کی دیوی وینس یا زُہرہ کو بہت محبوب تھی۔ ایران میں ہُما کے بارے میں کہتے تھے کہ وہ جس شخص کے سر پر بیٹھ جائے وہ بادشاہ بن جاتا ہے۔ ہمایوں کی ترکیب اسی سے یادگار ہے۔ ہمارے ادب میں ہُما، عنقا، سیمُرغ جیسے فرضی پرندوں کو غیر معمولی طلسماتی توانائی کا مالک کہا جاتا ہے۔ الف لیلہ و لیلہ میں ایک عظیم الجثہ پرندے رُخ کا ذکر آیا ہے جس کی خوراک ہاتھی تھے۔ اسی طرح سیمُرغ کے بارے میں شاہنامۂ فردوسی میں لکھا ہے کہ وہ بڑا دانا اور خرد مند تھا اور رُستم کے باپ زال کی پرورش اور تربیت اسی نے کی تھی۔ اسی نے رُستم کو اپنا ایک بال دیا تھا کہ تم پر کڑا وقت آئے تو اسے آگ دکھانا میں تمہاری مدد کو پہنچ جاؤں گا۔ اکثر اقوام کوّے سے غیب بینی کی قوت موسوم کرتی رہی ہیں۔ ہمارے ہاں کوّا منڈیر پر بیٹھ کر کائیں کائیں کرے تو کہتے ہیں کہ اس گھر میں مہمان آنے والے ہیں۔ عرب اسے اُبوزاجر (شگون کا باپ) کہتے ہیں اور اس کی اڑان سے فال لیتے ہیں۔ عربوں کے خیال میں کوّا دو چاہنے والوں کو جدا کر دیتا ہے اس لئے اسے غراب البین (جدائی کا کوّا) کہتے ہیں۔ ہندوستان میں عورتیں کاگ اڑا کر اپنے سجن کے

وصال کی فال لیتی ہیں۔ ایران میں کلاغ کی آواز سے فال لیتے ہیں۔ قدیم یونان اور روم میں گدھ، باز اور عقاب کی اُڑان سے فال لیتے تھے۔ کالی بلّی کی طرح کالی مُرغی کو بھی جادو گروں کا پرندہ کہا جاتا ہے۔ جس کا خُون خاص خاص تقاریب پر چھڑکتے ہیں ہمارے ان پیرزادے کالے مُرغے کے خُون سے تعویذ لکھتے ہیں۔ لوک کہانیوں میں طوطے کا ذکر کثرت سے آیا ہے۔ مثلاً موہنا طوطا بڑا عالم اور دانش مند تھا اور چاروں وید پڑھا ہوا تھا۔ ہندو طوطے کو جنسی ترغیب کی علامت سمجھ کر اسے مُقدّس مانتے ہیں چنانچہ بیاہ کے موقع پر بیدیکا کے ساتھ لکڑی کے طوطے تراش کر آویزاں کئے جاتے ہیں۔ عرب کہتے ہیں کہ مُرغے، کوّے، کبوتری، نیولے، زرافہ، سیہہ، خرگوش، ہرن، شتر مُرغ، اور سانپ کا جنوں سے گہرا رابطہ قائم ہے اور وہ ان پر سواری کرتے ہیں۔ وہ جن اور ہمزاد سے محفوظ رہنے کے لئے اپنے گلے میں خرگوش کا ٹخنہ لٹکاتے ہیں۔ اور بچوں کے گلے میں لومڑی کے دانت لٹکاتے ہیں۔ کلیسیا نے روم والے مینڈک کو غیر معمولی قوت کا مالک سمجھتے تھے اور کہتے تھے کہ کسی سوئی ہوئی عورت کی چھاتی پر مینڈک کی زبان رکھ دی جائے تو وہ اپنے سارے راز اگل دیتی ہے۔ قدیم زمانے سے جادوگر اپنے ٹونوں ٹوٹکوں میں خرگوش، مینڈک، ہُدہُد، اُلّو، مُرغے، کوّے وغیرہ کی ہڈیوں، پنجوں، خُون اور پروں سے کام لیتے رہے ہیں۔ مُغول اور تاتار بھیڑ بکری کے شانے کی ہڈی سے اکثر فال لیا کرتے تھے۔ جب کبھی پلاؤ میں کسی بکرے یا بھیڑ کے شانہ کی ہڈی ثابت و سالم نکل آتی تو اُسے نہایت غور سے دیکھتے گویا کوئی تحریر پڑھ رہے ہیں اور غائب کی خبر دیتے ہیں آج بھی ایران میں اسکا رواج ہے۔ اسے شانہ بینی یا فالِ شانہ کہتے ہیں۔ تیمور نے اپنے

سفر نامۂ ہند میں لکھتا ہے کہ ہندو مور کو نہایت مقدس مانتے ہیں۔ ایک ایرانی سوداگر نے مور کا شکار کیا تو ہندوؤں نے بلوہ کر کے اس سوداگر کو جان سے مار ڈالا۔ لوگ قدیم زمانے سے درندوں اور پرندوں کی طرح بعض درختوں، پودوں اور پھولوں پھلوں کو بھی مُقدس مانتے رہے ہیں یعنی اُن سے مانا منسوب کرتے رہے ہیں۔ عرب کیکر کے درخت کو مغیلان (اُم غیلان یعنی غولوں کی ماں) کہتے ہیں۔ ایرانیوں کے خیال میں دیودار کے درخت پر دیو بسیرا کرتے ہیں اسی لئے اُس کا یہ نام رکھا گیا ہے۔ عرب اس درخت کو شجرۃ الجن کہتے ہیں۔ اقوامِ عالم میں درختوں کے جھنڈ بڑے پُر اسرار اور مُقدس سمجھے جاتے تھے خیال یہ تھا کہ ان میں رُوحیں قیام کرتی ہیں۔ فریزر نے اپنی کتاب شاخِ زریں میں نیمی کے جھنڈ کا ذکر کیا ہے جس کے ایک درخت کے نیچے ایک آدمی ننگی تلوار سونت کر اس کی سُنہری شاخ کی حفاظت کیا کرتا تھا کوئی دوسرا شخص اس کی جگہ لینا چاہتا تو وہ اس سے لڑائی کرتا اور غالب آنے پر اُسے قتل کر دیتا یا اس کے ہاتھ سے مارا جاتا تھا۔ یہ سلسلہ قیصرِ روم کالی گولا کے زمانے تک قائم رہا۔ جرمن گھنے جنگلوں اور تناور درختوں سے طلسماتی قوت منسوب کر کے ان کی تقدیس کرتے رہے ہیں۔ اُن کے خیال میں گھنے جنگل دیوتاؤں اور رُوحوں کے مسکن ہوتے تھے۔ کلٹ بلوط کے درخت کو بادشاہ کہا کرتے تھے۔ اطالیہ میں بلوط جیوپیٹر دیوتا کا مُقدس درخت تھا۔ عہد نامہ قدیم زمانے میں جس مُقدس شجرِ علم اور شجرِ حیات کا ذکر آیا ہے وہ بابل اور ایران سے ماخوذ ہے۔ مشہور قدیم ہیرو گلگامش نے شجرِ حیات کی تلاش میں ہفت خوان طے کئے تھے۔ مسلمانوں کے ہاں انجیر اور زیتون کے درخت مقدس ہیں کیوں کہ خدا نے ان کے نام کی قسم کھائی ہے۔ خُرما اور انار بھی مُقدس مانے گئے ہیں۔ ایک روایت یہ ہے کہ اس دنیا کے ہر انار میں ایک دانہ

بہشت کے انار کا ہوتا ہے۔ بہشت میں ایک بیری کا درخت ہے جسے مُراد دہندہ کہا جاتا ہے وضع حمل کے وقت زچہ کو تین کھجوریں کھلائی جاتی ہیں جس سے دردِ زہ میں آسانی ہو جاتی ہے۔ کیوں کہ روایت ہے کہ مریم عذرا نے جناب عیسٰیؑ کی پیدائش کے وقت تین کھجوریں کھائی تھیں ایران اور ہندوستان میں بھوتوں پریتوں اور نظرِ بد سے بچاؤ کے لئے دانہ سپند (حرمل) کی دھونی دی جاتی ہے۔ سپند کو دہکتے ہوئے کوئلوں پر جلا کر چشمِ بد سے محفوظ رکھنے کے لئے اس کا دھواں سر کے گرد گھمایا جاتا ہے۔ کئی فقیر انگیٹھی اُٹھائے اُٹھائے پھرتے ہیں اور اس میں حرمل جلا کر اور دھواں دے کر دکانداروں سے پیسے مانگتے ہیں۔ ایران میں نظرِ بد سے بچانے کے لئے حرمل جلاتے ہوئے کہتے جاتے ہیں۔

سپند کہ کاشت ؟ محمدؐ

کہ چید ؟ علیؑ

کہ دود کرد ؟ فاطمہؑ

از برائے کہ ؟ از برائے حسنؑ و حسینؑ

دولہا دلہن کو نظرِ بد سے بچانے کے لئے سپند کو مجمری میں جلا کر اُن کے سروں کے گرد گھماتے ہیں۔ ہندوؤں میں برگد، پیپل، اشوک اور پلاس کے درختوں کی پوجا بڑی عقیدت سے کی جاتی ہے۔ کیونکہ پیپل وشنو کا، برگد شیو کا اور پلاس برہما کا مقدس درخت ہے۔ ہندوؤں کے خیال میں ان درختوں میں نیک روحیں بسیرا کرتی ہیں۔ ہندو عورتیں حصولِ اولاد کے لئے پیپل کی شاخوں میں رنگ برنگ کے دھاگے باندھتی ہیں اور اس کا پرکرما (طواف) کرتی ہیں۔ سندھ میں پیپل، بیری اور لسوڑی کے درختوں کو خطرناک اور نیم کے درخت

کو بابرکت خیال کرتے ہیں۔ نیم کا درخت قبرستانوں میں لگایا جاتا ہے۔ اہلِ مغرب اپنے قبرستانوں میں سرو کا درخت لگاتے ہیں کیوں کہ یہ حُسن کی دیوی افرودائتی کا مقدس درخت تھا۔

یونان قدیم میں درختوں کی دیویوں کو اوریاد کہتے تھے جو نہایت حسین سمجھی جاتی تھیں، ہندو انہیں یکشا اور یکشی کہتے ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ انہی دیویوں کے اثر سے درخت پھولتے پھلتے ہیں۔ اور اگر انھیں کاٹ ڈالا جائے تو یہ دیویاں بھی مر جاتی ہیں۔ بُودھ سنگ تراشوں نے یکشنیوں کے نہایت خوبصورت مجسمے تراشے تھے جن میں سانچی ستوپا کے مجسمے حسین ترین سمجھے جاتے ہیں۔ ہندو تُلسی کے پودے کو کرشن سے منسوب کر کے اسے بڑا مقدس مانتے ہیں تُلسی کی آرتی اتاری جاتی ہے جیسا کہ دیوتاؤں کی آرتی اُتارنے کا رواج ہے مرتے وقت مریض کے مُنہ میں تُلسی کی پتی رکھتے ہیں اور رات کو اس کے سامنے چراغ جلائے جاتے ہیں ہندو درختوں کو ذی رُوح سمجھ کر ان کا آپس میں بیاہ بھی رچاتے ہیں۔ جو شخص آم کے پیڑ لگاتا ہے وہ اور اُس کی بیوی اُن کا پھل نہیں کھا سکتے جب تک کہ وہ آم کے کسی درخت کا بیاہ کسی دوسرے درخت سے نہ کر لیں۔ یہ بیاہ عام طور سے کسی املی کے پیڑ سے رچایا جاتا ہے جو خاص اس مقصد کے لئے قریب ہی بویا جاتا ہے۔ اس بیاہ پہ ہزاروں کا خرچ اٹھ جاتا ہے۔ اس تقریب پر برہمنوں کو خوب بھوجن کرایا جاتا ہے۔ اسی طرح جو شخص تالاب بنواتا ہے وہ اس کا پانی نہیں پیتا جب تک کہ وہ اس تالاب کا بیاہ اس کے کنارے اگائے ہوئے پیڑ کے ساتھ کر نہیں لیتا اس بیاہ کی رسوم ایسی ہی ادا کی جاتی ہیں جیسی کہ دُلہا دُلہن کے بیاہ پر اور ان پر دل کھول کر خرچ کرتے ہیں۔

وسط ایشیا کے ممالک میں انجیر کو ننگ کی علامت سمجھا جاتا ہے جسے ویزنیبیس شراب کے دیوتا نے دوزخ کے دروازے پر بویا تھا۔ عورتیں حصولِ اولاد کے لئے انجیر کے پیڑ سے ہمکنار ہوتی ہیں۔ فلپ ہٹی لکھتا ہے کہ آج بھی شہرِ ابراہیم کے پاس انجیر کا ایک پیڑ ہے جس کی ٹہنیوں کے ساتھ مسلمانوں اور عیسائیوں نے رنگ برنگ کے رومال باندھ رکھے ہیں ان کے خیال میں اس درخت کی پوجا کرنے سے پرانے مریض بھی شفایاب ہو جاتے ہیں۔ درختوں کے علاوہ بعض پھولوں سے بھی طلسماتی اثرات وابستہ کیے گئے ہیں اور ان سے دیو مالائی قصے منسوب کئے جاتے ہیں۔ مثلاً سورج مکھی کے بارے میں کہتے ہیں کہ وہ ایک نوخیز لڑکی تھی جو سورج دیوتا کو دل دے بیٹھی لیکن سورج نے التفات نہ کیا اور اسے پھول بنا دیا۔ اب وہ اپنے محبوب کو دیکھا کرتی ہے۔ نرسی سس (نرگس) ایک حسین نوجوان تھا جو اپنی رعنائی پر بڑا مغرور تھا۔ جنگل کی ایک دیوی اس پر فریفتہ ہو گئی لیکن وہ اسے خاطر میں نہیں لاتا تھا اور وہ بے چاری اپنے دل میں سلگتے ہوئے ارمان لئے اس کے پیچھے پیچھے پھرا کرتی تھی۔ ایک دن نرسی سس کو پیاس لگی تو وہ ایک چشمے کے کنارے جھک کر پانی پینے لگا۔ اس نے اپنا عکس جو پانی میں دیکھا تو اپنے آپ پر عاشق ہو گیا۔ ایک مدت تک وہ عالمِ وارفتگی میں اپنے حسن و جمال کے نظارے میں محو رہا۔ آخر دیوتاؤں نے رحم کھا کر اسے نرگس کا پھول بنا دیا جو آنکھ کی علامت بن گیا۔ لالہ کے پھول کے ساتھ بھی ایک کہانی وابستہ ہے حسن کی دیوی ایک نوجوان گڈریے ادونس پر فدا ہو گئی۔ اس دیوی کے عاشق مریخ دیوتا کو تاؤ آ گیا اور اس نے خنزیر کا روپ دھار کر ادونس کو ہلاک کر دیا۔ جس زمین پر ادونس کا لہو گرا وہاں لالہ کے پھول اُگ آئے چنانچہ لالہ کے لئے عربی میں شقائق النعمان (نعمان یا ادونس کے زخم) کا لفظ موجود ہے۔

قدیم مصری اور ہندو کنول کے پھول کو نہایت عقیدت سے پوجتے رہے ہیں۔ ہندو کہتے ہیں کہ دیوتا وشنو کنول کے پھول پر لیٹ کر آرام کرتا ہے۔ گلاب کو پھولوں کا بادشاہ مانا گیا ہے۔ شاعری اور لوک کہانیوں میں اس کا ذکر

مختلف پیرایوں میں کیا گیا ہے۔ گُل کے علاوہ نرگس، لالہ، بنفشہ، ارغواں وغیرہ فارسی ادب میں خاص علامتوں کی صورتیں اختیار کر گئے ہیں۔ سنسکرت شاعری میں چنبیلی، مرتیا، مولسری، موگرا، چمپا وغیرہ کے حوالے سے بڑی خوبصورت تمثیلیں وجود میں آئی ہیں۔ بعض پھول قومی حیثیت رکھتے ہیں۔ انگلستان، بلغاریہ اور ایران کا قومی پھول گلاب ہے۔ فرانس کا گُلِ زنبق، ہالینڈ کا گُلِ لالہ، جرمنی کا بنفشہ، ہند کا کنول، چین کا آلوچہ کا پھول، جاپان کا چیری کا پھول وغیرہ کو قومی اہمیت دی جاتی ہے۔

جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں قدیم زمانے کا انسان جس شے کو پُراسرار سمجھتا اس سے مانیا طلسماتی اثر منسوب کر دیتا تھا۔ اسی خیال کے تحت اس نے دریاؤں، سمندروں، ندی نالوں، چشموں، جھیلوں اور آبشاروں کو بھی اپنی ہی طرح کی ذی حیات و ذی رُوح ہستیاں مان لیا۔ قدیم مصری دریائے نیل کو دیوتا سمجھ کر اس کی پوجا کرتے تھے۔ اُن کی معیشت کا انحصار اس طغیانی پر تھا جو ہر سال نیل میں آتی تھی اور کناروں پر دُور دُور تک پھیلے ہوئے کھیتوں کو سیراب کر جاتی تھی۔ مصری نیل کے دیوتا کو اپنا سب سے بڑا محسن سمجھتے تھے جب کبھی برسات کے موسم میں طغیانی آنے میں دیر ہو جاتی تو مصری ایک نوخیز خوبصورت لڑکی کو ہار سنگار کر کے دریا کے بیچ منجدھار غرق کر دیتے تھے اسے عُروسِ نیل کہتے تھے۔ آج بھی فلاحین اس مقصد کے لئے مٹی کی مُورتیاں بنا کر دریا میں ڈبوتے ہیں۔ اسی طرح بابلی دریائے دجلہ و فرات، سندھی، دریائے سندھ اور ہندی گنگا جمنا کی پُوجا کرتے تھے۔ عہد نامۂ قدیم میں بھی جنتِ عدن کا ذکر آیا ہے وہ دجلہ و فرات کا دوآبہ ہی تھا۔ سندھی آج بھی دریائے سندھ کو دریا بادشاہ کہتے ہیں اور اسے ایک خُدا رسیدہ ولی مانتے ہیں۔ ہندو گنگا اور جمنا کی پُوجا نہایت ذوق و شوق سے کرتے ہیں۔ وہ گنگا کو گنگا مائی کہتے ہیں۔ اُن کا خیال ہے کہ گنگا میں ڈبکی لگانے سے آدمی کے پاپ جھڑ جاتے ہیں۔ مُردوں کی ہڈیاں گنگا میں بہاتے ہیں کہ وہ سیدھے سورگ میں چلے جائیں۔ بعض تپسوی گنگا میں ڈوب کر خودکشی کرتے ہیں اور اسے اپنی مکتی کا باعث سمجھتے ہیں۔ سوامی رام تیرتھ نے گنگا کے منجدھار میں سمادھی جمائی اور پران تیاگ دیئے۔ سناتن دھرمی سفر کر رہے ہوں اور راستے میں

دریا آجائے تو وہ پیسے پھینک کر دریا دیوتا کو بھینٹ دیتے ہیں۔ جاپانی شروع سے مظاہر فطرت کو ذی روح اور ذی حیات مانتے رہے ہیں۔ اور ان میں نر، مادہ کی تمیز کرتے رہے ہیں۔ ان کی شاعری میں آبشار جو زور و شور سے بہتا ہوا اور جھاگ اڑاتا ہوا گرتا ہے ایک نجابت جو مرد ہے جبکہ آہستہ روی سے گرنے والے آبشار کو ایک شرمیلی دوشیزہ کہتے ہیں جو لوک لاج سے ڈری اور سہمی ہوئی پیا اپنے بستر سے ملنے جا رہی ہو۔ لوک کہانیوں میں ایسی جھیلوں اور چشموں کا ذکر آیا ہے جو روحوں کے مسکن ہوتے ہیں۔ انسانی تخیل نے ابدی آرزو کو پورا کرنے کے لئے چشمۂ آب حیات کی تخلیق کی جو ظلمات میں واقع ہے۔ جو شخص اس کا پانی پی لیتا ہے وہ امر ہو جاتا ہے سکندر جناب خضر کو ساتھ لے کر اسی چشمے کی تلاش میں نکلا تھا۔ وہ راستے سے بھٹک گیا جب کہ جناب خضر آب حیات پینے میں کامیاب ہو گئے آب حیات کے لئے ہندوؤں میں امرت اور یونانیوں میں امبروسیا کے تصورات موجود ہیں دونوں الفاظ کے معنی بقائے دوام ہی کے ہیں۔ قدیم انسان کے ذہن میں پہاڑ، چٹانیں، اور پتھر بھی اسرار کے دھندلکے میں لپٹی ہوئی ذی روح ہستیاں تھیں۔ وہ پہاڑوں کی سر بفلک برف پوش چوٹیوں کو حیرت اور خوف کی نگاہ سے دیکھتا تھا اور آج بھی انہیں دیکھ کر مسحور ہو جاتا ہے میرا گاؤں پہاڑیوں میں گھرا ہوا ہے۔ جب کبھی میں پہاڑیوں میں نکلتا ہوں تو ان کی عجیب و غریب شکلیں جو برسات کی بوچھاڑوں نے بنائی ہیں اور ان پر چھایا ہوا اتھاہ سکوت میرے لئے ہیبت یا، جذب و کشش کا باعث ہوتا ہے اور مجھے ڈرا بھی دیتا ہے جس سے میں قدیم انسان کی مرعوبیت اور دہشت کا اندازہ کر سکتا ہوں جو وہ پہاڑوں اور چٹانوں کے نظارے سے محسوس کیا کرتا تھا۔ چنانچہ اس نے ہمالیہ، الپس، دماوند، البرز، اولمپس وغیرہ کو روحوں، دیوؤں، جنوں، پریوں کا مسکن بنا دیا اور ان کی تقدیس کرنے لگا۔ ہندوستان میں جو ہزاروں برسوں سے توہمات کا عجائب گھر بنا ہوا ہے آج بھی ہمالیہ کی چوٹیوں پر بدری ناتھ، کیدار ناتھ وغیرہ سینکڑوں تیرتھ موجود ہیں جہاں سادھو لوگ سینکڑوں میلوں سفر کر کے جاتے ہیں ہمالیہ کے عقب میں افسانوی پہاڑ سمیرو تھا۔ جو ہندوؤں کے دیوتاؤں کا مسکن تھا۔ پانڈو بھائیوں نے دروپدی کی معیت ہمالیہ

ی کے برف پوش دامن میں گل کر جان دی تھی۔ یونانیوں کے دیوتا کوہ اولمپس کی چوٹی پر مقیم تھے۔ ایران کے پہاڑ البرز اور دماوند پریوں اور دیوؤں کے مسکن تھے۔ ہندوؤں کے جو اندر کا سورگ یا اندر لوک ہمالیہ کے دامن میں ہے جہاں سر سبز سدا بہار درخت پھول دار بیلوں سے ڈھکے ہوئے ہیں۔ سونے چاندی کے محل میں راجہ اندر کے سامنے خوش گلو گندھرو سریلی تانیں اڑاتے ہیں اور پری چہرہ اپسرائیں نہایت نفس پرور انداز میں بھاؤ بتا بتا کر اور آنکھیں مٹکا مٹکا کر ناچتی ہیں۔ جب کسی رشی کے تپ جپ سے دیوتاؤں کا سنگھاسن ڈولنے لگتا ہے تو اسے رجھانے کے لئے حسین اپسرائیں اس کے پاس بھیج دی جاتی ہیں جن کے جادو بھرے جمال سے رشیوں کی عمر بھر کی ریاضت غارت ہو جاتی ہے۔ پہاڑوں کی طرح بعض چٹانوں اور پتھروں سے بھی مانا منسوب کی جاتی ہے۔ اس کی معروف مثال قبۃ الصخرا (لغوی معنی چٹان کا گنبد) ہے۔ یہ گنبد ایک سرمئی رنگ کی چٹان پر بنایا گیا ہے جسے قدیم زمانوں سے مقدس سمجھتے رہے ہیں۔ شروع شروع میں فنیقیوں نے اس کے گرد اپنا معبد تعمیر کر رکھا تھا۔ یہودی اُن پر غالب آئے تو انہوں نے یہ معبد مسمار کر دیا اور اسے اپنی زیارت گاہ بنا لیا۔ حضرت سلیمان نے اسی چٹان پر اپنا عظیم الشان ہیکل تعمیر کیا تھا۔ ہیکل سلیمانی کا مقدس ترین جگہ[1] وہی تھا جس میں یہ چٹان تھی یہ ہیکل بخت نصر شاہ بابل اور بعد میں رومیوں کے ہاتھوں تباہ و برباد ہوا۔ عربوں نے فلسطین کی فتح کے بعد اسی چٹان پر ایک گنبد تعمیر کیا جو قبۃ الصخرا کے نام سے موسوم ہوا۔ بیت المقدس مسلمانوں کا قبلہ اول تھا۔ قدماء خاص وضع کے سیاہ پتھروں سے بھی طلسماتی خواص منسوب کرتے رہے ہیں۔ صابئین نے مکہ اور حمص میں مقدس سیاہ پتھروں کے لئے عبادت گاہیں تعمیر کرائی تھیں جن کا طواف کرنے کے لئے ہزاروں یاتری دور دور سے آیا کرتے تھے۔ روم کا قیصر ہیلیو گابلس حمص کا سیاہ پتھر اکھاڑ کر روما لے گیا اور وہاں اس کی پوجا کو رواج دیا۔ ہندو بھی ایک قسم کے سیاہ پتھر کی جسے وہ سالگ رام کہتے ہیں پوجا کرتے ہیں یہ گول اور روغنی ہوتا ہے فارسی میں اسے سنگ محک کہتے ہیں۔ ہندو اسے مظہر الٰہی مانتے ہیں۔ اور بعض اسے دیوتا سمجھ کر پوجتے ہیں۔ شاہان مغل تاتار تخت نشینی کے وقت سیاہ پتھر کے تخت پر بیٹھتے تھے ۱۶۰۵ء میں جہانگیر تخت نشین ہوا تو اس کا تخت سنگ سیاہ کی ایک خوش نما چوکی پر نصب تھا۔ کہا جاتا تھا کہ یہ غزنی کے ڈھے

---

[1] ـ HOLY OF HOLIES کہتے تھے

قدیم زمانے سے چلے آ رہے تھے۔ ترکستان میں ایک سیاہ رنگ کا طلسماتی پتھر ہے جسے یدہ کہتے ہیں اور جس کے بارے میں عقیدہ ہے کہ یہ بارش برساتا ہے۔ ظہیر الدین بابر نے اپنی تزک میں اس پتھر اور اس کی تاثیر کا ذکر کیا ہے۔ ایران اور ہندوستان میں ایسے پتھر موجود ہیں جن پر کسی بزرگ کے ہاتھ یا پاؤں کا نقش محفوظ ہو گیا ہے۔ لوگ ان کی نہایت تکریم کرتے ہیں۔ ایرانیوں کا عقیدہ ہے کہ بعض پتھر بھی زیارتوں کو جاتے ہیں کئی لوگوں نے ایسے پتھروں کو سڑکوں پر چلتے پھرتے ہوئے دیکھنے کا دعویٰ کیا ہے۔ احادیث میں ایک ایسے پتھر کا ذکر آیا ہے جو حضرت موسیٰ کے کپڑے لے بھاگا تھا جب وہ ندی میں غسل کرنے کے لئے اترے تھے۔

قیمتی پتھروں میں، زمرد، عقیق، فیروزہ، نیلم، پکھراج، یشب وغیرہ کو بھی طلسماتی خواص منسوب کرتے رہے ہیں ایران اور پنجاب میں یہ عقیدہ عام ہے کہ فیروزہ چشم بد سے بچاتا ہے لوگ اس کا نگینہ انگوٹھی میں جڑواتے ہیں اور اس کے منکے مواشی کے گلے میں لٹکاتے ہیں۔ عقیق یمنی کے بارے میں خیال ہے کہ اس کے پہننے سے آدمی افلاس و احتیاج سے بچا رہتا ہے۔ یشب پہننے والے کو پیاس نہیں لگتی۔ چین کے کاریگر یشب سے نہایت خوبصورت آرائشی چیزیں بناتے ہیں اور اس پتھر سے بے حد پیار کرتے ہیں۔ جادو کے اثرات کو زائل کرنے کے لئے لعل اور یاقوت سے کام لیتے ہیں۔ زمرد کے بارے میں کہتے ہیں کہ جس گھر میں ہو وہاں سانپ نہیں پھٹکتا۔ یہ قدیم توہمات آج بھی باقی ہیں اور جوہری گاہکوں کی تاریخ پیدائش کی رعایت سے ان کی انگوٹھی کے لئے نگینہ تجویز کرتے ہیں اور سادہ لوح ان کی باتوں پر یقین کر لیتے ہیں۔

قدما کی بنا پر بعض دھاتوں کی عجیب و غریب تاثیر کے قائل رہے ہیں۔ غاروں کے انسان نے سب سے پہلے تانبا دریافت کیا تھا۔ بعد میں اس میں قلعی کی آمیزش کر کے کانسی بنائی۔ تانبے اور کانسی کا زمانہ کئی صدیوں پر پھیلا ہے۔ ق م ۱۵۰۰ کے لگ بھگ لوہا دریافت کیا گیا۔ لوہے سے فولاد بنانے کا راز معلوم ہوا تو اس کے ہتھیار بنانے لگے فولاد کے ہتھیاروں کی ساخت اور گھوڑے کے سدھانے کے ساتھ تاریخ عالم میں ایک خونریز دور کا آغاز ہوا۔ ہکساس نے مصر پر اور

آریاؤں نے ہندوستان پر فوج کشی کی اور دُور دراز کے علاقے فتح کر لیے۔ تانبے کو ابتدائے تاریخ سے تقدّس کا درجہ حاصل رہا ہے اسی سبب اکثر قدیم اقوام کے سکّے تانبے ہی سے ڈھالتے رہے ہیں۔ لوہے اور فولاد کے متعلق عام عقیدہ یہ ہے کہ یہ جنوں، بھوتوں، پریتوں اور نظرِ بد سے محفوظ رکھتے ہیں۔ ایران اور ہندوستان میں آج بھی لوگ جنگلوں بیابانوں میں جائیں تو اپنے پاس چاقو یا کلہاڑی رکھتے ہیں۔ دُلہا کے ہاتھ میں لوہے کی چھڑی دی جاتی ہے تاکہ وہ جنوں اور نظرِ بد سے بچا رہے سونا چاندی افادی پہلو سے معمولی دھاتیں ہیں لیکن ان کی چمک دمک سے قدیم زمانے کے انسان کی طرح آج بھی آدمی انہیں پاکے عجیب سی خوشی محسوس کرتا ہے۔ کیمیا گروں نے یہ کہہ کر سونے چاندی کی قدر و قیمت میں اضافہ کر دیا کہ زمین پر سونا اور چاندی، آسمان پر سورج اور چاند کے علامتی مظاہر ہیں۔ چنانچہ اُن کی خاص زبان میں سونے کو شمس اور چاندی کو قمر کہتے ہیں۔ زمانے کے گزرنے کے ساتھ سونا چاندی وجاہت اور منزلت کی علامتیں بن گئے اور انہیں اکٹھا کرنے کا ایسا جنون پیدا ہوا کہ سرمایہ دار ممالک آج تک اس کی گرفت سے آزادی نہیں پا سکے۔ مغل سلاطین سونے کے ترازو میں دوسری دھاتوں کے ساتھ تُلا کرتے تھے۔ خیال یہ تھا کہ اس طرح آدمی طویل عمر پاتا ہے اس عقیدے کی تہ میں برکہ (برکت) یا ماما کا تصور کار فرما ہے۔ سونے چاندی کو مُبارک سمجھ کر ہی لوگ ان کے تعویذ بنا کر گلے میں پہنتے ہیں۔ علم نجوم میں دھاتوں کو سیاروں سے بھی منسوب کرتے رہے ہیں جنہیں دیوتا مانا جاتا تھا۔ سونے کو شمس، چاندی کو قمر، فولاد کو مریخ، تانبے کو زہرہ، سیسے کو زحل، مُشتری کو قلعی، پارے کو عطارد کا مظہر مانتے تھے۔ کیمیا گروں نے ان دھاتوں کی ایک باقاعدہ الٰہیات مُرتب کر رکھی تھی۔ وہ عام دھاتوں کو سونے میں تبدیل کرنے کی کوشش میں پارہ، گندھک، ہڑتال اور شنجرف سے کام لیتے رہے ہیں اور ان سے عجیب "رُوحانی" اوصاف منسوب کرتے رہے ہیں۔

جادو

جادو ارواح کے مت ہی کی ایک صورت ہے۔ جیسا کہ ہم گزشتہ باب میں دیکھ چکے ہیں پتھر کے زمانوں کے نیم انسان نیم حیوان کا عقیدہ تھا کہ مرنے والوں کی روحیں باقی رہتی ہیں۔ وہ عالم خواب میں ان سے ملاقاتیں کرتا ہے اور اس دنیا میں بھی وہ اس کی امداد کو آتی رہتی ہیں۔ بعد میں شمن مت کے پروہتوں نے دعویٰ کیا کہ مناسب منتر پڑھ کر وہ مرے ہوئے لوگوں کی روحوں سے رابطہ قائم کر سکتے ہیں۔ یہ روحیں دو گروہوں پر مشتمل سمجھی جاتی تھیں (۱) نیک روحیں (۲) بد روحیں نیک روحیں انسان کی حاجتیں پوری کرتی ہیں اور بد روحیں اس کے درپے آزار رہتی ہیں۔ جادو نیک روحوں کو اپنی اور اپنے دوستوں کی مدد کے لئے طلب کرنے اور بد روحوں کے وسیلے سے دشمنوں کو ایذا پہنچانے کے جتن ہی کا دوسرا نام ہے۔

لفظ "جادو" کا معنی ہے چارہ گری، تدبیر، شعبدہ۔ آثار خلاف عادت کے لئے نیرنگ (عربی نیرنج) کا لفظ مستعمل ہے۔ طلسم کا معنی ہے "حیرت میں ڈالنے والی بات"۔ جادو کے منتر کو تدبیر یا افسوں کہا جاتا ہے۔ افسوں گر یا جادوگر کو عربی میں مُعزّم اور مدبر کا نام دیا گیا ہے۔ بو علی سینا نے اپنی کتاب "کنوز المعزمین" میں جادو کے ٹونے ٹوٹکے لکھے ہیں جن سے بگڑے ہوئے کام بھی سنوارے جا سکتے ہیں اور دشمنوں کو ایذا بھی پہنچائی جا سکتی ہے۔ وہ منتروں کو عزائم اور منتر پڑھنے والے کو مُعزّم کہتا ہے۔ مسعود سعد سلمان ؎

ہر زماں فتنہ بر سیاست تو   چوں مُعزّم ہمی کند افسوں

جوہری اور فیروز آبادی نے سحر کے معنی لکھے ہیں "آسانی سے آمادۂ عمل کرنا" یعنی روحوں کو کسی کا کام سنوارنے یا کسی کو ضرر پہنچانے پر آمادہ کرنا۔ طلسم کی طرح سحر میں بھی شعبدہ بازی کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ جیسا کہ سامری نے سونے کا بچھڑا ایسی ترکیب سے بنایا تھا کہ اس کے منہ سے ڈکرانے کی آواز نکلتی تھی یا جیسے مقنع نے چاہ نخشب سے مصنوعی چاند نکال کر دکھایا تھا یا جیسے مصر قدیم کے دیوتا کے بُت پر سورج کی شعاعیں پڑنے سے اس کے منہ سے گنگنانے کی آوازیں نکلتی تھیں

یا جیسے سومناتھ کے مندر میں سوم[1] کا بُت ہوا میں مُعلّق کر دیا گیا تھا۔ ان تدبیروں اور شعبدوں سے پروہتوں نے عوام کے ذہنوں پر تسلط قائم کر رکھا تھا۔ یہ وہ زمانہ ہے جب پروہت، جادوگر، معالج اور شمن ایک ہی ذات میں جمع تھے۔ انگریزی میں وائلڈ[2] کی تحقیق کے مطابق لفظ MAGIC پہلوی زبان کے لفظ مجوس سے یادگار ہے۔ جو ایرانی آتش پرستوں کے پروہت تھے۔ ۱۴۸۷ء میں ہنری کورنیلیس اگریپا نے جادوگری پر ایک کتاب لکھی تھی جس میں کہتا ہے[3]

> "انسان کی رُوح اس کے جسم میں دائر و سائر ہے اور اس پر مُتصرّف ہے۔ اس عظیم آفاقی قوت کو وہ شخص اپنے قابو میں لا سکتا ہے جو مجوس کے طریقوں سے واقف ہو۔ ایسا شخص حروف، ہندسوں اور الفاظ میں چھپے ہوئے معانی کو سمجھ لیتا ہے اور ستاروں کے راز جان لیتا ہے جس کے کارن وہ ارضی قوتوں اور ہوا کے بھوتوں پریتوں کو اپنے قابو میں لا سکتا ہے"۔

قدیم عراق کا شہر بابل جادو کا سب سے بڑا مرکز تھا چنانچہ بابلی اور کالدی کے الفاظ جادوگری کے مفہوم میں لئے جاتے تھے۔ بابل کا جادو تمام مشرقی ممالک میں پھیل گیا۔ مسلمانوں کا جادو بھی بابلیوں ہی سے ماخوذ ہے۔ مسلمانوں کے یہاں علم رُوحانی کی دو قسمیں ہیں (۱) علوی (یزدانی) (۲) سفلی (شیطانی) عرفِ عام میں پہلی قسم کو سفید جادو کہا جاتا ہے جس کے وسیلے سے لوگوں کے بگڑے ہوئے کام سنوارے جاتے ہیں، بدروحوں کو نکالا جاتا ہے یا مُزمن امراض کا علاج کیا جاتا ہے۔ اسے اصطلاح میں سیمیا کہتے ہیں یعنی خدا اور اس کے نیک بندوں کی رُوحوں سے حلِ مشکلات کے لئے رجوع لانا۔ کالے جادو کا مقصد لوگوں کو ایذا پہنچانا، دُکھ دینا، امراض لگا دینا، جان سے مار دینا ہے۔ اس مقصد کے لئے شیطان اور اس کے چیلوں سے استمداد کی جاتی ہے۔ بابل کے علاوہ مصرِ قدیم، چینِ قدیم اور وادیٔ سندھ کے دراوڑ بھی جادو میں دسترس رکھتے تھے۔ اتھروید میں جتنے منتر اور ٹونے ٹوٹکے درج ہیں وہ دراوڑوں ہی سے

---

[1] یہ بت سومناتھ یا چاند دیوتا کا لنگ تھا۔

[2] WILDE'S ENGLISH DICTIONARY

THE OCCULT PHILOSOPHY

لئے گئے ہیں۔ چین میں جادو کی کتاب ال چنگ کنفیوشس سے کئی صدیاں پیشتر لکھی گئی تھی۔ مصر کی کتاب مُردگان غالباً اس موضوع پر قدیم ترین تصنیف ہے جو ہم تک پہنچی ہے یہ کتاب ۳۰۰۰ ق م میں لکھی گئی تھی اس میں رُوحوں کو حاضر کرنے، امراض کے علاج، دریائے نیل میں بروقت طغیانی لانے، لڑکیوں کا دل جیتنے کے ٹُونے ٹوٹکے درج ہیں۔ ابن خلدون جادو اور سحر کو برحق مانتا ہے اس نے اپنے مقدمے میں مسلمہ بن احمد المجرلیطی کی کتاب الغایت کا ذکر کیا ہے جس میں سیکڑوں طلسم درج ہیں۔ فخرالدین رازی نے اپنی ایک کتاب سرّالمکتوم سحر و نیرنج کے علم پر لکھی ہے۔ فارسی کی ایک کتاب مجمع الدعوات میں افسوں، طلسم اور جادو کے ٹُوٹکے اور تعویذ درج ہیں۔ سرسید احمد خان مسلمانوں کے جادو اور سحر کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں[1]

> ”عربی لغت میں سحر کے معنی ہیں کہ جو واقعہ کسی لطیف و دقیق امر سے ہوا ہو اور اس کے ہونے کا سبب پوشیدہ ہو وہ سحر ہے۔ بعض عالموں نے سحر کی آٹھ قسمیں بتائی ہیں۔
>
> (۱) بذریعہ تسخیرِ کواکب
>
> (۲) جادوگر اپنے نفسِ انسانی کی قوّتِ واہمہ میں بذریعہ مشق و ورزش اور مجاہدات ایسی طاقت بہم پہنچا لیتا ہے کہ دوسرے اشخاص پر طرح طرح کے اثر ڈال سکتا ہے۔ اور دوسرے اشخاص کے واہمے کو ایسا مغلوب کر لیتا ہے کہ جو شے موجود نہیں ہے وہ فی الواقع موجود معلوم ہوتی ہے۔
>
> (۳) جادو کی باتیں جو ارواح کی اعانت سے ہوتی ہیں۔ اس نوع کے ساحروں کو یقین ہوتا ہے کہ علاوہ مخلوقات موجودہ محسوسہ کے زمین پر ارواح بھی ہیں جو انسان میں حلول کر کے نفسِ انسانی یا نفسِ حیوانی میں مل جاتی ہیں۔ ان میں پری اور جنّ بھی شامل ہیں۔ جنّوں میں کافر بھی ہوتے ہیں اور مسلمان بھی۔ بھوت پریت اسی قبیل سے ہیں۔ عامل علوی و سفلی دونوں قسم کی ارواح کو مسخر کر لیتے ہیں اور اپنے تئیں علوی عامل اور سفلی عامل قرار دیتے ہیں۔

---

[1] مضامین سرسید احمد خان

(۴) جو خیال یا نظر کی غلطی سے ایک امر دوسری حالت پر جو اس کی اصل حالت سے عجیب تر دکھائی دیتی ہے جیسا کہ بھان متی کے تماشے ہیں ۔

(۵) وہ امور جو بذریعہ صنائع و اعمال جو ہندسہ و جرّ ثقیل کے ظاہر ہوتے ہیں۔ جیسے گھڑی سے پرندہ نکل کے بولتا ہے بعض لوگ اسے جادو میں شمار نہیں کرتے کہ اس کا سبب معلوم ہوتا ہے۔

(۶) وہ قسم ہے جس میں امور بذریعہ خواص ادویہ کے ظاہر ہوتے ہیں ۔

(۷) وہ امور جن کا ظہور میں لانا بذریعہ تاثیر اسماء کے بیان کیا جاتا ہے۔ ساحروں کے خیال میں بہت سے الفاظ اور اسماء کے لئے موکل ہیں اور ان کے ورد سے موکل تابع ہو جاتے ہیں ۔

(۸) لگائی بجھائی ۔ ادھر کی بات ادھر لگا دی ۔ جورو خصم کو بھڑوا دیا ۔

ہمارے زمانے کے ایک مصری عالم حامد عبدالقادر نے بھی سحر کی آٹھ ہی صورتیں گنائی ہیں مثلاً

(۱) کلدانیوں کا سحر جو سیاروں کے اثرات کے قائل تھے اور معالجے میں انہیں سے استمداد کرتے تھے ۔

(۲) نفسِ قوی رکھنے والے اشخاص کا سحر جو دوسرے نفوس کو متاثر کر لیتے ہیں ۔

(۳) جنوں اور شیاطین سے استعانت ۔ کلدانی ارواح سے بھی استمداد کرتے تھے ۔

(۴) تخیلات نظر بندی ، فریب حواس یعنی شعبدہ بازی یا کرشمہ ۔ اس کی اصلی بنیاد وہم ہے یا فریب ہوش و خرد ۔

لے : العلاج النفسانی ۔

(۵) آلات کی مدد سے اعمالِ عجیبہ۔

(۶) لطیف انداز میں جو بات چاہنا مفہوم کے قلب میں ڈال دینا یہ تنویم[1] سے حصول

قاصد کی کوشش کرتے ہیں وغیرہ۔

مد عبدالقادر کہتے ہیں کہ اسلام نے سحر سے انکار کیا ہے لیکن اسی کے بدلے میں مسلمانوں نے ایک بات نکالی ہے یعنی قرآن

شفا طلبی۔ امام فخرالدین رازی لکھتے ہیں کہ قرآن تمام امراضِ جسمانی کے لئے شفا ہے چنانچہ قرآنی آیات سے تعویذ لکھے

تے ہیں اور امراض کا علاج کیا جاتا ہے۔ سرسید احمد خان نے محولہ بالا مضمون میں اس بات کی مخالفت کی ہے اور کہا

ہے کہ قرآن مجید کی آیتوں کو بطور عمل پڑھنا اور ان میں وسعتِ رزق یا کشودِ کار یا شفائے امراض تلاش کرنا جائز نہیں

ہے۔ ان کے خیال میں قرآن کا اصل مقصد لوگوں کو ہدایت دینا ہے۔ بابلی یا کلدانی سات سیاروں کو دیوتا سمجھ کر ان کی پوجا

تے تھے اور حلِ مشکلات اور علاجِ امراض کے لئے ان سے رجوع لاتے تھے ہر سیارے کی مورتی کے سامنے بوقت

جت طلبی اس کی مخصوص خوشبو جلاتے تھے مثلاً زحل کا مجرد اشنہ (ایک خوشبودار گھاس) اور بلادر تو شمس کا مشک

گل سرخ، مشتری کا صندل سرخ، زرکافور، زہرہ کا زعفران، قمر کا عنبر اشہب وغیرہ۔ وہ سیارے کے معبد میں جاتے

ت ان کے مخصوص رنگ کے کپڑے پہنتے تھے مثلاً زحل کے لئے نیلے رنگ کا لباس، مشتری کے لئے زرد،

یخ کے لئے سبز، زہرہ کے لئے بنفشی، آفتاب کے لئے زرد و سرخ، قمر کے لئے سفید جامہ زیب تن کرتے تھے سات سیاروں

رعایت سے سات کے عدد سے طلسماتی اثرات منسوب کرتے تھے۔ ہفتے کے سات دن، سرگم کے سات سُر، سات

ں۔ ایرانی نوروز کے ایام میں سات ایسی اشیاء کھاتے تھے جن کا نام س سے شروع ہوتا ہے یعنی سیب، سیر (لہسن)

ق، سنجد، سمنو، سرکہ، سبزہ (سبزی)۔ سات رنگوں کے دھاگے جادو کے عمل میں استعمال کرتے تھے۔ سات

ونوں کا کنگن ایرانی دلہن کو پہنایا جاتا تھا جینیوں کے سات امام، ہپت ہندو (سات بڑے دریا) یہودیوں کے شمع دان

سات شاخیں، ہپت رشی (سات رشی)، سات سلام، سات دوزخ، سات اصحاب کہف وغیرہ میں بھی سات

---

[1] HYPNOSIS

کے ہندسے کا تقدس کار فرما ہے۔ بقراط نے سات کے ہندسے کے انسانی جسم پر پیہم اثرات کا ذکر کیا ہے۔ یہاں پنجتن پاک کی رعایت سے ۵ کے ہندسے سے غیر معمولی اثرات منسوب کرتے ہیں۔ ۵ کا ہندسہ نظرِ بد کے دفعیے کے لئے موثر سمجھا جاتا ہے قالینوں میں پانچ پھولوں، پانچ درختوں اور پانچ پتوں کے نقش اسی مقصد کے لئے بنائے جاتے ہیں۔ تعویذوں میں پانچ خانے رکھتے ہیں۔ عربوں اور ایرانیوں کی کوخت گری اور اقلیدسی اشکال میں ۷ اور ۵ کے ہندسوں کا نقش ملتا ہے فیثاغورس اور اس کے پیروؤں کا مقدس ہندسہ ۴ تھا جسے وہ طلسماتی کہتے تھے چنانچہ یہ ہندسہ ہر کہیں مقدس سمجھا جانے لگا جنت کے چار دریا، چار آفاق، چاند کے چار مراحل، چار بنیادی رنگ، چار مزاج (سوداوی، دموی، بلغمی، صفراوی) چار عناصر وغیرہ اسی تقدس سے یادگار ہیں۔ فیثاغورسی مربع کو روح کی علامت مانتے تھے۔ ہمارے زمانے میں ژونگ نے تربیعیت[1] کے طلسمی اثرات کا ذکر کیا ہے۔ فیثاغوریوں کے فلسفے میں ہندسوں اور حروف کے طلسماتی اثرات کو بڑی اہمیت حاصل تھی ان کے خیال میں کائنات ہندسوں ہی سے بنی ہے اور طاق اور جفت میں جدل و پیکار اسے قائم رکھے ہوئے ہے مسلمانوں میں اخوان الصفا نے اس نظریے کے حق میں استدلال کیا اور یہ روایت مسلمانوں کے فلسفے میں در آئی جو لوگ حروف کو مقدس مانتے تھے انہیں حروفی کہا جاتا تھا۔ اس فرقے کو مرتد قرار دے کر شاہ عباس صفوی نے ان کا قتل عام کرایا۔ سیمیا یا سفید جادو کا علم اسرار الحروف سے گہرا تعلق رہا ہے۔ ابن سینا نے حروف کی تین قسمیں گنائی ہیں (۱) آتشی حروف: ا ہ ی م ن ت ث (۲) خاکی حروف ج ز ک س ف ت ع (۳) حروفِ بادی: ہ ر ش ذ ص ط ا م، حروفِ آبی ب د ج غ خ ق۔ یہ تقسیم[2] چار عناصر کی رعایت سے کی گئی ہے گویا ان حروف کے خواص متعین کئے گئے ہیں جن سے طب اور تعویذوں میں کام لیا جاتا ہے۔ ہمارے ہاں پیرزادے داڑھ کا درد یوں باندھتے ہیں کہ کسی درخت کے تنے پر ف ہ ع، ط و غیرہ کے حروف لکھ دیتے ہیں اور پھر دم پڑھتے ہوئے ایک کے بعد دوسرے حرف پر کیل ٹھونکتے جاتے ہیں جب حرف پر درد رک جائے اس پر کیل ٹھونک دی جاتی ہے مشرق و مغرب میں ۱۲ کا ہندسہ مقدس اور طلسماتی سمجھا جاتا ہے کیونکہ یہ بارہ برجوں کی نمائندگی کرتا ہے اس کا تقدس

---

[1] QUATERNITY

[2] کنوز المعزمین

بنی اسرائیل کے بارہ احبار اور اثنا عشریہ کے بارہ اماموں میں موجود ہے۔ ۱۳ کے ہندسے کو اکثر اقوام منحوس اور شیطانی سمجھتی رہی ہیں۔ کہتے ہیں کہ اس کا تعلق کالے جادو سے ہے۔ اہل مغرب دعوت کے موقعوں پر ۱۳ ویں کرسی پر نہیں بیٹھتے۔ توہم یہ ہے کہ جو شخص ۱۳ نمبر کی کرسی پر بیٹھے گا، وہ چند دنوں میں مر جائے گا۔ یہودا اسکریوطی حضرت عیسٰی کا ۱۳ واں حواری تھا جس نے مخبری کر کے آپ کو گرفتار کر دیا تھا۔ اس کے بعد خاص طور سے عیسائی دنیا میں یہ ہندسہ نحس سمجھا جانے لگا۔ ایران میں ۱۳ کی گنتی کرتے ہوئے ۱۳ نہیں کہتے بلکہ یازدہ کے بعد زیادہ کہہ کر آگے بڑھ جاتے ہیں۔ ایران میں ۱۳ کے ہندسے کو غیر معمولی قوت اور برکت کا حامل سمجھا جاتا ہے۔

ہندوؤں کے ہاں جادو کو اگم ودیا کہتے ہیں۔ جو شخص اس علم کا ماہر ہو وہ چولا بدل کر دوسرے قالب میں جا سکتا ہے، ہوا میں اڑ سکتا ہے، پانی پر چل سکتا ہے، سوکھے درختوں سے پھل لے سکتا ہے اور مہلک مرض کو دفع کر سکتا ہے۔

ہندوؤں کی لوک کہانیوں اور داستانوں میں ایسے جادوگروں اور جوگیوں کا ذکر آتا ہے جو اگم ودیا کے بل پر جب چاہیں لوگوں کی نظروں سے غائب ہو جاتے ہیں، چشم زدن میں برسوں کی مسافت طے کر سکتے ہیں، منتر پڑھ کر اچھے بھلے آدمی کو پتھر کا بت بنا دیتے ہیں، ویرانوں میں سرسبز باغ لگا دیتے ہیں۔ ان کے پاس ایسے پریم گٹکے موجود ہیں جو کٹھور سے کٹھور حسینہ کا دل موم کر دیتے ہیں اور اسے چاہنے والے کا والہ و شیدا بنا دیتے ہیں یا دو چاہنے والوں کے دلوں میں نفرت کی دیوار کھڑی کر دیتے ہیں۔ ہندوؤں کا ایک مشہور جادو کا کرتب یہ ہے کہ وہ آن واحد میں سب کے سامنے آم کا پیڑ اگا کر حاضرین کو اس کے پکے ہوئے میٹھے آم کھلا دیتے ہیں۔ اسی طرح وہ سب کے سامنے ایک رسہ آسمان کی طرف پھینکتے ہیں اور اس پر چڑھ کر غائب ہو جاتے ہیں۔ کچھ دیر کے بعد کسی کا کٹا ہوا خون آلود سر زمین پر گرتا ہے۔ یہ شعبدے ناظرین کے ذہنوں کو قوت ارادی سے مسحور کر کے دکھائے جاتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ جوگیوں کے پاس ایک گولی ہوتی ہے گٹکا یا جس کی مدد سے وہ ہوا میں اڑتے ہیں۔ طلسماتی کاجل لگا کر وہ جس عورت کی طرف دیکھیں وہ بے اختیار ان پر فریفتہ ہو جاتی ہے۔ سانپ کے کاٹے کا علاج وہ مہرہ مار سے کرتے ہیں جو ان کے دعوے کے مطابق ایک خاص قسم کے ناگ

کے منہ سے نکالا جاتا ہے۔ پارس پتھر سے وہ ہر دھات کو سونے میں تبدیل کر دینے کا دعویٰ بھی کرتے ہیں۔ ظاہر ان توہمات کا تعلق شدید نفسیاتی محرومیوں سے ہوتا ہے۔ انسان کی جو خواہش عملی دنیا میں پوری نہ ہو وہ اسے عالم تخیل میں پوری کر لیتا ہے۔ ابتدائے تمدن سے یہ اس کی کمزوری بھی ہے کہ کاش کہ ایسا ہوتا اور پھر فرض کر لیا جاتا ہے کہ فی الواقع ایسا ہو گیا ہے جیسے کوئی بچہ یہ خواہش کرے کہ کاش میں ریل کا ڈرائیور ہوتا اور پھر فرض کرے کہ وہ واقعی ریل کا ڈرائیور بن گیا ہے۔ [illegible] اور تکمیل آرزو کا یہ تصور جادو میں شروع سے موجود رہا ہے۔

یورپ کی تاریک صدیوں میں جادو شیطان کی پوجا سے وابستہ ہو گیا۔ جادوگر شیطان سے ربط قائم کر کے اپنے مقاصد حاصل کرنے میں کوشاں رہتے تھے۔ جادوگرنیوں کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ شیطان اور اس کے چیلوں کے ساتھ خلوت میں جاتی ہیں۔ شیطان کے چیلوں کو انکوبائی اور سکوبائی کہتے تھے جو بقول دنفر جادوگرنیوں کو حاملہ کر دیتے تھے۔ جادوگروں اور جادوگرنیوں کی خفیہ مجالس سبت (زحل کا دن) کی رات کو کسی ویران جگہ پر بپا ہوتی تھیں جن کے لیے عموماً چاند کی ۱۳ ویں رات کا انتخاب کیا جاتا تھا۔ یہ مجالس مرغے کی بانگ تک جاری رہتی تھیں۔ کہا جاتا تھا کہ ان جلسوں میں جادوگر اور جادوگرنیاں شیطان سے معاہدے کرتے تھے۔ کلیسائے روم کی عبادت کے مقابلے میں کالی رسم عبادت[1] ادا کی جاتی تھی جس میں عیسائیوں کی عبادات کا تمسخر اڑایا جاتا تھا۔ اس میں ایک مادر زاد برہنہ عورت کو قربان گاہ پر لٹا دیتے تھے۔ پادری کا لباس سیاہ ہوتا تھا۔ موم بتیاں بھی سیاہ موم ہی کی بنائی جاتی تھیں۔ مقدس اسماء کے بجائے اس تقریب پر شیطان کے ناموں کا ورد کیا جاتا تھا۔ سبت کی ضیافت میں نمک کا استعمال ممنوع تھا۔ جادوگرنیاں اس شخص کے سامنے سجدے میں گر پڑتی تھیں جسے شیطان کا نمائندہ بنا کر کھڑا کیا جاتا تھا۔ سبت کا شیطان کبھی کبھی بکرے یا کالے بلے کی صورت میں ظاہر ہوتا تھا جس کی دُم کو جادوگرنیاں بوسہ دیتی تھیں۔ مجلس اور پوجا کے دوران میں مرد عورتیں شراب کے نشے میں دھت دیوانہ وار ناچتے تھے اور ساری رات فسق و فجور میں غرق رہتے تھے۔

---

[1] BLACK MASS

وسطی زمانوں کے یورپی جادوگرنیوں سے خائف رہتے تھے مبادا وہ منتر پڑھ کر مردوں کو عنین اور عورتوں کو بانجھ بنا دیں۔ اور کوئی ایسا مشروب پلا کر انہیں دیوانہ کر دیتی تھیں۔ ان کے بارے میں عام خیال یہ تھا کہ وہ دودھ پیتے بچوں کو چرا کر اور ان کو قتل کر کے ان کے خون سے زہریلے مشروب بناتی ہیں یا ان بچوں کو اپنی خفیہ رسوم میں شیطان کی بھینٹ کر دیتی ہیں۔ بائبل کے بیان کے مطابق جادوگرنیوں کا سایہ نہیں پڑتا تھا۔ عہد نامہ قدیم میں لکھا ہے کہ "تو جادوگرنی کو زندہ نہ چھوڑنا۔" پوپ الگزنڈر چہارم نے ۱۲ نومبر ۱۲۵۸ء کو پہلی بار جادوگرنیوں کے خلاف حکم جاری کیا جس سے ہر طرف پکڑ دھکڑ شروع ہو گئی۔ سولھویں اور سترھویں صدیوں میں سارے یورپ میں جادوگرنیوں کو آگ کے شعلوں میں جھونکنے کا جنون پھیل گیا۔ پادریوں کا خیال تھا کہ قدیم یونان کے ڈلفی کے مندر کی پروہتانی کی طرح جادوگرنیوں میں کوئی فوق الطبع شیطانی قوت حلول کر گئی ہے اور وہ واہی تباہی بکنے لگتی ہیں۔ ڈومنیکی راہب خاص طور سے پنجے جھاڑ کر عورتوں کے پیچھے پڑ گئے۔ انہیں ہر عورت میں جادوگرنی نظر آنے لگی۔ وہ کہتے تھے کہ جادوگرنیاں شیطان مت کی پیرو ہیں۔ وہ شیطان کے بوسے لیتی ہیں اور اس کے ساتھ خلوت میں جنسی بے راہ روی کے مظاہرے کرتی ہیں۔ ۱۴۸۶ء میں دو ڈومنیکی راہبوں انسٹی ٹورس اور جیمز سپرنگر نے جادوگرنیوں کے خلاف تحریک تیز تر کر دی۔ عورتوں پر الزام یہ لگایا گیا کہ وہ مرد سے زیادہ ہوس کار ہوتی ہیں اور مردوں سے ان کی تسکین نہ ہو تو شیطان اور اس کے چیلوں کے پاس جاتی ہیں۔ نیز آدم کی ٹیڑھی پسلی سے پیدا ہونے کے باعث وہ فطرتاً کج فکر اور کج رو ہوتی ہیں لہٰذا انہیں راہ راست پر لانا ناممکن ہے۔ ان کے جادوگرنی بننے کا باعث یہ جنسی ہوس ہے جس کی تسکین ممکن نہیں ہے۔ عورت کے فطرتاً خبیث ہونے کی یہ دلیل بھی دی گئی کہ جنت میں سب سے پہلے عورت ہی کو شیطان نے مخاطب کیا تھا اور عورت ہی کے کہنے پر آدم نے پہلا گناہ کیا تھا۔ اسی وجہ سے عورت اور شیطان میں اتحاد قائم ہے۔ عورتیں شعلہ گردوں یعنی انکوباؤ کے ہاں خلوت میں جاتی ہیں۔ بعض راہبات اور کنواری لڑکیوں پر بھی جادوگرنی ہونے کا الزام لگایا گیا۔ ۱۵۸۲ء اور ۱۵۹۳ء کے درمیانی عرصے میں صرف ٹریویز کے علاقے میں چار سو جادوگرنیاں آگ کے بھڑکتے ہوئے شعلوں میں جھونک دی گئیں۔ تولوس اور اس کے نواحی علاقے میں ایک

عورتوں کو جادوگرنی کا الزام لگا کر آگ کے الاؤ میں جلا کر راکھ کر دیا گیا۔ یہ عورتیں عام طور سے امیر گھرانوں سے تعلق رکھتی تھیں جن کی دولت اور املاک ضبط کر لی جاتی تھی۔ ان پر ایک الزام یہ بھی لگایا گیا کہ وہ شیطان سے بپتسمہ لیتی ہیں اور اس سے یہ عہد کرتی ہیں کہ وہ کم از کم ایک نومولود بچے کی قربانی ضرور دیں گی۔ یاد رہے کہ مشہور فرانسیسی محب وطن ژاں دارک کو بھی جادوگرنی قرار دے کر اسے آگ میں جلایا گیا تھا۔ جب کبھی فصلیں پروان نہ چڑھتیں یا قحط سالی کے آثار دکھائی دیتے تو جادوگرنیوں کا شکار زور پکڑ جاتا تھا۔ یہ وبا جرمنی سے شروع ہوئی اور سارے یورپ میں پھیل گئی۔ عورتوں کو مادر زاد برہنہ کر کے اور ان کے بدن میں سوئیاں چبھو چبھو کر پتہ لگایا جاتا تھا کہ وہ جادوگرنیاں ہیں کہ نہیں۔ انگلستان میں جادوگرنیوں کو پھانسی دی جاتی تھی۔ ان دو صدیوں میں ہزاروں عورتوں کو تہ تیغ کیا گیا جنہیں ہوش مند لوگ بے گناہ سمجھتے تھے۔ جادوگرنیوں کی رسوم عبادت کی کچھ جھلکیاں لوئی چہاردہم کی داشتہ مادام مونتے پان کے سوانح میں ملتی ہیں۔ شاہ لوئی کا جی اس عورت سے بھر گیا اور وہ مادام فونتے نوں کی زلف گرہ گیر کا شکار ہو گیا جس سے قدرتاً مادام مونتے پان کو سخت صدمہ ہوا۔ اس نے شاہ لوئی کا دل دوبارہ جیتنے کے لئے تین بار جادوگرنیوں کی سیاہ رسم عبادت میں شرکت کی جہاں اسے قربان گاہ پر برہنہ حالت میں لٹا دیا جاتا تھا۔ اس کی چھاتیوں کے درمیان ایک پیالہ رکھا جاتا جس میں کسی شیر خوار ذبح کئے ہوئے بچے کا خون ہوتا تھا۔ پھر اس لہو سے مشروب تیار کر کے شاہ لوئی کو پلایا جاتا تھا۔ اس رسم کے دوران میں بابل قدیم کی حسن و عشق کی دیوی عشتار کی مناجات میں گیت گائے جاتے تھے۔

امریکہ اور یورپ میں آج بھی شیطان کے پجاری[1] موجود ہیں جو خفیہ مجالس برپا کرتے ہیں۔ وہ جناب عیسیٰ سے بیزاری کا اظہار کرتے ہیں اور شیطان سے مدد مانگتے ہیں۔ ان کا دعویٰ ہے کہ وہ ازمنہ وسطیٰ کے جادوگروں کے جانشین ہیں۔ وہ بھی کلیسائے روم کی تضحیک کرنے کے لئے سیاہ رسم عبادت ادا کرتے ہیں۔ ان کی خفیہ مجلس میں کالی بلی کا خون بہایا جاتا ہے۔ ان کا پروہت سیاہ لباس میں ملبوس ہوتا ہے جس پر طلسماتی نشانات کڑھے ہوتے ہیں۔ شیطان پرستوں کے عقیدے کے مطابق شیطان خدا سے زیادہ طاقت ور ہے اور وہ کائنات پر اپنی کھوئی ہوئی حاکمیت کو بحال کرنے میں دن رات کوشاں ہے۔

---

[1] SATANISTS

یہ لوگ اپنی سیاہ رسم عبادت میں چار چیزوں کا اہتمام کرتے ہیں (۱) ایک مُرتد پادری (۲) ایک کسبی (۳) ایک کنواری لڑکی ، (۴) ایک مقدس میزبان ۔ قربان گاہ پر صلیب الٹا کر رکھ دی جاتی ہے جس پر کنواری کو مادر زاد برہنہ لٹا دیا جاتا ہے ۔ سیاہ پوشش پادری عبادت کی دعائیں الٹی پڑھتا ہے ۔ سُرخ پوش کسبی مُریدنی کا کردار ادا کرتی ہے ۔ کنواری کی چھاتیوں کے درمیان شراب کا پیالہ رکھتے ہیں اور شراب کے چند قطرے اُس کے بدن پر چھڑک دیتے ہیں پھر شیطان یا عشتار دیوی کو مدعو کیا جاتا ہے اس قسم کی مجالس شیطان کی پوجا کے نام پر جنسی کجروی برپا کرتے ہیں اور اپنے فسق و فجور پر جادو کا پردہ ڈال دیتے ہیں ۔

رسوم عبادت کے خاتمے پر جنسی بے راہ روی کے نہایت شرمناک مظاہرے کئے جاتے ہیں ۔ جادو قدیم ترین زمانوں سے اقوام عالم میں کم و بیش ایک ہی صورت میں موجود رہا ہے اور آج بھی وحشی قبائلیوں کے علاوہ مہذب اقوام میں بھی پایا جاتا ہے لیکن اس کا عملی تحقیقی مطالعہ علم انسان کی تدوین کے ساتھ وابستہ ہے ۔ دار ونسن ، سپنسر ، درخائیم ، ٹائلر ، فریزر ، مالی نوسکی وغیرہ نے علم انسان کے مطالعے کے لئے افریقہ ، ایشیا ، آسٹریلیا اور امریکہ کے جنگلی دیسیوں کا مشاہدہ کیا تو ان پر ایک انکشاف یہ بھی ہوا کہ ان لوگوں میں روحوں کے مَت کے ساتھ ساتھ جادو کی رسوم و عقائد بھی یکساں نوعیت کی پائی جاتی ہیں ۔ اس مشاہدے سے جہاں روحوں کے مَت اور جادو کے باہمی ربط کا پتہ چلا وہاں جادو کی ماہیت کے بارے میں تحقیق کا عنوان بھی پیدا ہو گیا ۔ تحلیل نفسی کے طلبہ بھی جادو میں دلچسپی لینے لگے کیوں کہ ان کے خیال میں جادوگریاں قدیم زمانے کے انسان کے دورِ طفلی کی نشان دہی کرتی ہیں اور جادوگر کا ذہن بڑی حد تک ایک ننھے بچے کے ذہن کے مشابہ ہوتا ہے ۔ اس ضمن میں فریزر نے قابلِ قدر کام کیا ہے ۔ جادو کی ماہیت کے بارے میں جے ۔ جی فریزر کے نظریے کو بڑا فروغ ہوا ہے سب سے پہلے ہم اس کی تلخیص پیش کریں گے ۔

جے ۔ جی فریزر کے خیال میں جادو کے بنیادی اصول دو ہیں[1] ۔

(۱) مُسبّب سبب سے ملتا جلتا ہے یا ایک شے دوسری مُشابہ شے کو جنم دیتی ہے ۔

(۲) جو اشیاء ایک دوسری کے قریب رہی ہوں وہ جدا ہو جانے کے بعد بھی دوری کے باوجود ایک دوسری کو متاثر

---

[1] THE GOLDEN BOUGH, J.G.FRAZER.

کرتی رہتی ہیں جیسے کو تشابہ کا قانون اور دوسرے کو قرب یا چھوت[1] کا قانون کہا جائے گا۔ تعویذ گنڈے اور منتر تشابہت کے قانون پر مبنی ہوتے ہیں۔ انہیں جادو بالمثل[2] کہا جائے گا۔ قرب یا چھوت پر مبنی تعویذ گنڈوں یا جنتر منتر کو چھوت کے جادو کا نام دیا جائے گا۔ جادو بالمثل ربط خیالات کی مشابہت پر مبنی ہے اور چھوت کا جادو ربط خیالات پر منحصر ہے۔ دونوں ربط خیالات کے غلط اطلاق کے نتائج ہیں۔ جادو بالمثل میں غلط طور پر فرض کر لیا جاتا ہے کہ جو اشیاء آپس میں مشابہت رکھتی ہیں وہ اصلاً ایک ہی ہوتی ہیں اور چھوت کا جادو یہ غلط مفروضہ قائم کرتا ہے کہ جو اشیاء کسی وقت ایک دوسری کے قریب رہی ہوں۔ وہ ہمیشہ باہم مربوط رہتی ہیں خواہ بظاہر ان میں کتنی ہی دوری واقع ہو جائے۔ اس بات کی وضاحت مثالوں سے ہوگی۔ جب کوئی جادوگر کسی مریض کا علاج کرنا چاہتا ہے تو وہ اپنے آپ پر وہی علامتیں طاری کر لیتا ہے جو مریض سے ظاہر ہوتی ہیں۔ مثلاً اگر مریض مرگی میں مبتلا ہے تو جادوگر بھی اسی کی طرح زمین پر دھڑام سے گر کر اکڑ جاتا ہے، منہ بگاڑتا ہے۔ اور ہاتھ پاؤں چلانے لگتا ہے۔ اس طرح گویا وہ مریض کو ستانے والی بدروح کو اپنے میں منتقل کر لیتا ہے جس سے مریض شفایاب ہو جاتا ہے اور چونکہ وہ خود بدروحوں کو پہچانتا ہے۔ اس لئے وہ اسے چھوڑ کر چل جاتی ہے۔ ہمارے ہاں عورتیں کسی کی بلائیں لیتے ہوئے اپنے ہاتھوں کو یوں اس کے سر کے قریب لے جا کر اپنے سر کے قریب لاتی ہیں۔ گویا وہ اس کی بلائیں اپنے سر لے رہی ہیں۔ اس کی ایک تاریخی مثال یہ ہے کہ ایک دفعہ شاہجہان سخت بیمار پڑ گیا۔ شہزادی جہاں آرا نے ایک غلام بلوایا اور اسے کہا کہ بادشاہ کے پلنگ کا چکر لگا کر باہر نکل جائے۔ اس طرح گویا غلام بادشاہ کی بیماری کو اپنے ساتھ لے کر باہر چلا گیا۔[3] ظہیر الدین بابر کے بارے میں بھی گلبدن بیگم لکھتی ہیں کہ اس نے ہمایوں کے پلنگ کے چکر لگا کر اپنے بیٹے کی بیماری کو اپنے سر لے لیا تھا۔ جادوگر جن لوگوں کو ایذا پہنچانا چاہیں ان کے کپڑے کے پتلے بنوا کر ان میں سوئیاں چبھوتے ہیں اور اس طرح بزعم خود ان کی ہلاکت کا سامان کرتے ہیں۔ کئی دفعہ دشمن کا مٹی کا پتلا بنوا کر اسے ندی میں رکھ دیتے ہیں۔ جوں جوں وہ پتلا پانی میں گھلتا جاتا ہے دشمن بھی گھل گھل کر مرنے لگتا ہے۔ تاریخ ایران میں لکھا ہے کہ ایک دن شاہ عباس صفوی کو کسی نجومی نے بتلایا کہ اگلا ہفتہ آپ پر بڑا بھاری ہوگا۔ بادشاہ نے ایک شخص یوسف خاں نامی کو تخت و تاج سونپ دیا تاکہ آنے والی ہلاکت اس پر سے ٹل جائے۔ ہفتے کے بعد اسے قتل کرا دیا گیا۔ اسرائیلی روایات میں

---

[1] CONTAGION.

[2] HOMEOPATHIC MAGIC.

[3] ہمایوں نامہ

قربانی[1] کی بکری کی رسم بھی جادو بالمثل پر مبنی تھی سال میں ایک مرتبہ سب مرد عورتیں قربانی کی بکری کو باری باری چھوتی تھیں گویا اپنے گناہ اسے منتقل کر رہی ہیں اور پھر ایک اونچی چٹان سے گرا کر بکری کو ہلاک کر دیتے تھے۔ قرب یا چھوت کا جادو یوں بھی کیا جاتا ہے کہ جس شخص کو ضرر پہنچانا مقصود ہو اس کے سر کے بال، ناخن یا پاؤں تلے کی مٹی لے کر اس پر منتر پڑھتے اور پھر اسے آگ میں پھنکوا دیتے ہیں۔ خیال یہ ہے کہ اس طرح وہ شخص ہلاک ہو جاتا ہے۔ آج بھی ایشیا، افریقہ اور آسٹریلیا کے علاوہ ہندوستان کے بعض علاقوں میں بھی سر کے بال اور تراشے ہوئے ناخن وغیرہ نہایت احتیاط سے چھپا کر رکھتے ہیں مبادا وہ کسی دشمن کے ہاتھ لگ جائیں۔ اس عمل کی تہہ میں یہی خیال مخفی ہے کہ چونکہ سر کے بال یا ناخن اس شخص کے جسم کے تھے اس لئے جدا ہونے کے بعد ان میں اور اس شخص میں ربط و تعلق باقی ہے لہٰذا انہیں جلانے سے وہ بھی تپ کی آگ میں جل کر مر جائے گا۔ بعض قبائل اپنا نام تک کسی اجنبی کو نہیں بتاتے کہ اس طرح وہ اجنبی کے قابو میں آ جائیں گے۔ ہندوؤں میں آج بھی بچے کے تین تین نام رکھتے ہیں۔ اور بعض دفعہ دلہن کے سسرال آنے پر اس کا نیا نام رکھ دیا جاتا ہے۔

جے۔ جی۔ فریزر نے جادو کے دو شعبوں کا ذکر نہایت تفصیل سے کیا ہے (۱) مثبت (۲) منفی۔ مثبت عمل سے مطلوبہ واقعہ کو رونما کرنے کا اہتمام کیا جاتا ہے اور منفی یا ٹیبو[2] سے ناپسندیدہ واقعہ کو وقوع پذیر ہونے سے روک دیا جاتا ہے۔ یہ دونوں اثرات مشابہت اور قرب کے قوانین کے تحت پیدا کئے جاتے ہیں۔ ٹوٹکے اور اخلاقی روک ٹوک میں فرق ہے مثلاً یہ کہنا ٹیبو نہیں ہے کہ اپنا ہاتھ آگ پر نہ رکھو۔ یہ تو فہم عامہ کی بات ہوگی کہ اس میں ایک حقیقی خطرہ موجود ہے۔ جب کہ ٹیبو کی روک میں خطرناک نتیجہ یا ہلاکت کا احتمال محض واہمہ بے بنیاد ہوتا ہے مثلاً یہ ٹیبو محض واہمہ ہے کہ کوئی بانجھ یا حائضہ عورت زچہ کے پاس پھٹکنے نہ پائے۔ وحشی قبائل میں وضع حمل سے دو ماہ پہلے عورت کا رسی چھونا ممنوع ہے مبادا اس سے جنین کی انتڑیاں الجھ جائیں جادو بالمثل کی معروف مثال یہ ہے کہ جاوا سماٹرا کے اندرونی علاقے میں عورتیں دھان کی فصل بوتے وقت اپنے سر کے بال کھلے رکھتی ہیں کہ فصل گھنی ہو اور اس کی بالیں لمبی ہوں۔ یوگنڈا کے ایک قبیلے میں یہ عقیدہ پایا جاتا ہے کہ جو عورت بانجھ ہو اس کے شوہر کے باغیچے کے پیڑ اور پودے مرجھا جاتے ہیں۔ اسی طرح ایک جنگلی قبیلے میں یہ خیال عام ہے کہ جو عورت جڑواں

---

[1] SCAPE – GOAT.
[2] TABOO

کیلئے کہا نے اس کے یہاں جُڑواں بچے پیدا ہوں گے ۔

افریقہ اور آسٹریلیا کے وحشی قبیلوں میں اجتماعی جادو بھی کیا جاتا ہے جس سے سارے قبیلے کو فیض پہنچانے کی کوشش کی جاتی ہے ۔ جہاں کہیں عمومی بہتری کے لئے جادو کی رُسوم ادا کی جاتی ہیں وہاں جادوگر کا منصب بڑی اہمیت حاصل کر لیتا ہے اور بعض اوقات وہ سردار یا بادشاہ بھی بن بیٹھتا ہے چنانچہ قبیلے کے چالاک اور جاہ پسند آدمی اس منصب کے حصول کے لئے کوشاں رہتے ہیں اور اس طرح وہ دولت اور حکومت سے بہرہ ور ہو سکتے ہیں ۔ ان مکاروں کو بخوبی علم ہوتا ہے کہ سادہ لوح عوام کے ذہن و قلب پر کس طرح تسلّط قائم کیا جا سکتا ہے اور انہیں کیسے اپنے مفادات کی پرورش کے لئے آلۂ کار بنایا جا سکتا ہے چنانچہ شروع سے غیر معمولی ذہین و بیباک اور مُہم باز لوگ ہی حکومت پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہوتے رہے ہیں ۔

عالمِ مادی کے سائنٹیفک اور جادوئی نقطۂ نظر میں گہری مماثلت ہے ۔ دونوں کی رُو سے واقعات کا تسلسل باقاعدہ اور یقینی تصوّر کیا جاتا ہے یعنی واقعات پر اٹل قوانین حاوی ہیں جن کے عمل کو پہلے سے دیکھا اور قیاس کیا جا سکتا ہے دونوں کائنات میں سلسلۂ سبب و مسبب کے قائل ہیں اور اس میں حادثے اور تلوّن کو نہیں مانتے ۔ دونوں میں اُن لوگوں کے سامنے جو اشیاء کے اسباب کا علم رکھتے ہیں ۔ وسیع امکانات پیدا ہو جاتے ہیں ۔ سائنس دان اور جادوگر پُراسرار رموز سے واقفیت پیدا کر کے نیچر کے اعمال کو اپنی مرضی کے مطابق چلانے کی کوشش کرتے ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ جادو اور سائنس دونوں انسان کے لئے جذب و کشش کا باعث ہوتے رہے ہیں اور اسے تحصیلِ علم کی ترغیب دیتے رہے ہیں ۔

جادو کی خامی اس بات میں نہیں ہے کہ وہ واقعات میں ربط و تسلسل پایا جاتا ہے جس کی تہ میں چند قوانین ہیں بلکہ بنا تخیل پر جادوی قوانین کا غلط تصوّر ہے ۔ مشابہ خیالات کا غلط ربط جادو بالمثل کا باعث ہے اور قُرب کے خیالات کا غلط ربط چھوت کا جادو پیدا کرتا ہے ۔ ربطِ خیالات کے اصول انسانی ذہن میں ترتیب و تنظیم پیدا کرتے ہیں اور ذہنی عمل کے لئے ضروری ہیں ۔ ان کا اطلاق منطق کی رُو سے کیا جائے تو سائنس جنم لیتی ہے یہ کہنا غلط ہے کہ سارا جادو ہی ایک بے ثمر اور بے مصرف کوشش ثابت

قدیم زمانے سے انسان ان قوانین کی ٹوہ میں رہا ہے جن سے وہ قدرتی مظاہر پر قابو پا سکتا، اور انہیں اپنے حسبِ منشا موڑ سکتا۔ اس کوشش میں اس نے کچھ صحیح نتائج اخذ کئے جن سے سائنس کی نشأۃ ہوئی جب کہ جادو غلط نتائج کا پروردہ ہے

مذہب میں پہلے فوق الطبع ہستیوں پر عقیدہ رکھا جاتا ہے جو کائنات پر متصرف ہیں اور پھر انہیں خوش کر کے اپنا کام نکالنے کی کوشش کی جاتی ہے گویا مذہب کی رُو سے نیچر کے قوانین میں رد و بدل کے امکانات موجود ہیں۔ دوسرے لفظوں میں نیچر کے قوانین کو فوق الطبع ہستیاں اپنی مرضی کے مطابق موڑ توڑ سکتی ہیں۔ نیچر کے قوانین میں تغیر پذیری یا رد و بدل کا امکان جادو اور سائنس دونوں کے اصول کے خلاف ہے کیوں کہ ان دونوں کی رُو سے نیچر کے اعمال اٹل ہیں اور انہیں منت سماجت سے اپنی راہ سے ہٹایا نہیں جا سکتا۔ جادوئی اور سائنٹیفک نقطۂ نظر اور مذہبی نقطۂ نظر کے اس اختلاف سے ایک سوال پیدا ہوتا ہے۔ کیا کائنات پر متصرف طاقتیں باشعور شخصیتیں ہیں یا بے شعور اور غیر شخصی قوتیں ہیں۔ مذہب اول الذکر پر عقیدہ رکھتا ہے اس لئے وہ ان فوق الطبع شخصیتوں کی دلجوئی پر ہمہ وقت کمربستہ رہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ کسی شخص یا ذی روح کو منت سماجت سے اپنا ارادہ بدلنے پر آمادہ کیا جا سکتا ہے۔ غیر ذی شعور کی دلجوئی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا نہ اٹل قوانین کو اس طرح بدلا جا سکتا ہے چنانچہ مذہبی رویہ جادوئی اور سائنٹیفک رویئے کے مخالف ہے۔ جادو اور سائنس دونوں کی رُو سے کائنات میں چند اٹل قوانین کار فرما ہیں جنہیں منت سماجت سے بدلا نہیں جا سکتا۔ یہ اصول جادو میں مخفی ہے سائنس میں ظاہر ہے۔ جادو بے شک غلطی کا نتیجہ ہے لیکن اسی نے سائنس کی ترقی کے لئے راہ ہموار کی تھی جب جادو کی غلطیوں کا ازالہ کیا گیا تو سائنس معرضِ وجود میں آئی۔ جادوگر غلطیوں کا ارتکاب نہ کرتے تو سائنس دانوں کے لئے حق و صداقت تک پہنچنا امرِ محال سے کم نہ تھا۔ جادوگر اور سائنس دونوں کو صداقت اور حقیقت کی جستجو تھی۔ سائنس دان خضر کی طرح منزلِ مقصود تک پہنچ گیا جب کہ جادوگر سکندر کی طرح راستے ہی میں بھٹک کر رہ گیا۔

ہمیں بھولنا نہ چاہئے کہ جادو ہی سے طب، ہیئت، کیمیا اور عملی سائنس نکلی تھی۔ مصرِ قدیم کی طب جس سے بعد میں والوں نے بہت کچھ فائدہ اٹھایا جادو ہی پر مبنی تھی۔ مثلاً مصری اطبا[1] کے خیال میں بادام کی شکل آنکھ کی سی ہے اس

---

[1] THE GOLDEN BOUGH

لئے بادام کھانا مقوی بصر ہے۔ انار جگر کے مشابہ ہے، اس لئے مقوی جگر ہے، سیب کی شکل دل کی ہے اس لئے سیب کا استعمال دل کی تقویت کا باعث ہوتا ہے۔ علم نجوم کسی زمانے میں جادو کے تصرف میں تھا۔ اس کا مرکزی خیال یہ تھا کہ اجرام سماوی انسان کے طالع پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ بابل کے پروہت، بلند میناروں پر چڑھ کر سیاروں کی گردش کا مشاہدہ کرتے رہتے تھے جن میں زہرہ اور مشتری سعد تھے اور زحل اور مریخ نحس سمجھے جاتے تھے کسی شخص کی پیدائش پر دیکھا جاتا تھا کہ کون سا سیارہ نومولود پر اثر انداز ہوگا۔ یہ قدیم واہمہ آج بھی باقی ہے۔ علم نجوم بالآخر ہیئت کی صورت میں سائنس بن گیا کیمیا کے خبط نے کیمسٹری کی بنیاد رکھی۔ کیمیا گروں کا خیال تھا کہ آفتاب کی شعاعوں سے سونا اور چاند کی کرنوں سے چاندی بنتی ہے۔ اس سے معمولی دھاتوں کو سونے میں بدلنے کی آرزو پیدا ہوئی جس نے ہزاروں ہوسوں کی زندگیاں تباہ کیں۔ سنگ پارس کی تلاش میں اچھے خاصے پڑھے لکھے باہوش افراد عمر بھر سرگرداں رہے لیکن انہی کیمیاگر جادوگروں کے تجربات سے بالآخر کیمسٹری کی عظیم سائنس وجود میں آئی۔ عملی سائنس جادوگروں کے شعبدوں سے یادگار ہے۔ اولی جادوگروں کے تجربات کے سبب مختلف قسم کی گیسیں بنانے پر قادر ہوا۔ مقنع نے چاہ نخشب سے چاند نکال لیا لیکن اس شعبدہ بازی کی تہ میں ٹھوس کیمیاوی اصول کارفرما تھے۔

جیسا کہ ہم مختصراً ذکر کر چکے ہیں تحلیل نفسی کی رو سے جادو کا ماخذ بچپن کے ابتدائی دور سے تعلق رکھتا ہے فرائڈ نے بالخصوص اور اس کے پیروؤں اور کارل ژنگ نے بالعموم ان تحقیقات سے فائدہ اٹھایا جو جے جی فریزر نے جادو کے بارے میں کی تھیں۔ ان کی روشنی میں فرائڈ کے پیروؤں نے کہا انسان کے بچپن کے دورِ شیر خوارگی میں خیال کی ہمہ گیر کارفرمائی[1] بڑی اہمیت رکھتی ہے اس مرحلے پر بچے کو عالم خارجی کا کوئی خاص تجربہ نہیں ہوتا۔ اسے اس بات کا یقین ہوتا ہے کہ اس کی خواہشات اور خیالات خارجی عالم پر اثر انداز ہوتے رہتے ہیں مثلاً اس کی بھوک فوری طور پر دودھ مہیا کر دیتی ہے بعض لوگ جو جسمانی طور پر بالغ ہونے کے باوجود ذہنی اور نفسیاتی پہلو سے نابالغ ہی رہتے ہیں یہ سمجھتے ہیں کہ مجرد خواہش خود اپنی تکمیل کی صورت اختیار کر لیتی ہے چنانچہ وہ عمل جد و جہد سے گریز کرتے ہیں۔ اسی طرح ایک جادوگر بھی جو ذہناً نابالغ ہوتا ہے خارج کے تقاضوں

---

[1] OMNIPOTENCE OF THOUGHT.

حقیقت پسندانہ مفاہمت نہیں کرتا بلکہ بیٹھے بٹھائے اپنی خواہشات کے زور پر خارج کو اپنے حق میں موڑنے کی کوشش کرتا ہوتا ہے۔[1]

جی فریزر کا ایک اور مشہور نظریہ یہ ہے کہ جادو مذہب سے پہلے صورت پذیر ہوا تھا۔ اس نے وحشیوں کے مشاہدے سے یہ نتیجہ اخذ کیا تھا۔ وہ لکھتا ہے۔

"آسٹریلیا کے دیسیوں میں جادو کا اثر آج بھی عام ہے۔ مذہب فوق الطبع ہستیوں کی تالیف قلب کے مفہوم میں اُن کے یہاں مفقود ہے چنانچہ آسٹریلیا میں جادوگر تو بہت ہیں پر پروہت ایک بھی دکھائی نہیں دیتا لوگ منتروں یا بشیت جادو کے دوسرے طریقوں سے اپنے قبیلے والوں یا فطرتی مظاہر کو مجبور کرنے کی کوشش تو کرتے ہیں لیکن دیوتاؤں کو دعا یا قربانی دے کر خوش کرنے کا خیال کسی کو نہیں آتا۔

اس قدیم ترین معاشرے میں جادو موجود ہے لیکن مذہب غائب ہے۔ اس سے ہم یہ نتیجہ اخذ کرنے میں حق بجانب ہوں گے کہ مہذب اقوام بھی معاشرے کے ارتقاء کی ابتداء میں اسی مرحلے سے گذری ہوں گی۔ انہوں نے پہلے پہل فطرتی مظاہر ہی کو مجبور کر کے اپنے کام نکالنے کی کاوش کی ہو گی۔ اور بعد میں ان کی تالیف قلب کا خیال انہیں آیا ہو گا۔ گویا جس طرح تمدن کے مادی پہلو میں پتھر کا زمانہ تھا۔ اسی طرح فکری پہلو سے جادو کا ابتدائی دور تھا۔ آج بھی جادو کا اثر و نفوذ دنیا بھر کی مہذب اقوام میں کسی نہ کسی صورت میں موجود ہے اور جادو کی رسمیں اقوام عالم میں ایک ہی صورت میں ملتی ہیں۔ یہ رسمیں بجنسہٖ یورپ میں اسی طرح باقی ہیں جس شکل میں ہند قدیم یا مصر قدیم میں پائی جاتی تھیں اور جیسے افریقہ اور آسٹریلیا کے قبائلیوں میں دکھائی دیتی ہیں۔ تہذیب و تمدن اور مذہب و عرفان کی اشاعت کے باوجود ذہن انسانی کی تہ میں جادو کا اثر باقی ہے۔"

ایک سوال یہ پیدا ہو گا کہ اگر جادو مذہب سے پہلے موجود تھا۔ تو انسان نے جادو کو ترک کر کے مذہب کو کیوں اپنایا۔ اس

---

[1] PSYCHOLOGY OF RELIGION,DR.DAVID FORSYTH

کا ایک سچا تو یہ ہے کہ انسان نے سائنس کی روشنی کے پھیل جانے کے باوصف ابھی تک جادو کو کلی طور پر نہیں چھوڑا اور جادو کے اثرات مذہب میں بھی باقی و برقرار ہے۔ دعاؤں اور ورد و وظائف کی تاثیر پر بعض لوگ آج بھی عقیدہ رکھتے ہیں اور انہیں اس بات کا یقین ہے کہ چند الفاظ کو بار بار پڑھنے سے حسب منشا نتائج حاصل کئے جاسکتے ہیں۔ بہرحال فریزر کا کہنا ہے کہ عقل و خرد کی نشوونما کے ساتھ انسان نے جادو کے طفلانہ پن کو بھانپ لیا۔ زیرک اور فہیدہ لوگ جان گئے کہ جادو کی رسوم سے خاطر خواہ نتائج برآمد نہیں ہوتے اسلئے انہوں نے جادو سے بہتر اور زیادہ موثر طریقے دریافت کرنے کی کوشش کی جس سے مذہب اور سائنس کی ضرورت کا احساس ہونے لگا جب جادو اور مذہب میں فرق نمایاں ہوا تو پہلے اہل مذہب نے دعا اور قربانی کو اپنایا اور جادو وہم پرست اور جاہل طبقے کے ساتھ مخصوص ہو گیا۔ بعد میں جب کائنات پر متصرف شخصی قوتوں کی جگہ فطری اور آفاقی قانون کا تصور ابھر کر سامنے آیا۔ جو سبب و مسبب کے جبر اور حقیقت پر مبنی تھا اور کسی کے شخصی ارادے اور خواہش سے آزاد تھا گویا سائنس کے لئے زمین ہموار ہو گئی۔ لیکن جیسا کہ ڈاکٹر ڈیوڈ فارستھ نے کہا ہے اس کے باوجود جادو باقی رہا آج بھی ہندوستان میں برہمن وشنو شیو یا برہما کو اپنے منتر پڑھنے کے زور سے اپنا کام کرانے پر مجبور کر دیتے ہیں ان کا مشہور مقولہ ہے "تمام کائنات دیوتاؤں کے قبضے میں ہے، دیوتا منتروں کے قبضے میں ہیں، منتر برہمنوں کے اختیار میں ہیں، لہٰذا برہمن ہی دیوتا ہیں" برہمن پروہتوں کی صورت میں آج بھی ہندوستان میں قدیم دور کے جادوگر زندہ ہیں" ڈاکٹر ڈیوڈ فارستھ کے الفاظ میں[1]

> جادو صرف وحشی قبائل تک محدود نہیں ہے بلکہ تمام سابقہ تہذیبوں میں نفوذ کر چکا ہے اور جدید تمدن بھی اس سے محفوظ نہیں ہے اس کا اظہار توہم پرستی اور خاص طور سے خوش قسمتی اور بدقسمتی کے عقیدے میں ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ بعض اعمال خوش نصیبی پر اور دوسرے بدنصیبی پر منتج ہوتے ہیں۔ وہم پرستوں کا عقیدہ ہے کہ آفات کو ٹالا جاسکتا ہے یا دوسرے لوگوں کو آفات کی زد میں لایا جاسکتا ہے۔ روزمرہ کی مثالوں میں تعویذ گنڈے اور ٹونے ٹوٹکے ہیں بلیوں کا نحس ہونا، ۱۳ کے ہندسے، نمک کے گر جانے

---

[1] PSYCHOLOGY OF RELIGION

تنے کا ٹوٹکا جادو وغیرہ ۔ دعاؤں اور بددعاؤں میں بھی جادو کارفرما ہے کیونکہ ان سے بھی کسی کی بھلائی یا ایذا رسانی مقصود ہوتی ہے ۔ جنتر کے تعویذوں میں بھی جادو کا اثر باقی ہے ۔

آسٹریلیا، جنوب مشرقی ایشیا، افریقہ اور شمالی امریکہ کے دیسی قبائلیوں میں جادو اپنی قدیم صورت میں موجود ہے ۔ اصل بات تو یہ ہے کہ ابھی قبائل کی زندگی کے مشابہ ہے سے علمائے علم انسان نے پتھر کے زمانوں کے انسان کے جادو کی رسوم پر قیاس آرائیاں کی ہیں ۔ قبائلیوں کے ذہن و قلب پہ نیک اور بد روحوں کا یہ تصور پوری طرح چھایا ہوا ہے جو ان کی مشکلات کو دور کرتی ہیں یا جن کی امداد سے وہ اپنے دشمنوں کا قلع قمع کر سکتے ہیں ۔ ان کے یہاں معالج، جادوگر، کاہن اور بارش برسانے والا بسا اوقات ایک ہی ذات میں جمع ہوتے ہیں ۔ ان کی حد درجے تعظیم و تکریم کی جاتی ہے اور بعض اوقات وہ اپنے قبیلے کے سردار بھی بن جاتے ہیں ۔ قبائلیوں کے عقیدے کے مطابق امراض یا موت طبعی واقعات نہیں ہوتے بلکہ دشمنوں کے جادو یا بدروحوں کے اثرات کا نتیجہ ہوتے ہیں چنانچہ کوئی شخص بیمار پڑ جائے تو اس کے علاج کے لئے جادوگر کو بلایا جاتا ہے جو مناسب منتر پڑھ کر یا عمل کر کے مریض کا علاج کرتا ہے ۔ یہ جادوگر کاہن بھی ہوتا ہے جس کے تصرف میں نیک اور بد روحیں ہوتی ہیں مرض طول پکڑ جائے تو وہ اپنے آپ پر وجد کی حالت طاری کر کے بدروح کو حاضر کر لیتا ہے اور اسے اپنے منتروں سے دھمکا کر مریض کو چھوڑنے پر مجبور کر لیتا ہے ۔ افریقہ کے وحشیوں میں یہ عام عقیدہ ہے کہ بعض جادوگر منتر کے زور سے شیر یا بھیڑیے کا روپ دھار لیتے ہیں[1] اور اپنے دشمنوں کا کام تمام کر دیتے ہیں ۔ جادوگرنیاں[2] ہوتی ہیں جو لوگوں کا خون پی کر انہیں ہلاک کر دیتی ہیں ترقی یافتہ معاشرے میں جادو کی بے شمار رسوم رہ گئی ہیں جن سے فصلیں بافراط اگتی ہیں اور برداشت زیادہ ہوتی ہے ۔ خشک سالی کی صورت میں جادوگروں سے مینہ برسانے کو کہا جاتا ہے ۔ ڈیلاگوا خلیج کے قبائلی جب بارش برسانا ہو تو اپنے اجداد کی قبروں پر پانی انڈیلتے ہیں ۔ بلٹا میں نیم برہنہ عورتیں دریا کے پاس آ پانی میں کھڑی ہو کر اس مقصد کے حصول کے لئے ایک دوسری پر پانی کے چھینٹے اچھالتی ہیں ۔

قبائل کالے جادو سے سخت خائف ہوتے ہیں ۔ کالے جادوگر کی طاقت کا راز نفسیاتی اثر اندازی[3] میں ہے ۔ جادوگر جس شخص

---

[1] اصطلاح میں انہیں WEREWOLVES کہتے ہیں

[2] VAMPIERS

[3] SUGGESTION

کو ہلاک کرنا چاہتا ہے اُسے صاف صاف بتا دیتا ہے کہ اس پر جادو کر دیا گیا ہے۔ وہ آدمی گزشتہ دہشت سے نڈھال ہو جاتا ہے اور چند ہی روز میں گُھل گُھل کر موت کے گھاٹ اتر جاتا ہے۔ افریقہ میں موت کے اس پیغام کو اوانگا کہتے ہیں جس شخص پر اوانگا ڈال دیا جائے یعنی یہ پیغام بھیج دیا جائے کہ تم پر موت کا جادو ڈال دیا گیا ہے تو وہ چند ہی روز میں مر جاتا ہے اسی طرح جس شخص کو بتلا دیا جائے کہ جادوگر اس کا کپڑے کا پتلا بنا کر اس میں سوئیاں چبھو رہا ہے تو وہ اپنی جھونپڑی میں گھس کر لیٹ رہتا ہے اور چند دنوں میں دم توڑ دیتا ہے۔

قبائلی لہو کو حیات کی علامت سمجھتے ہیں اس لئے اُن کے ہاں رواج یہ ہے کہ فصل بونے سے پہلے کھیت میں کسی شخص کو ذبح کیا جاتا ہے تاکہ اس کا لہو زمین میں جذب ہو کر اسے توانائی بخشے اور اس کی پیداوار میں اضافہ کرے۔ ہندوستان کے گونڈ قبیلے میں اس مقصد کے لئے ایک جوان لڑکی کی قربانی دی جاتی تھی۔ قبائلی کسی بانجھ عورت کو کھیتی کے قریب پھٹکنے نہیں دیتے مبادا اس کی زرخیزی سلب ہو جائے۔ ایکواڈور کے لال ہندی کھیت میں ہل چلانے سے پہلے کسی ایسے مرد یا عورت کی قربانی کرتے ہیں جسے خاص اس مقصد کے لئے پالا جاتا ہے۔ ہندوستان میں کالی دیوی کی خوفناک مُورتی کے سامنے انسان قربان کئے جاتے تھے تاکہ کاروبار تجارت یا کھیتی باڑی میں برکت ہو۔ آج کل کلکتہ (کالی کتا) کے مندر میں کالی دیوی کو بکریوں کی بھینٹ دی جاتی ہے جن کا بہتا ہوا لہو بانجھ عورتیں حصولِ اولاد کے لئے چاٹتی ہیں۔ یاد رہے کہ جادو کی اکثر رسوم میں کسی نہ کسی کا خون بالضرور بہایا جاتا ہے یہ خون شیرخوار بچے کا بھی ہو سکتا ہے، کالی بلی کا بھی اور مقدس بکرے اور سفید مرغے کا بھی۔ جادوگروں اور جادوگرنیوں کے خیال میں شیطان کو خوش کرنے کے لئے خون بہانا ضروری ہے۔ برصغیر ہند و پاک کے شہروں اور دیہات میں جادو کی رسوم باقی ہیں ان رسوم نے سینکڑوں توہمات کو جنم دیا ہے جن کا مشاہدہ ہر روز نظرِ بد وغیرہ میں کیا جا سکتا ہے۔ کسی کا شیرخوار بچہ بیمار پڑ جائے یا اس کی بھینس پورا دودھ نہ دے تو عورتیں سیدھی پروہتوں اور پیرزادوں کے پاس جاتی ہیں اور انہیں کچھ بھینٹ یا شیرینی دے کر تعویذ دھاگا کراتی ہیں۔ میں ایک پیرزادے کو جانتا ہوں جو عرس سے پہلے ایک صندوق تعویذوں کا بھر کے رکھ لیتا ہے۔ کسی کی جورو سرکش ہو، ساس لڑاکا ہو، بچہ بیماری سے سوکھتا جا رہا ہو، دودھ بلونے پر مکھن نہ نکلتا ہو، خاوند جابر ہو، انکھیاں آتی ہوں، گائے بچھڑے نہ دیتی

وی کے اُکسانے پر ماں باپ سے لڑتا ہو، خاوند کسی دوسری عورت پر فریفتہ ہو جائے، بیوی بدکار ہو، ایام میں خلل پڑ جائے
سنہ ہو، تپ سنہ اتنا ہو یا جلاب لگ رہے ہوں، تل کی فصل میں بھٹے چھدرے لگتے ہوں یا گندم کو گل پڑ گئی ہو، بھینس کو منہ کھر کی شکایت
احب سب کو دعا، امرت دھارا، تعویذ صندوق سے نکال نکال کر دیتے جاتے ہیں اور ہر ایک سے دس، دس روپے بٹور لیتے
وں مریدوں کے ذہن میں یہ عقیدہ راسخ کر دیا گیا ہے کہ پیروں کو نذر نیاز اور شیرینی دینے سے آدمی ہر قسم کی آفات ارضی و
حفوظ رہتا ہے۔ اور پیر و مرشد ہر مشکل میں ان کے آڑے آتے ہیں۔ بعض بگڑے تگڑے پیرزادے جن نکالنے کے بہانے خوش شکل نوجوا
غلا لیتے ہیں اور کبھی کبھار انہیں بھگا کر بھی لے جاتے ہیں۔ ایسے کئی جرائم پولیس کی گرفت میں آتے رہتے ہیں۔ عورتوں کے ذہن
ڈال دی گئی ہے کہ پیرزادوں کے ساتھ خلوت میں جانے سے اُن پر دوزخ کی آگ حرام ہو جاتی ہے۔ میں ایک مکار پیر
ں جو ایک جوان اور خوبصورت عورت پر فریفتہ ہو گیا لیکن وہ پلّے پر ہاتھ دھرنے نہیں دیتی تھی۔ ایک دن پیر صاحب نے
یا کہ تو ہماری بات نہیں مانے گی تو ہم سوتے میں تجھے شیر بن کر دبا لیں گے۔ وہ عورت سخت اثر پذیر اور خوفزدہ ہوئی۔ رات
تو خواب میں کیا دیکھتی ہے کہ ایک شیر نے اسے دبوچ لیا ہے۔ وہ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھی اور خوف سے تھر تھر کانپنے
یسا ہی ہوا۔ اس عورت نے زچ ہو کر پیر صاحب کی خواہش پوری کی اور اپنی جان چھڑائی۔ پیر صاحب نے ظاہراً
وں کا اثر پذیری کا حربہ کامیابی سے برتا تھا۔

پہاڑی علاقے جادو کا گڑھ مانے جاتے ہیں جہاں آج بھی بڑی بڑی رقمیں دے کر جادوگروں سے دشمنوں کو ہلاک کیا
ی مرادیں پوری کی جاتی ہیں۔ پولیس کے کاغذوں میں ایسے جرائم کی روداد محفوظ ہے جب کسی جادوگر نے دم کر کے
کھلا دی اور وہ ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر گیا۔ جادوگر نے اسے اپنے جادو کا کرشمہ قرار دیا تھا۔ یہاں میں اپنے نوجوانی کے
آنکھوں دیکھا واقعہ بیان کروں گا۔ میری ایک دور کی رشتہ دار عورت کے تین سوتیلے بیٹے تھے جو قدرۃً اُسے ایک
تے تھے۔ اس کی راہ و رسم آزاد کشمیر کی چند راجپوت عورتوں سے تھی جو جادو کی رسوم میں مہارت رکھتی تھیں۔ ماں کے
سے اس خاتون نے کہیں سے ایک کھوپڑی اور کچھ ہڈیاں حاصل کیں۔ وہ چھپ چھپ کر اس کھوپڑی کو ہڈیوں سے

بجاتی اور اپنے سوتیلے بیٹوں کو منتر پھونکنے کے منتر گنگنایا کرتی تھی۔ ایک دن اس کے سب سے چھوٹے سوتیلے بیٹے نے جس کی عمر دو برس رہی ہوگی نظر بچا کر اسے کھوپڑی بجاتے اور منتر پڑھتے دیکھ لیا۔ اس منتر میں خود اس کا اور اس کے بھائیوں کا نام لیا جا رہا تھا۔ وہ دہشت سے تھر تھر کانپتا ہوا دیوان خانے میں آیا جہاں میں اس کے بڑے بھائیوں کے ساتھ جن سے میری دوستی تھی بیٹھا ہوا تھا۔ بچے نے گھگھیاتے ہوئے لہجے میں جو کچھ دیکھا اور سنا تھا ہمیں بتایا اور بستر پر بے دم ہو کر گر پڑا۔ اس کی باتیں سن کر بڑے بھائیوں کے چہروں کا رنگ فق ہو گیا اور انہوں نے بے بسی کے عالم میں میری طرف دیکھا۔ مجھے ان کے چہروں پر اڑتی ہوئی ہوائیاں آج بھی یاد ہیں۔ میں خوش قسمتی سے نوخیزی کے دور ہی میں ہر قسم کے توہمات کی قید سے آزاد ہو چکا تھا۔ میں نے ان کی تشفی کی اور مسکرا کر کہا کہ یہ سب تمہارے وہم کے کرشمے ہیں۔ تم اس کی مطلق پروا نہ کرو۔ یہ عورت تمہارا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتی۔ تم حوصلہ کرو اور اسے کھوپڑی بجانے دو۔ وہ کبھی بھی تمہارا بال بیکا نہیں کر سکے گی۔ جتنی زیادہ کھوپڑی بجائے گی اتنی ہی تمہاری صحت اچھی ہوگی۔ مجھے مسکراتے دیکھ کر اور میری باتیں سن کر ان کے زرد چہروں پر لالی دوڑ گئی اور وہ سنبھل کر باتیں کرنے لگے۔ آخر وہی کچھ ہوا جو میں نے کہا تھا۔ ان کی سوتیلی ماں کھوپڑی بجاتی رہی اور ان کی جوانی پر نکھار آتا گیا۔ تینوں کے تینوں بڑے کڑیل اور تنومند گبھرو بن گئے۔ آج بھی جب کبھی یہ واقعہ یاد آتا ہے ہم سب خوب کھلکھلا کر ہنستے ہیں۔

ہمارے ہاں خشک سالی میں بارش برسانے کے ٹوٹکے قدیم زمانے سے موجود ہیں۔ اگرچہ مینہ برسانے والے جادوگر غائب ہو چکے ہیں۔ ساون میں بارشیں نہ ہوں تو کسان سخت گھبرا جاتے ہیں کیوں کہ ان کی ساونی کی فصل تباہ ہو جاتی ہے اور باڑی کی بوائی بھی نہیں ہو سکتی۔ ان ایام میں ان کی نگاہیں آسمان کی طرف لگی رہتی ہیں اور وہ اٹھتے بیٹھتے خشک سالی کا رونا روتے رہتے ہیں اور مینہ برسانے کے ٹوٹکوں سے رجوع لاتے ہیں۔ عام طور سے کسی پیرزادے سے پیالہ گروایا جاتا ہے۔ یا کسی ایسے جوان کو نہلایا جاتا ہے جو پاکباز ہو اور ان کے الفاظ میں "قُرت" کا سچا ہو۔ کہتے ہیں کہ اس طرح بادل کو برسنے کی ترغیب ہوتی ہے کبھی کبھار بچیاں اپنا گڈا اور گڈی لے کر گلی میں نکل آتی ہیں۔ انہیں زمین پر رکھ کر آگ لگا دی جاتی ہے اور جب دھواں اٹھتا ہے تو اس کے گرد حلقہ باندھ کر پیٹنے لگتی ہیں۔ اس کے ساتھ آواز ملا کر گاتی جاتی ہیں۔

گُڈی گُڈا اُسے ڈِٹّھا ۔ وَس میاں کالیا
گُڈی گُڈا پِٹّیا ۔ وَس میاں چِٹّیا

کالیاں اِٹّاں کالے روڑ
مینہ وسا زورو زور

اس طرح دھونس اور پچکار کر کالے اور سفید دونوں بادلوں کو برسنے کے لیے پکارا جاتا ہے ۔ مینہ برسانے کا ایک ٹوٹکا بہت دلچسپ ہے اور جہاں تک مجھے علم ہے پنجاب کے دیہات کے علاوہ کہیں بھی نہیں پایا جاتا ۔ پنجاب میں اس کا رواج قدیم زمانے سے چلا آرہا ہے ۔ جب مینہ برسانے کے سارے حیلے اور ٹوٹکے ناکام ہو جائیں ، بادل گھر گھر کر آتے رہیں اور ایک بوند بھی نہ برسے تو کنواری جوان لڑکیاں آخری ٹونا کرنے کے لیے سر جوڑ کر بیٹھ جاتی ہیں ۔ اس ٹونے کو سخت راز میں رکھا جاتا ہے ۔ وہ ایک بڑا مٹکا یا گھڑا لے کر اسے غلاظت سے بھر لیتی ہیں اور پھر اس میں پانی انڈیل کر ٹھیک دوپہر کے وقت جب عام طور سے لوگ گھروں میں گھسے بیٹھے ہوتے ہیں دبے پاؤں چھتوں پر سے ہوتی ہوئی کسی لڑاکا بڑھیا کے مکان کی منڈیر پر جاتی ہیں اور دھم سے وہ گھڑا اس کے صحن میں پھینک کر پھوڑ دیتی ہیں اور پھر بھاگ کر چھپ جاتی ہیں ۔ بڑھیا اپنے صحن میں بکھری ہوئی غلاظت کو دیکھ کر طیش سے بل کھاتی اور پھنکارتی ہوئی لپک کر اپنی چھت پر چڑھ جاتی ہے اور محلے والیوں کے نام لے لے کر اور چیخ چیخ کر گالیاں بکتی ہے ۔ وہ پنجی کر کے اپنے دوپٹے کا سنگلا باندھ لیتی ہے اور وہ فحش بکتی ہے کہ شیطان بھی سن کر بھاگ جاتا ہو گا ۔ اس کی چیخیں اور گالیاں بادل تک پہنچ جاتی ہیں اور وہ گھبرا کر برسنا شروع ہو جاتا ہے ۔ اسے ڈڈوں بھننا کہتے ہیں ۔ ایک بار راقم الحروف نے دیکھا ایک بڑھیا دوپہر سے شام تک فحش بکتی رہی اور چیخ چیخ کر محلے والوں کا ناک میں دم کر دیا اور شام کو بادل جو پہلے گھرا کھڑا تھا اس زور سے موسلا دھار برسا کہ وہ بھاگ کر نیچے چلی گئی ۔ عام خیال یہ ہے کہ بادل اس بڑھیا کی گالیوں کی تاب نہیں لاسکتا ۔ میں نے ڈڈوں بھننے والی لڑکیوں کے چہروں پر فتح مندی کی مسکراہٹیں بھی دیکھیں جو آج تک مجھے یاد ہیں ۔ ظاہر ہے کہ یہ محض ایک اتفاق تھا ۔ اس سے پہلے کئی ٹونے ناکام ہو چکے تھے اس کے باوجود جب مینہ کی بوچھاڑ پڑی

لینے لگے کہ یہ اسی بڑھیا کی گالیوں کا اثر ہے۔ یہ ایک نفسیاتی تجربہ ہے کہ لوگ حُسنِ اتفاق کو کلیہ بنا لیتے ہیں۔ مثلاً ایک پیرزادہ دس کو اولادِ نرینہ کا تعویذ دیتا ہے تو نو کے یہاں بیٹا پیدا نہیں ہوتا لیکن دسویں کے گھر بیٹا پیدا ہو تو لوگ ناکامیوں کو بھلا یں اور کامیابی کو کرامت قرار دیتے ہیں۔ عوام کی یہی سادہ لوحی جاہل پیرزادوں کے لئے سونے کی کان بن گئی ہے۔

ہاں پیرزادے قدیم جادوگروں سے یادگار ہیں۔ ان کا کاروبار زیادہ تر حُب کے تعویذوں سے چلتا ہے۔ حُب کے خاص ہوتے ہیں اور خطیر رقم کے عوض کسی نہایت عزیز مُرید کو دیئے جاتے ہیں جیسے یونانی اطبا کے پاس ایک صندوقچہ ہوتا ہے جس میں بقول ان کے راجاؤں اور نوابوں کے لئے مقوی و مُبہی دوائیں رکھی جاتی ہیں۔ ہر مرد کے لئے کے دل کو جیتنا جواں مردی کا سب سے بڑا ثبوت سمجھا جاتا ہے۔ عام حالات میں یہ کوئی مشکل بات نہیں ہوتی۔ نوجوان لڑکے ں بتقاضائے فطرت ایک دوسرے کی کشش محسوس کرتے ہی رہتے ہیں اس لئے کسی پیرزادے کے حُب کے تعویذ یا جھاڑ کی ضرورت نہیں پڑتی۔ جب کوئی نوجوان کسی کنواری لڑکی سے سچا پیار کرتا ہے اور احسن طریقے سے اس کا اظہار دیتا ہے تو قدرتاً وہ لڑکی بھی اس کی جانب مائل ہو جاتی ہے کیونکہ جوان لڑکیوں میں چاہے جانے کی فطری خواہش موجود ہے۔ وہ اس بات سے خوش ہوتی ہے کہ اس نے بھی کسی کا دل موہ لیا ہے اور اسے بھی کسی نے اپنے من میں بسا لیا ہے۔ اگر ہنے والے کے خلوص و جذبہ پر یقین آ جائے تو وہ بھی پیار کا جواب پیار سے دیتی ہے لیکن بعض اوقات یوں بھی ہوتا ہے کہ ان کی شکل و صورت کا اچھا نہیں ہوتا اور اس کی شہرت بھی خراب ہوتی ہے کسی لڑکی کے پیچھے پیچھے جا کر پڑ جاتا ہے پسند نہیں کرتی اور کسی طرح بھی اس کی ہمت افزائی نہیں کرتی تو کسی کُٹنی کو لڑکی کے پیچھے لگا دیا جاتا ہے جس سے لڑکی کو شبہ یہ سچا پیار نہیں بلکہ محض ہوسناکی کا چکر ہے وہ اپنی بدنامی کے خوف سے چُپ کر جاتی ہے یا اپنی خفگی کا اظہار کرتی ہے ان عاشق ہر طرف سے مایوس ہو کر کسی پیرزادے کے آستانۂ عالیہ پر حاضری دیتا ہے اور پھر اس سے خاصا مال اینٹھ کر مزید تجربہ خاص قسم کے محبت کا تعویذ دیا جاتا ہے۔ تعویذ کو زیادہ موثر بنانے کے لئے کہا جاتا ہے کہ لڑکی کے سر کے بال قمیص ہے۔ ان بالوں کی راکھ میں کچھ اور اجزاء ملا کر پیار کا سُرمہ (پریم انجن) تیار کیا جاتا ہے۔ نوجوان سے کہا جاتا ہے کہ

وہ جادو کے اس سُرمے کی سلائی آنکھوں میں لگا کر اپنی محبوبہ کے سامنے جائے ۔ وہ اسے دیکھتے ہی ہزار جان سے اس پر فدا جائے گی ۔ اگر لڑکی کچھ زیادہ ہی سخت جان ثابت ہو تو خانہ زاد گنڈوں سے کام نکالا جاتا ہے جن کے اجزا میں اُلّو کے ناخن، کا پاؤں، ہُدہُد کا پنجہ، خرگوش کی دُم کے بال، چڑیے کی زبان، نیل کنٹھ کا پر وغیرہ شامل ہوتے ہیں ۔ بچارا نوجوان عاشق لڑکی کو خاک میں ملانے کے چکروں میں پیرزادہ صاحب کی بھاری فرمائشیں پوری کر کے کنگال ہو جاتا ہے ۔ آخر پیر صاحب اپنی ناکامی کو کچھ اس انداز میں پیش کرتے ہیں ۔ مگر شاید ہُد ہُد جس کا پنجہ ملایا گیا وہ نر نہیں تھا یا اُلّو کا ناخن بائیں پیر کا تھا وغیرہ ۔ اسی طرح سانپ کے ڈسنے، پیٹ درد، گھر سے چوہے بھگانے، بھینس کے دودھ کی افزائش، اولادِ نرینہ کے لئے مختلف تعویذ ہوتے ہیں ۔

جعفر شریف کی مشہور و معروف کتاب "قانونِ اسلام" سے چند تعویذ بطورِ نمونہ پیش کریں گے ۔

حُبّ کا تعویذ

۲	۶	۵	۳	۳
۱۲	۸	۱	۹۳	۱
۱۳	۴	۱۱	۱۳	۱۱
۸	۷	۲۱	۱۸	۹

اولادِ نرینہ کا تعویذ

۱۰	۱۳	۱	۰
۵	۴	۱۲	۱
۱۳	۹	۲	
۳	۶	۱۲	۱

پیٹ درد کا تعویذ

۲۶	۳۱	۲۴
۲۵	۲۷	۲۸
۳۰	۲۳	۲۲

گھر سے چوہے بھگانے کا تعویذ

۵	۴	۳	۸
۵	۱۴	۵	۱
۵	۱۷	۲	۱۰

نپ
کے
نے کا
یذ

۸	۹	۷
۴	۶	۲
۵	۱	۳

گائے کے دودھ
کی افزائش کے لئے
تعویذ

۲ ۱/۴	۴	۳
۲ ۱/۴	۴	۳
۲ ۱/۴	۴	۳

بہ سے پیٹ کے درد کا قطعی علاج ہو سکتا ہے۔ کھل بنولے کھلانے سے بھینس کے دودھ میں افزائش ممکن ہے۔ گھر سے چوہے گولیوں سے ختم کیے جا سکتے ہیں لیکن اولادِ نرینہ اور محبوبہ کے تسخیرِ قلب کے لئے پیرزادگان کے پاس جائے بغیر چارہ نہیں۔ چنانچہ یہی یذ ان کے لئے کثیر آمدنی کا باعث ہوتے ہیں۔ سانپ کے ڈسنے کا علاج خاص خاص پیرزادے کرتے ہیں جو ان کے ست سمجھے جاتے ہیں اور دنیا بھر کے سانپ ان کے مطیع ہوتے ہیں۔ اگر کسی مرید کو سانپ ڈس لے تو علاج کے لئے یہی کچھ ہے کہ مار گزیدہ کسی درخت سے لپٹ کر بآوازِ بلند اپنے پیر صاحب کو پکارے۔ ان کا نام لیتے ہی زہر کا اثر زائل ہو جائے گا کوئی مار گزیدہ پیر صاحب کی جھاڑ پھونک کے باوجود مر جائے تو یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ قضا کے سامنے کسی کی کیا مجال ہے۔ اس عقیدت سے سر جھکا لیتے ہیں۔ جب کوئی کم زہریلے سانپ کا ڈسا ہوا بچ نکلتا ہے تو پیر صاحب کی کرامات کے چرچے زور شور سے جاتے ہیں۔ ہمارے دیہات میں مویشی کو وبائی امراض سے بچانے کے سپیشلسٹ پیرزادے بھی موجود ہیں۔ ساون بھادوں میں ، مُنہ کھر کی مہلک وبا کے پھیلنے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ ہمارے گاؤں کے مواشی ایک میدان میں جمع کرلئے جاتے ہیں اور احب ان کے گرد چکر لگا کر اجتماعی جھاڑ پھونک کرتے ہیں اور دیہاتیوں سے گندم کی کئی بوریاں اینٹھ کر لے جاتے ہیں۔

ہ عالم میں کئی ایسے جادوگروں کے نام اور کام مشہور ہیں جو شاہانِ وقت سے وابستہ ہو کر امورِ سلطنت میں بھی دخل دیتے رہے ر جادوگر نوستراداموس فرانس کی ملکہ میری ڈی میچی کو مشورے دیا کرتا تھا۔ ایک دن اس نے پیش گوئی کی کہ بادشاہ کا ایک عزیز ہنری تخت پر بیٹھے گا۔ ملکہ میری اس شہزادے سے بہت جلتی تھی اگرچہ وہ اس کا داماد تھا۔ اس نے نوستراداموس سے کہا کہ ہ شہزادہ ہنری کو ہلاک کرنے میں اس کی مدد کرے۔ وہ انعام و اکرام سے اسے مالا مال کر دے گی۔ نوستراداموس کہتا رہا کہ

ستارے شہزادے ہنری کے حق میں ہیں لیکن وہ نہ مانی۔ آخر جادوگر نے ملکہ کو شکار کی ایک کتاب دی اور کہا اس کے اوراق زہر آلود ہیں اسے شہزادے کے کمرے میں رکھوا دیں۔ وہ اس کی ورق گردانی کرے گا تو ہلاک ہو جائے گا۔ ملکہ نے ایسا ہی کیا۔ شومئی اتفاق سے اس کا اپنا بیٹا شارل شاہ فرانس شہزادے کے کمرے میں چلا گیا اور لب لگا کر کتاب کے ورق الٹنے لگا۔ وہ زہر سے ہلاک ہو گیا اور ہنری بچ نکلا۔ ملکہ انتونیت کا جو انقلاب فرانس میں قتل کی گئی درباری جادوگر کاگلی آسترو تھا ملکہ اس پر بڑا اعتماد کرتی تھی۔ اور وہ اس کا ہمراز بن گیا تھا۔ ہمارے زمانے میں جارج گرڈ جیف مشہور جادوگر ہو گزرا ہے۔ اس نے یورپ اور امریکہ میں انتیس درس گاہیں قائم کیں جن میں جادو کی تعلیم دی جاتی تھی۔ پاٹر برنارڈ اور ہوڈینی نے سحر و نیرنگ میں عالمگیر شہرت حاصل کی اور برسوں تک حیرت انگیز کرشمے دکھاتے رہے۔ منہ سے مسلسل شعلے اگلنا، لڑکی کو صندوق میں ڈال کر صندوق کو آرے سے چیر دینا، لڑکی کو ہوا میں معلق کر دینا، ہاتھ پاؤں باندھ کر مقفل صندوق میں بند کر دینا اور پھر اس کا پلک جھپکنے میں باہر آجانا، ٹوپی میں سے کبوتر یا خرگوش برآمد کرنا، اپنی چابی اگلی صف میں بیٹھے ہوئے کسی شخص کے حوالے کر دینا اور پھر اسے پیچھے بیٹھے ہوئے کسی تماشائی کی جیب سے برآمد کر لینا ہوڈینی کے یادگار کرشمے سمجھے گئے ہیں۔ ہوڈینی عام جادوگروں کی طرح کسی فوق الطبع روحانی طاقت کا مدعی نہیں تھا اور کہا کرتا تھا کہ میں شعبدہ باز ہوں اور اپنے کرشموں سے کام لیتا ہوں۔ گرڈ جیف جہاں کہیں جاتا اپنے ساتھ پری چہرہ نیم برہنہ لڑکیوں کا طائفہ رکھتا تھا جنہیں دیکھنے کے لئے نوجوان اس کی قیام گاہ پر ٹوٹ پڑتے تھے۔ ترکی کے ایک درویش نے یہ کرشمہ بارہا دکھایا کہ اسے سب کے سامنے ہاتھ پاؤں جکڑ کر کئی دنوں کے لئے دفن کر دیا گیا اور وہ صحیح سلامت صندوق سے باہر نکل آیا۔ الیسٹر کراؤلے ہمارے دور کا ایک اور مشہور جادوگر ہو گزرا ہے جس کے ساتھ ہمیشہ ایک نیم برہنہ حسین عورت رہتی تھی جسے وہ بابلیوں کی حسن و عشق کی دیوی کے نام پر عشتار کہا کرتا تھا۔ وہ اس کے تماشوں میں کام کرتی تھی۔ سوویٹ روس کے مشہور جادوگر امیل کیو نے دنیا بھر کے ممالک کا دورہ کیا اور تماشائیوں کو اپنے غیر معمولی کرشموں سے حیرت زدہ کر دیا۔ اس کا شمار جدید دور کے عظیم ترین جادوگروں میں ہوتا ہے۔ اس نے ۱۹۶۲ء میں وفات پائی جس کے بعد اس کے دو لڑکے تماشا دکھاتے رہے۔ امیل کیو جادو کے روحانیاتی اور فوق الطبع پہلوؤں کا منکر تھا۔ اس کے شعبدے ہاتھ کی صفائی اور نفسیاتی اثر اندازی

کے مرہونِ منت تھے جس سے وہ تماشائیوں میں بصری و سمعی واہمے[1] پیدا کر دیا کرتا تھا۔ آج کل اضلاعِ متحدہ امریکہ میں افریقہ کے جادو ووڈو[2] کا بڑا چرچا ہے جس کی رسوم میں مرغے کو ذبح کر کے جادو کے کرشمے دکھائے جاتے ہیں۔ شیطان کے پجاریوں کا ذکر ہم کر چکے ہیں یہ امریکہ اور یورپی ممالک میں کہیں کہیں پائے جاتے ہیں۔ ان کے اعمال میں کسی فوق الطبع روحانی طاقت کا کوئی کھوج نہیں ملتا البتہ انھوں نے اپنی جنسی کجرویوں اور خفیہ کارستانیوں پر جادو کا پردہ ڈال رکھا ہے۔ ہمارے زمانے میں جادو صرف کرشمہ سازی اور شعبدہ بازی تک محدود ہے۔ البتہ ہندوستان، پاکستان، ملائشیا، انڈونیشیا، سیلان، آسٹریلیا، افریقہ، شمالی امریکہ اور جزائر شرق الہند کے دیسیوں میں اس کی قدیم رسوم و روایات باقی و برقرار ہیں۔ سیانے، جادوگر، پروہت، سنیاسی، جوگی، پیرزادے اور فقیر فوق الطبع روحانی قوت کے نام پر ان پڑھ سادہ لوح عوام کو غچے دے کر اپنے دنیوی اغراض کی پرورش کر رہے ہیں۔ عوام کی جہالت ان کے لئے سونے کی کان بن گئی ہے۔

---

[1] VISUAL AND AUDITORY HALLUCINATIONS

[2] VOODOO

دیو مالا

ایڈورڈ برنس کہتا ہے۔

"ہر دیو مالائی حکایت کسی نہ کسی دیوتا کی روداد ہے اور دیو مالا[1] انسان کی ان کوششوں کی سرگزشت ہے جو اس نے قدیم زمانے میں کائنات سے تعلق پیدا کرنے کے لئے کی تھیں۔"[2]

دیو مالائی قصے، لوک بات[3] اور لوک کہانی[4] میں فرق ہے۔ لوک بات ہر قسم کی روایات پر مشتمل ہے جن سے پرانے زمانوں کی رسوم و رواج کا کھوج ملتا ہے۔ لوک کہانیاں ان قدیم داستانوں کی باقیات ہیں جن میں بعض اوقات دیو مالائی قصے بھی شامل ہو گئے ہیں کئی روائتی کہانیاں اور داستانیں ایسی بھی ہیں جو نیم تاریخی و نیم افسانوی واقعات پر مبنی ہیں جن میں بسا اوقات دیو مالائی قصے بھی شامل کر لئے گئے تھے۔ دیو مالا کو تقابلی مذہب[5] سے جداگانہ سمجھا جاتا ہے اگرچہ بعض اوقات ان دونوں کے قصوں اور روایات میں توارد بھی ہو جاتا ہے۔ تقابلی دیو مالا[6] میں اقوام عالم کے دیو مالائی قصوں کا موازنہ کیا جاتا ہے۔

صدیوں سے اول تک دیو مالا کو مذہب کے ضمن میں کیا جاتا تھا اور اسے مذہب کی ابتدائی صورت سمجھا جاتا تھا لیکن جدید تحقیق کی رو سے دیو مالا کو بھی ایک مستقل شعبہ علم مان لیا گیا ہے جس پر مذہب کی طرح دوسرے علوم کی گہری چھاپ موجود ہے۔ سب سے پہلے یونانیوں نے دیو مالا کا لسانیاتی تجزیہ کیا۔ ان کے نزدیک دیو مالائی خیالات زبان کی بیماری کی شکل ہے کیونکہ زبان کے معنی بدلتے رہتے [illegible] مختلف زبان سے ترجمہ ضروری ہے

---

[1] یونانی زبان میں MYTHOS کا معنی ہے قصہ۔ لفظ MYTHOLOGY اسی سے مشتق ہے۔ اس کا مطلب ہوا دیوتاؤں کے متعلق قصوں کا علم۔

[2] AN INTRODUCTION TO MYTHOLOGY

[3] FOLKLORE

[4] FOLK STORY

[5] COMPARATIVE RELIGION

[6] COMPARATIVE MYTHOLOGY

اینڈریو لینگ[1] نے دیو مالا کا مطالعہ اصول ارتقاء کے تحت کیا اور لسانیاتی نظریے کو رد کرتے ہوئے کہا کہ دیو مالا کی کوئی عقلیاتی توجیہ ممکن نہیں ہو سکتی۔ اس کے خیال میں اقوام عالم میں ایک ہی ذہنیت کے دیو مالائی قصوں کی موجودگی سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ ابتدائے تہذیب و تمدن سے بنی نوع انسان کے سوچنے اور غور کرنے کے انداز کہیں ایک ہی جیسے رہے ہیں۔

کن ہارٹ نے عقلی رسوم ورواجات کے حوالے سے قدیم بت پرستوں کی روایات کا کھوج لگانے کی کوشش کی۔

یہی وہ بنیاد ہے جس پر بعد میں جے جی فریزر اور ای بی ٹائلر نے اپنے نظریات کی رفیع الشان عمارتیں اٹھائیں۔ ای بی ٹائلر اور رابرٹسن سمتھ[2] دیو مالا کے علم الانسانی نظریے کے مشہور شارحین ہیں۔ ای بی ٹائلر کو اس نظریے کا عظیم بانی تسلیم کر لیا گیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ قدیم پتھر کے زمانوں کے انسان نے پہلے پہل اپنی نیند، خوابوں، سانس اور موت کے مشاہدے سے روح یا بھوت کے تصور تک رسائی حاصل کی جس کے بعد اس نے ساری کائنات کو روحوں سے بسا دیا پھر ان روحوں کے سردار متعین کیے جو دیو مالا کے دیوتا اور مذہب کے خدا بن گئے۔ علم الانسان کے دیو مالائی مکتب کے اصول درج ذیل ہیں۔

۱۔ مہذب اقوام کے دیو مالائی قصے زمانہ ما قبل تاریخ کے انسان کی فطری و تخیلاتی باقیات ہیں۔
مہذب اقوام کے دیو مالائی قصوں اور وحشی قبائل کی لوک کہانیوں کا تقابلی موازنہ دیو مالا کے آغاز و ارتقاء پر روشنی ڈالتا ہے۔

۲۔ دیو مالائی قصوں کے مطالعے سے انسان کی فطری وحدت کا ثبوت ملتا ہے۔ یہی وجہ ہے اس نوع کے اکثر و بیشتر قصے کم و بیش ایک ہی شکل و صورت میں اقوام عالم میں پائے جاتے ہیں۔

تحقیق علوم کی ترقی کے ساتھ ارباب نظر دیو مالائی قصوں کو شک و شبہ کی نظروں سے دیکھنے لگے۔ دیو مالا کا پہلا نقاد شہر کولوفون کا ایک فلسفی زینوفینیس (۵۴۰ ۔ ۵۰۰ ق م) تھا جس نے اس بات سے انکار کیا کہ دیوتا انسانی شکل و صورت کے دیوتا کائنات پر متصرف ہیں۔ ایک اور اہل علم تھیجینیس نے کہا کہ دیو مالائی قصوں کی ترجمانی تمثیلی اور مجازی رنگ میں کرنا ضروری ہے۔ مثلاً اپالو کی حیثیت جمالیاتی احساس کی صورت کا ایک خوبصورت نوجوان نہیں ہے

---

[1] MYTH, RITUAL AND RELIGION. [2] THE GOLDEN BOUGH

بدقسمتی اس کا علامتی مظہر ہے۔ مائی لیٹس کے ایک شہری ہیکاٹیس (۴۷۶ - ۵۵۰ ق م) نے سب سے پہلے دیومالائی قصوں اور تاریخی واقعات کے مابین حدِ امتیاز قائم کی۔ پلوٹارک نے ایک قدم اور آگے بڑھایا اور کہا کہ دیومالائی قصوں میں جن دیوتاؤں کا ذکر کیا گیا ہے۔ وہ اصل میں ہمارے جیسے جیتے جاگتے انسان تھے جن کے کارناموں پر فوق الطبیع کا رنگ چڑھا کر انہیں دیوتا بنا دیا گیا۔ جدید دور میں جس شخص نے دیومالا کی ترجمانی فطری اصول پر کی۔ وہ ڈی بروسس (۱۷۰۹ - ۱۷۷۶ء) تھا۔ اس نے کہا کہ مصرِ قدیم میں جانوروں کی پوجا اسی انداز میں کی جاتی تھی جس طریقے سے آج کل کے وحشی قبائل طوطم مت کے حوالے سے کرتے ہیں۔ کے اوطر (۱۷۹۷ - ۱۸۴۰ء) کے ساتھ دیومالا کے سائنٹفک مطالعے کا آغاز ہوا۔ اس نے کہا کہ دیومالا کے ماخذ قدیم زمانے کی تاریخ اور لوک بات کے مطالعے سے سامنے آجاتے ہیں۔ اور یہ پتہ لگایا جا سکتا ہے کہ دیومالائی قصے کہیں تاریخی واقعات کی بدلی ہوئی صورتیں تو نہیں ہیں جنہیں افسانوں کی شکل میں پیش کیا گیا ہے اس نے کہا کہ شاعروں نے اپنے تخیل کی جولانی دکھانے کے لئے بہت سے تاریخی واقعات کو حسب منشا بدل کر ان پر دیومالا کا پردہ ڈال دیا ہے جیسا کہ مثلاً ہومر۔ فردوسی، نظامی گنجوی، ویاس اور وید کی نظموں سے مفہوم ہوتا ہے۔

قدیم پتھر کے زمانے کے انسان نے جب اپنے آپ پر قیاس کر کے مظاہرِ فطرت سے روح اور حیات منسوب کی تو قدرتاً انہیں اپنے ہی جیسے جذبات، تخیلات، ارمان، امیدیں، آرزوئیں، خواہشیں اور دلچسپیاں بھی سونپ دیں۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اقوامِ عالم کے دیوتا ہماری ہی طرح سوچتے ہیں اور ہماری ہی طرح محسوس کرتے ہیں۔ پیار کرتے ہیں۔ جوشِ غضب سے بھڑک اٹھتے ہیں۔ ایک دوسرے سے حسد کرتے ہیں۔ روتے ہیں۔ ہنستے ہیں۔ لطف و کرم سے پیش آتے ہیں۔ انتقام لینے پر تل جاتے ہیں۔ بگڑ بیٹھتے ہیں۔ من جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ذہنی اختلافات کے باوجود دنیا بھر کی قوموں کی دیومالائی کہانیوں میں معنوی اشتراک پایا جاتا ہے۔ اس بات کی صراحت ہم آئندہ کریں گے۔

تہذیب و تمدن کے آغاز کے بارے میں مورخین میں اختلاف ہے۔ ۱۹ ویں صدی کے اواخر تک علماء

لہ MYTHOLOGY. EDITH HAMILTON.

کا خیال تھا کہ تمدن کی بنیاد مصر میں پڑی تھی لیکن جدید تحقیق کی رُو سے عراق تہذیب و تمدن کا گہوارۂ اولین تھا۔ بہر صورت مصر کے تمدن نے کریٹ، یونان اور کنعان کو متاثر کیا۔ اور عراق یا سُمیریا کا تمدن بابل، اشور، ایران اور وسط ایشیا کی دوسری اقوام میں پھیل گیا۔ عُلمائے یورپ نے اس تاریخی حقیقت سے صرفِ نظر کیا ہے۔ کہ چین، ہڑپا اور میکسیکو کے تمدن بھی مصر اور سُمیریا کے تمدنوں کے معاصر تھے اور اپنی مستقل روایات بھی رکھتے تھے۔ چین کی روایات جاپان، منگولیا، تبت، سیام برما وغیرہ میں اشاعت پذیر ہوئیں اور ہڑپائی تمدن نے ہندوستان کے آریائی تمدن کو روح کی گہرائیوں تک متاثر کیا۔ ان کے علاوہ میکسیکو اور پیرو کی مستقل مذہبی اور دیومالائی روایات تھیں جن سے بہت کم اعتنا کیا گیا ہے۔

سُمیریوں کے بارے میں حتماً کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کس نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ بہر حال وہ سامی الاصل نہیں تھے اور زمانہ ماقبل تاریخ سے عراق میں آباد ہو گئے تھے۔ ان کا تمدن عروج پر تھا جب صحرائے عرب سے سامیوں کے قبائل جوق در جوق خوراک کی تلاش میں ہجرت کر کے عراق کی طرف بڑھے اور سُمیریا کی شہری ریاستوں کے شمال میں آباد ہو گئے۔ ان سامیوں کو اکادی بھی کہا جاتا ہے۔ بعد کی صدیوں میں سُمیریوں اور اکادیوں کے اختلاط سے جو نسل چلی اسے تاریخ میں بابلی اور اشوری کہا جاتا ہے۔ سامیوں نے سُمیریوں کی تہذیبی و تمدنی روایات اور دیومالائی عقیدوں کو اپنا لیا اور مرورِ زمانہ کے ساتھ ان میں گراں قدر اضافے کیے۔ سُمیریوں کی متعدد شہری ریاستیں تھیں جن کے اپنے اپنے سرپرست دیویاں اور دیوتا تھے۔ دیوتاؤں کا تعلق عموماً ان اور اُن کے مظاہر سے تھا۔ اور دیویاں دھرتی ماتا کی مختلف شکلیں تھیں۔ شہر اریدو کا دیوتا ایا یا آ، یا جاہ کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ اُسے خالقِ کائنات مانتے تھے۔ لارسا اور سپار کی شہری ریاستوں کا سورج دیوتا ببّر تھا جو بعد میں بابلیوں کا شماش یا شمش بن گیا۔ نرگل شہر کُتھاہ کا سورج دیوتا تھا۔ فضا اور برق و رعد کا دیوتا ادد تھا جو زمانے کے گذرنے کے ساتھ جنگ و جدال کا دیوتا بن گیا۔ چاند دیوتا کو ننار کہتے تھے جسے بعد میں سِن کا نام دیا گیا جس سے کوہِ سینائی کا نام یادگار ہے۔ اس کا لقب تھا سینگوں والا سانڈ اور برج دار سانڈ اس کا مقدس نشان تھا۔ ان لِل فضا کا دیوتا تھا جسے بابلیوں نے مردوک بعل کا نام دے کر اپنا سورج دیوتا بنا لیا۔ آنو آسمان کا دیوتا تھا جو سُمیریوں کا خداوندِ خدا سمجھا جاتا تھا۔ انتو اس کی زوجہ تھی۔ سامی آنو کو قطب تارے کا دیوتا بھی مانتے تھے

بابا پانی کا دیوتا تھا جس کی زوجہ دمکینہ تھی۔ تخلیق و تکوین کے بارے میں متعدد روایات تھیں۔ ان میں ایک یہ تھی کہ آبی دیوتا انکی نے ننِ کلا سے اختلاط کیا جس سے دیوتا پیدا ہوئے تھے۔ دوسری روایات میں ایا اور دمکینہ کے بیٹے بیل نے بنی نوع انسان کو خلق کیا تھا۔ دھرتی ماتا کو بھی مانتے تھے۔ اسے مختلف شہری بستیوں میں ننِ خورساگا، انانا، ننِ ماہ، ننتو اور ارورو کے ناموں سے پکارا جاتا تھا۔ حُسن و عشق کی دیوی ننا کو مخلوقات کی ماں کہتے تھے۔ رکاش، ایرخ اور ارد کے شہروں میں دھرتی ماتا کی پُوجا بڑے ذوق و شوق سے کی جاتی تھی۔ دیوتا انو کی بیٹی بابلیوں کی حسن و عشق کی دیوی اور دھرتی ماتا بن گئی جسے عشتار کا نام دیا گیا۔ ابتدا میں اسے آنا، ماما یا مامی بھی کہتے تھے اور اُسے بنی نوع انسان کی ماں بھی کہا جاتا تھا۔ لات زمین دوز عالم کی اور منات تقدیر کی دیوی تھی۔ یہ دیویاں بعد میں سامیوں کی دیومالا میں شامل کر لی گئیں۔ لیلو دیوی بدروحوں کی سرپرست تھی جو یہودیوں کی مذہبی روایات کے مطابق آدم کی پہلی زوجہ للت بن گئی۔ تیامت اتھاہ اندھیاروں کی خوفناک دیوی تھی جس کا تصور ایک عظیم الجثہ مادہ اژدھا کی صورت میں کیا جاتا تھا۔ اس کے شوہر کا نام آپسو تھا۔ کہتے تھے کہ آپسو اور تیامت نے آسمان اور زمین کو بنایا۔ پہلا دیوتا لحمو اور دیوی لحمو ان کی اولاد سے تھے۔ ان کے علاوہ دیوتا انشر، آنو، کشر اور ایا ان کے بیٹے تھے۔ سمیری دیومالا میں تیامت کا قصہ یوں ہے کہ اس مادہ اژدھا نے جو کائنات کی بے کراں تاریکی کی علامت تھی اپنے بیٹوں کو نگل جانا چاہا تو سورج دیوتا مردوک ان کی امداد کو پہنچ گیا۔ اس نے ہواؤں کو حکم دیا کہ وہ تیامت کے پیٹ میں گھس جائیں۔ اس سے تیامت اپنی جگہ کھڑی کی کھڑی رہ گئی اور مردوک نے اسے قتل کر دیا۔ اس کے دو ٹکڑے کیے ایک سے آسمان بنایا اور دوسرے کی زمین بنائی۔ اس دیومالائی قصے کی تہ میں سورج کی عظمت کی گئی ہے کہ وہ نہ ہوتا تو کائنات پر ہمیشہ اتھاہ اندھیارا چھایا رہتا۔

سمیری دیومالائی روایات خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ زرخیزی اور ثمر آوری کا دیوتا دموزی اور حسن و عشق کی دیوی اور دھرتی ماتا انانا ایک دوسرے سے پیار کرتے تھے۔ بعد میں یہی قصہ کلدانیوں کی دیومالا اور بابلیوں کے مذہب میں عشتار دیوی اور تموز کے معاشقے کی صورت میں نمودار ہوا۔ بابلی روایت میں تموز کی جگہ بعل مردوک کو دے دی گئی جسے بدروحوں نے قتل کر دیا۔ نتیجتاً زمین پر ہر طرف تاریکی چھا گئی۔ دھرتی کی زرخیزی اڑ گئی تو ماتا زیریں عالم کی طرف چلی

ملال اور افسردگی کے آثار پیدا ہو گئے۔ آخر انانا یا عشتار نے اسے زیریں دور عالم سے ڈھونڈ نکالا اور اسے دوبارہ زندگی بخشی۔ جس سے دھرتی کی بہاریں لوٹ آئیں چاروں طرف خوشی کی لہریں بکھر گئیں، ہری بھری فصلیں لہلہانے لگیں، نر و مادہ کی طرف ملتفت ہوئے اور حسن و عشق کا بازار پھر سے گرم ہو گیا۔ دوسرا قصہ گل گامش کا ہے۔ جو دو ہزار سال قبل مسیح میں لکھا گیا تھا۔ گل گامش دیوی ننسن کا بیٹا اور شہر ارک کا پروہت تھا۔ اس نے عزم کیا کہ وہ موت اور فنا پر قابو پائے گا اور شجرِ حیات کو ڈھونڈ نکالے گا۔ اس نے دور دراز کے ممالک کے سفر کیے۔ صبر آزما گھڑیاں جھیلنے کے بعد شجرِ حیات کو پانے میں کامیاب ہو گیا۔ بدقسمتی سے وہ ندی میں نہا رہا تھا کہ ایک سانپ شجرِ حیات کو لے بھاگا اور گل گامش کی ساری محنت رائیگاں گئی۔ اس علامتی کہانی میں انسان کی اس دیرینہ آرزو کی ترجمانی کی گئی ہے کہ وہ کسی نہ کسی طرح موت اور فنا پر قابو پا لے۔ اپنے سفروں کے دوران میں گل گامش کی ملاقات اتناپشتم سے ہوئی جس نے اُسے عالمگیر سیلاب کا قصہ سنایا تھا۔ گل گامش کی مہمات بعد میں رستم، اسفندیار اور ہرکولیز کے ہفت خواں کی صورت میں ہمارے سامنے آتی ہیں۔ اس کی شجرِ حیات کی تلاش ہمارے ہاں کی آبِ حیات کی تلاش کی یاد دلاتی ہے جس کی دریافت پر سکندر اور خضر روانہ ہوئے تھے۔

بابلیوں اور اشوریوں کو جزری سامی نسل کہا جاتا ہے جنہوں نے بابل، نینوا اور اشور کے شہر بسائے تھے۔ بابل کا عظیم شہر دریائے فرات کے کناروں پر آباد تھا۔ شاہ حمورابی (۲۰۸۱ — ۲۱۲۳ ق م) نے اسے اپنے دور کا سب سے شاندار شہر بنا دیا۔ اشوریوں نے نینوا کا شہر بسایا تھا۔ روایت یہ ہے کہ اس شہر کو شاہ نینس اور ملکہ سیمی رامس نے بسایا تھا جو بعد میں حسن و عشق کی دیوی بن گئی۔ اور اس کے معاشقوں کی داستانیں اشوری دیومالا میں شامل کر لی گئیں۔ اس کے نام کا معنی فاختہ ہے جو قدیم زمانے سے یونی کی علامت بنی رہی ہے۔ نینوا کا شہر ۶۱۲ ق م میں تباہ کر دیا گیا۔ بابل (باب ایل یعنی ایل خداوند خدا کا دروازہ) دو ہزار برسوں تک متمدن دنیا کی تجارت اور علم و فضل کا مرکز بنا رہا۔ یونانی مورخ ہیروڈوٹس نے اس کے چشم دید حالات لکھے ہیں۔ ایساگیلا کے خداوند خدا بعل (ایل کا جانشین) کا عظیم معبد تھا جس کے کھنڈر کو منارہ بابل کہتے رہے ہیں۔ اس معبد کی بالائی منزل پر بعل کا مینارہ نما مندر تھا جس کی دیواریں ڈھائی سو فٹ بلند تھیں اور جس کے باہر سونے کے پتروں اور نیلگوں روغنی اینٹوں سے

سے کاشی گری کی گئی تھی اس کی چمک دمک میلوں تک دکھائی دیتی تھی۔ اس معبد کی بلندی دو سو اٹھاسی فٹ تھی۔ بیل کا بت کئی من خالص سونے سے ڈھالا گیا تھا۔ بت کے قدموں میں مقدس اژدھا کا مجسمہ رکھا تھا۔ اسکے بالائی حجرے میں سونے کی ایک میز رکھی گئی تھی۔ ایک منتخب حسینہ وہاں قیام کرتی تھی۔ پروہت کہتے تھے کہ یہ دوشیزہ بیل کا دل بہلانے کے لئے وقف تھی۔ معبد کے دروازوں میں پردار بیلوں کے مجسمے رکھے تھے جن کا چہرہ انسانی تھا۔ دوسرا مشہور مندر حسن و عشق کی دیوی عشتار کا تھا جس کا انتظام ایک بیاہ پروہتانی کرتی تھی جو حسن و شباب کا پیکر ہوا کرتی تھی اور کسی اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔ اس کے تحت سینکڑوں دیو داسیاں رنگ برنگ کے ریشمی سر پردے ڈالے مندر کے صحن میں رقص کرتی تھیں اور یاتریوں اور پجاریوں کی تفریح طبع کا سامان بہم پہنچاتی تھیں۔ بیل کی طرح عشتار حسن و عشق کے ساتھ زرخیزی اور نشوونما کی دیوی بھی تھی۔ اسکے مندر میں جنسی ملاپ کی عام آزادی تھی۔ بابلیوں کا عقیدہ تھا کہ دیوی کے مندر میں آزادانہ جنسی ملاپ کیا جائے تو زمین کی پیداوار بڑھتی ہے۔ خدا خوش ہوتا ہے۔ فصلیں خوب پکتی ہیں اور ان کی برداشت اچھی ہوتی ہے۔ ایک عجیب رسم یہ تھی کہ شہر بابل کی ہر عورت کو اپنی عمر میں کم از کم ایک بار عشتار کے مندر میں جا کر معمولی معاوضہ لے کر اپنے آپ کو کسی یاتری کے سپرد کرنا پڑتا تھا۔ ہیروڈوٹس لکھتا ہے[1]

> "بابلیوں کی ایک رسم بڑی شرمناک ہے۔ ہر بابلی عورت کو زندگی میں ایک مرتبہ زہرہ و عشتار کے مندر میں جا کر کسی یاتری کے ساتھ خلوت میں جانا پڑتا ہے۔ امراء کی عورتیں ڈولیوں میں بیٹھ کر آتی ہیں جن کے گرد پردے لپٹے ہوتے ہیں اور مندر میں بیٹھ جاتی ہیں جہاں ہر وقت یاتریوں کا تانتا لگا رہتا ہے اور آمد و رفت کی کثرت ہوتی ہے۔ عورتوں کے درمیان رسیاں کھینچ کر نشان دہی کر دی جاتی ہے۔ یاتری وہاں جا کر اپنی پسند کی عورت چن کر اسے حجرے میں لے جاتے ہیں۔ جو عورت ایک بار مندر میں داخل ہو جائے وہ واپس نہیں جا سکتی جب تک کوئی اجنبی چاندی کا سکہ اس کی طرف نہ پھینکے اور اسے خلوت میں نہ لے جائے۔ جب وہ سکہ پھینکتا ہے تو کہتا ہے دیوی تجھے برکت دے۔ یہ سکہ خواہ کتنی ہی کم قیمت کا ہو اس عورت کو قبول کرنا پڑتا ہے کہ اسے لینے سے انکار کرنا جرم ہے۔ جب یہ سکہ پھینک دیا جائے

---

[1] HISTORY, HERODOTUS

تو یہ مقدس بن جاتا ہے۔ پہلا آدمی جو سکہ پھینک دے عورت اس کے ساتھ خلوت میں چلی جاتی ہے اور کبھی انکار نہیں کرتی۔ اس طرح دیوی مطمئن ہو جاتی ہے۔ اور وہ عورت فارغ ہو کر سیدھی اپنے گھر کا راستہ لیتی ہے۔ اس کے بعد کسی قیمت پر بھی اس سے مباشرت کیا نہیں جا سکتا۔ کشیدہ قامت اور خوبصورت عورتیں جلد فارغ ہو جاتی ہیں جب کہ بدصورت عورتوں کو خاصی مدت تک انتظار میں بیٹھنا پڑتا ہے۔

عشتار کے مندر میں مقدس عصمت فروشی کے ساتھ امرد پرستی بھی وابستہ تھی اور دیوی کے پجاری ہیجڑے ایرانی ذوق کی پرورش کا سامان کرتے تھے۔ مندروں میں عصمت فروشی کی یہ مذہبی روایت بابلیوں سے ماخوذ تھی جن میں خداوند خدا آنو کی بیٹی حیات و ثمر آوری کی دیوی تھی۔ اس کے معبد میں دیوداسیاں مقدس عصمت فروشی کا دھندا کرتی تھیں۔ بعد میں عشتار کی پوجا کنعان، قرطاجنہ، اسرائیل اور یونان میں عشترتی، عشتورت اور عشتارت کے نام سے ہونے لگی۔ کنعانیوں نے پافوس کے مقام پر اس کا شاندار مندر تعمیر کرایا تھا۔ شادی سے پہلے ہر جوان لڑکی کو اس مندر میں جا کر کسی نہ کسی یاتری سے معمولی معاوضہ لے کر اپنی دوشیزگی دیوی پر بھینٹ کرنی پڑتی تھی۔ اسے مذہبی فریضہ سمجھا جاتا تھا۔ بعلبک (بعل کا شہر) میں کنواریاں عشتارت کے مندر میں اپنی بکارت کا چڑھاوا چڑھاتی تھیں۔ لیڈیا میں روسا کی منتخب خوبرو لڑکیاں اناہتا (عشتار کی ایرانی مثیل) کے مندر میں دیوداسیاں بنا کر رکھی جاتی تھیں۔ دوسری لڑکیوں کو بھی اپنی عصمت کی بھینٹ دینے پر ہی شادی کرنے کی اجازت دی جاتی تھی۔ قرطاجنہ اور بلوس میں اسی طریقے سے عشترتی کی پوجا کرنے کا رواج تھا۔ اس کے معبدوں میں لنگ کی وضع کے منارے تعمیر کیے جاتے تھے۔

زمانے کے گزرنے کے ساتھ بعل کے ساتھ مردوک کی پوجا بھی وابستہ ہو گئی۔ مردوک سورج دیوتا تھا جسے بابلی تقدیر کا مالک بھی کہا کرتے تھے۔ وہ سمیریوں کے انلل کی جگہ خداوند خدا بنا دیا گیا تھا۔ بعل مردوک کے بت کا چہرہ انسانی تھا اور جسم پردار بیل کا تھا۔ بعد میں ہر شہر کے دیوتا کو اس کا بعل کہنے لگے (لغوی معنی آقا: مالک، عربی میں شوہر کو بھی بعل کہنے لگے) مثلاً شہر صور کا بعل ملکرت دیوتا تھا جس کی زوجہ عشیرا تھی۔ عہد نامہ قدیم میں ان مقدس لنگ کی قطع کے کھمبوں کو بھی عشیرا کہا گیا ہے جو معرق

وہاں کے شوہر کی علامتیں تھے اور جنہیں معبدوں اور مقدس درختوں کے جھنڈ کے قریب نصب کر کے نذر کی رسوم ادا کی جاتی تھیں۔

بابلیوں اور اشوریوں کو صابئین بھی کہا جاتا تھا۔ بقول سید سلیمان ندوی[۱] عبرانی میں صبا کے معنی ہیں ستاروں کا مجموعہ عربی میں صبا کا معنی ہے ستاروں کا نکلنا۔ قاضی بیضاوی نے صابئی کا اشتقاق اسی لفظ سے کیا ہے۔ ابن حزم صابئیت کو دنیا کا قدیم ترین مذہب مانتا ہے۔ اپنی کتاب الملل و النحل میں لکھتا ہے[۲]

"صابئی ۔ ۔ ۔ کواکب سبعہ کی تعظیم کرتے ہیں۔ بارہ بروج کے قائل ہیں۔ اپنے بت خانوں میں ان کی تصاویر بناتے ہیں۔ قربانیاں چڑھاتے ہیں۔

عود کی دھونی دیتے ہیں۔ رات دن میں ان کی بھی پانچ نمازیں ہیں جو مسلمانوں کی نمازوں سے ملتی جلتی ہیں رمضان کے روزے بھی رکھتے ہیں۔ اپنی نمازیں کعبے اور بیت الحرام کی طرف رخ کرتے ہیں۔ مکے اور کعبے کی تعظیم کرتے ہیں۔ مردار، گوشت خوک کو حرام سمجھتے ہیں۔ ان رشتے دار عورتوں کو بھی حرام سمجھتے ہیں جو مسلمانوں کے نزدیک حرام ہیں۔"

صابئین سبعہ سیارہ (سات ستاروں) اور بارہ برجوں کی نسبت سے ۷ اور ۱۲ کے عددوں کو مقدس سمجھتے تھے۔ یہ تقدس دوسری اقوام میں بھی پایا گیا۔ ہفتے کے سات دن، سبعہ کے سات امام، سرگم کے سات سُر، سات رنگ، سات جزیرے، اسرائیل کے بارہ قبائل، اثنا عشریہ کے بارہ امام وغیرہ میں یہ روایت موجود ہے۔ ان کے بارہ برجوں کے نام آج بھی علم نجوم میں باقی ہیں۔ یہ ہیں، عقرب، میزان، سنبلہ، اسد، سرطان، جوزا، ثور، حمل، حوت، دلو، جدی، قوس۔ دبستان مذاہب کے حوالے سے مولوی محمد حسین آزاد نے سات سیاروں کی صورتیں لکھی ہیں جن کی مورتیاں صابئین بنا کر پرستش اپنے معبدوں میں رکھتے تھے[۳]

زحل: بصورت سنگ سیاہ کی، بندر کا سر، آدمی کا بدن، سؤر کی دُم۔

---

[۱] ارض القرآن جلد دوم

[۳] سخندان فارس، مولوی محمد حسین آزاد [illegible]

مُشتری: خاکی رنگ۔ گدھے کا سر، اس پر تاج۔ تاج پر مرغ کا سر اور اژدھا۔

مریخ: صورت مثل مریخ کی۔ داہنے ہاتھ میں تلوار اور اس ہاتھ کو لٹکائے ہوئے۔ بائیں ہاتھ میں لوہے کا کوڑا علم کئے ہوئے۔

عطارد: سُور کا سر، مچھلی کا دھڑ، داہنے ہاتھ میں قلم، بائیں ہاتھ میں دوات۔

چاند: ایک آدمی سفید گھوڑے پر سوار، داہنے ہاتھ میں یاقوت کا عصا، بائیں ہاتھ میں تُلسی کی ٹہنی۔

آفتاب: صورت سونے کی۔ ایک آدمی گھوڑے پر سوار دو رُخا چہرہ، دونوں سروں پر تاج سات سات کنگرے لعل و یاقوت سے مرصّع، اژدھے کی دُم۔ داہنے ہاتھ میں سونے کا عصا جواہرات کا مرصّع، ہار گلے میں۔

زُہرہ: آدمی کی صورت، سر پر سات گوشے کا تاج، دستِ راست میں ایک تیل کا شیشہ، بائیں ہاتھ میں کنگھی۔

یہاں آدمی کی صورت سے مراد عورت کی صورت ہے کیونکہ زہرہ یا معبودۂ نشاط نہایت حسین و جمیل عورت تھی۔

سبعۂ سیارہ کی مورتیاں دھات میں ڈھالی جاتی تھیں اور گول وضع کی ہوتی تھیں۔ ہر ایک کی شکل و صورت، لباس، رنگ روپ اور خواص جداگانہ تھے۔ یہ مورتیاں ساعتِ سعید میں اُن کے مخصوص معبدوں میں رکھی جاتی تھیں۔ ان میں آفتاب کو بادشاہوں کا سرپرست سمجھا جاتا تھا۔ اور اُسے نیّرِ اعظم کہا کرتے تھے۔ حکما، علما اور شُعراء کا خاص معبود عطارد تھا۔ [illegible] اہلِ کمال اور کاریگر بھی اسی کی پوجا کرتے تھے۔ زُہرہ کا مندر عورتوں کے لئے مخصوص تھا۔ ہر دیوتا کے لئے ایک خاص رنگ مقرر کیا گیا تھا اور اسی رنگ کے کپڑے پہن کر پجاری اُن کے مندروں میں جاتے تھے۔ اُن کی قربان گاہوں پر خوشبویات کی دھونی دی جاتی تھی۔ عورتیں اور مرد اُن سے مُرادیں مانگتے تھے اور مُراد پوری ہو جانے پر بیش قیمت چڑھاوے اُن پر چڑھاتے تھے۔ زُہرہ کے معبد میں عورتوں کا جمگھٹ رہتا تھا کیونکہ وہ مونث، کنواریوں اور عشق کی دیوی تھی اور کسبیوں کی سرپرست بھی تھی۔ ہر معبد کا اپنا پروہت تھا جو دیوتا یا دیوی کے خاص رنگ کے لباس پہن کر رسومِ عبادت ادا کرتا تھا۔ پروہت عوام اور دیوتاؤں کے درمیان وسیلے بنے ہوئے تھے اور دیوتاؤں کے نام پر ان سے نذرانے وصول کرتے تھے۔

---

[1] ابوالکلام [illegible]

ماقبل اسلام کے اکثر عرب صابئیت کے قائل تھے اسلام میں صابئین کو اہل کتاب میں شمار کیا گیا ہے۔ ان کے ایک فرقے یعنی موحدین کو ناجی مانا گیا ہے۔ جو صابی خدا اور قیامت پر ایمان رکھتے ہیں۔ اور نیک عمل کرتے ہیں انہیں بخشش کی بشارت دی گئی ہے۔ بعثت کے ابتدائی دور میں مشرکین مکہ مسلمانوں کو رکوع و سجود کرتے دیکھ کر انہیں صابئین کہا کرتے تھے۔ بعد میں انہیں مغتسلہ (نہانے والے) کا نام دیا گیا کیونکہ وہ دن میں کئی بار غسل کیا کرتے تھے حران کا شہر ان کا مرکز تھا جہاں کے صابی علماء کی شہرت تھی۔ دور عباسیہ میں جب بیت الحکمت قائم کیا گیا تو صابی علماء کو دارالترجمہ میں یونانی اور سریانی کی کتابیں عربی میں منتقل کرنے کی خدمات سونپی گئیں۔ بیت الحکمت کا مشہور عالم اور مترجم ثابت بن قرہ صابی تھا جس نے ریاضیات اور ہیئت کی متعدد کتابوں کا عربی میں ترجمہ کیا۔

صابئیت کے تہذیبی، تمدنی، مذہبی اور دیومالائی اثرات کا مطالعہ دوسری سامی النسل اقوام ماقبل اسلام کے عربوں، بنی اسرائیل اور کنعانیوں کی دیومالا اور مذہب میں کیا جا سکتا ہے۔ یاد رہے کہ یونان کے فلسفہ افلاطون اور ارسطو بھی بابلیوں کی طرح سات سیاروں کو ذی عقل و ذی شعور ہستیاں مانتے تھے۔ ہومر نے اپنی نظموں میں بیلیں یا ڈیمن سے تعبیر کیا ہے۔ عرب شروع سے سامی نسل کا گہوارہ رہا ہے۔ بابلی، آشوری، کنعانی اور بنی اسرائیل عرب ہی کی سرزمین سے نکلے تھے اور خوراک کی تلاش میں ہجرت کر کے عراق، شام، فلسطین اور کنعان تک جا پہنچے تھے۔ ان اقوام کے تمدن، مذہب اور فکر پر صابئیت کی گہری چھاپ موجود ہے۔ بابلیوں کا سب سے بڑا معبود ایل یا ال تھا جو اکادی اور عبرانی زبانوں میں خدا کے معنے آیا ہے۔ کنعان اور اسرائیل میں اسے کائنات کا خالق اور پروردگار مانا جاتا تھا۔ گاریت میں بھی ایل آسمان کا دیوتا تھا اور اس کی دوسری دیوی عشیرت اس کی زوجہ تھی۔ آرامی زبان میں ایل کا معنی ہے قوی۔ آرامی خداوند خدا کو ایل ایون کہتے تھے۔ اس کے دوسرے نام تھے ایلوئی، الی، ایل کی جمع عہد نامہ قدیم میں ایلوہیم آیا ہے جناب مسیح نے صلیب پر دم توڑتے ہوئے چلا کر اسے پکارا تھا: ایلی ایلی لما سبقتنی (اے میرے خدا تو نے کیوں میرا ساتھ چھوڑ دیا) ایل کنعان کا سب سے بڑا معبود تھا اس کا عرف علیان (بلند تر) تھا

تاریخ عرب۔ مؤ۔ فلپ حتی ترجمہ غلام رسول مہر

صور کے ساحلی شہر میں ایل شہر کا محافظ تھا۔ ایل کی زوجہ عاشرہ دیوی تھی۔ غرض کہ تمام سامی زبانوں میں ال یا ایل کا لفظ خدا کے لئے رائج رہا ہے۔ عہد نامہ قدیم میں معبد کو بیت ایل (خدا کا گھر) کہتے تھے۔ کتاب پیدائش میں لکھا ہے۔

”اور یعقوب صبح سویرے اٹھا اور اس پتھر کو جسے اپنا تکیہ کیا تھا لے کر ستون کھڑا کیا اور اس کے سر پر تیل ڈالا اور اس کا نام بیت ایل رکھا۔“

بابل کا نام بھی ایل سے یادگار ہے یعنی باب ایل (دروازۂ خداوند)۔ ماقبل اسلام کے عرب اسے الٰہ کہتے تھے اس دور کے قصائد میں اللہ کا ذکر تواتر سے ملتا ہے جو فی الاصل ال الٰہ (معبود) ہے۔ عرب اپنی تین دیویوں لات منات اور عزیٰ کو اللہ کی بیٹیاں کہا کرتے تھے اور ان کے نام پر اپنے بچوں کے نام رکھتے تھے مثلاً عبد مناۃ زید لات عبدالعزیٰ وغیرہ۔ وہ کعبے کا طواف کرتے ہوئے کہا کرتے تھے۔

”لات، عزیٰ کی قسم اور تیسرے ایک اور مناۃ کی قسم کیوں کہ یہ بلند کونجیں ہیں اور ان کی سفارش کی امید رکھی جا سکتی ہے۔“[1]

گرونے بام کی تحقیق کے مطابق مناۃ تقدیر کی دیوی تھی۔ لات آفتاب کی اور عزیٰ دیوی زہرہ کی مثیل تھی۔ لات اور مناۃ کے بت بابل سے عرب میں آئے تھے۔ بابلی مناۃ کو مناتو کہتے تھے۔ ہیروڈوٹس نے بھی اپنی تاریخ میں لات کا ذکر کیا ہے۔ اس کا اصل نام ال لاۃ یعنی دیوی تھا۔ یہ سامیوں کی اُمومت، زرخیزی اور افزائش کی دیوی تھی۔ طائف میں اسے اربہ (دیوی) کہتے تھے۔ یہی لقب عشتار دیوی کا بھی تھا۔ ای او جیمز کہتا ہے کہ صابئین کے یہاں ایل لات کا باپ تھا اور بعل کی مقبولیت سے پہلے زرخیزی کا سب سے بڑا دیوتا تھا۔ عرب لات کی پوجا ایک مربع شکل کی چٹان کی صورت میں کرتے تھے۔ ان کا سب سے بڑا بت عزیٰ کا تھا جس کے قریب ایک مذبح تھا۔ ذبیحہ کا خون ایک گڑھے میں گرتا تھا جسے غبغب کہتے تھے۔ ان کا عشق کا دیوتا وَدّ تھا جس کا بت دومۃ الجندل میں تھا۔ عرب سورج کی پوجا نہایت عقیدت سے کرتے تھے۔ محمود شکری آلوسی کہتا ہے۔

---

[1] بلوغ الارب — محمود شکری آلوسی ترجمہ [illegible]

[2] MEDIEVAL ISLAM

ان کا خیال تھا کہ یہ (سورج) ایک فرشتہ ہے جسے نفس اور عقل حاصل ہے اور یہ چاند اور ستاروں سے نور کا منبع ہے۔ ان کے خیال کے مطابق تمام سفلی موجودات اسی سے پیدا ہوتی ہیں اور یہ خود فلک کے فرشتے کے پاس رہتا ہے اس لئے یہ تعظیم، سجدہ اور دعا کا مستحق ہے۔ ان کے یہاں اس کی عبادت کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ انہوں نے اس کے لئے ایک بت بنا رکھا ہے جس کے ہاتھ میں آگ کے رنگ کا ایک گوہر ہے۔ اس کی ایک خاص عمارت ہے جسے انہوں نے اسی کے نام پر بنا رکھا ہے۔ اس گھر کے لئے محافظ نگران اور دربان مقرر ہیں۔ وہ یہاں آتے ہیں اور دن میں تین بار بت کے لئے نماز پڑھتے ہیں۔ مریض لوگ یہاں آکر اس بت کے نام کا روزہ رکھتے ہیں۔ عبادت کرتے ہیں۔ اس سے دعائیں مانگتے ہیں اور اس کو درمیان میں وسیلہ بناتے ہیں۔ جب سورج طلوع ہوتا ہے تو یہ سب اسکے سامنے سجدہ کرتے ہیں[1]۔ اسی طرح جب سورج غروب ہوتا ہے۔ اور جب وسط آسمان میں ہوتا ہے تو سجدہ کرتے ہیں" شمس کا لفظ اکادی سے آیا تھا جسے شمش یا شماش کہا کرتے تھے۔ بعض عرب قبائل میں سورج کو دیوی مانتے تھے اور کہتے تھے کہ یہ چاند دیوتا کی زوجہ ہے۔

صابیت یا ستارہ پرستی کی روایت ظاہر ہے بابلیوں ہی سے ماقبل اسلام کے عربوں کو ملی تھی۔ عرب زمانۂ حج میں کعبے کا طواف کرتے تھے جو حجرِ اسود کے لئے تعمیر کیا گیا تھا۔ ان کے یہاں کعبہ کا تقدس حجرِ اسود ہی کی وجہ سے تھا۔ قدیم زمانے میں طواف پوجا کی ایک اہم رسم سمجھا جاتا تھا۔ پجاری اور زائر برہنہ ہو کر بتوں یا معبدوں کے گرد چکر لگایا کرتے تھے سکندر کی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے ٹرائے میں اکیلیس کی قبر کا طواف کپڑے اتار کر ہی کیا تھا۔ ماقبل اسلام کے عرب بھی طواف کے وقت برہنہ ہو جاتے تھے اور ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر اور سیٹیاں بجا کر تالیاں بجاتے چکر لگاتے تھے۔ طواف کی یہ رسم سورج کے گرد سیاروں کی گردش سے لی گئی تھی۔ جیسا کہ صابئین سورج کے گرد چکر لگانے والے سیاروں کی تعداد سات مانتے تھے لہٰذا عرب کعبے کے گرد سات ہی چکر لگایا کرتے تھے۔ کعبے کو سورج مندر ہی مانا جاتا تھا یہاں تک کہ ایران کے ساسانی بادشاہ بھی اس پر قیمتی نذرانے اور چڑھاوے بھینٹ کیا

---

[1] [illegible] ادب ترجمہ پیر محمد حسن

کرتے تھے۔ مجوسی کہتے تھے کہ خانۂ کعبہ مہ گاہ (چاند کا معبد) کی بدلی ہوئی صورت ہے۔ شہرستانی کے خیال میں کعبہ کیوان یا زحل کا مندر تھا۔ ملا محسن فانی نے حجر اسود کو کیوان یا زحل کی مورتی کہا ہے۔[1] عرب اپنا طواف حجر اسود سے شروع کر کے اسی پر ختم کیا کرتے تھے۔ کعبہ کی طرح شام کا ایک شہر حمص بھی اپنے معبد کے لئے مشہور تھا جہاں سورج کی پوجا ایک سیاہ پتھر کی صورت میں کی جاتی تھی اس کے گرد طواف کیا جاتا تھا اور نذرانے بھینٹ کئے جاتے تھے۔ قیصر روم ہیلیوگابالس اس پتھر کو اٹھا کر روما لے گیا اور وہاں اس کی پوجا کو رواج دیا۔

ایک اور سامی قوم نبطیوں کے ہاں بھی سورج کی پوجا کی جاتی تھی۔ فلپ حتی لکھتا ہے۔

"نبطیوں کا شہر پیٹرا (الحجر)، ایک مستحکم سنگین قلعہ تھا۔ ان کا سب سے بڑا دیوتا ذوالشریٰ تھا جو ان کا سورج کا دیوتا تھا۔ اس کی پرستش پتھر کی ایک بلند لاٹ یا ان گھڑ چار گوشہ سیاہ پتھر کی شکل میں کی جاتی تھی ذوالشریٰ کے ساتھ لات کی پوجا بھی ہوتی تھی جو عربوں کے نزدیک بڑی دیوی تھی یہ دراصل چاند کی دیوی تھی۔ ان کے علاوہ جن نبطی دیوتاؤں اور دیویوں کا ذکر ہے ان میں مناۃ، عزیٰ اور ہبل کے نام بھی کتبوں میں آئے ہیں۔ نبطیوں میں بلند مقامات اور کھڑے پتھروں کی پوجا کا پرانا طریقہ رائج تھا۔"[2]

سامیوں کی طرح بنی اسرائیل بھی شروع میں پہاڑوں، چٹانوں، غاروں اور پتھروں کو پوجتے تھے۔ بعل کی پوجا انہیں بابلیوں سے ملی تھی جس کی پرستش وہ ایک مخروطی پتھر کی صورت میں کرتے تھے۔ سانپ کو دانش و حکمت کی علامت سمجھ کر اسے مقدس مانتے تھے۔ خدا کو وہ دوسرے سامیوں کی طرح ال، ایل یا الوہیم کہتے تھے جیسا کہ اسرائیل، جبرئیل، حزقی ایل وغیرہ کے ناموں سے ظاہر ہے۔ بعد میں وہ کنعانیوں کے ایک دیوتا یاہو کی جو گرج چمک، آگ اور آتش فشاں پہاڑوں کا دیوتا تھا، یہوہ کے نام سے عبادت کرنے لگے۔ عہد نامۂ قدیم میں خدا کو دونوں ناموں یعنی ایل یا الوہیم اور یہوہ سے پکارا گیا ہے۔[3] یہوہ کا معنی ہے "میں وہ ہوں جو ہوں" ڈاکٹر ہاگ نے لفظ یہوہ کو فارسی الاصل بتایا ہے اور کہا ہے کہ ایرانیوں کا خدائے خیر اہورا کا نام یہودیوں نے قید بابل کے دوران میں یہوہ کے نام سے اخذ کر لیا تھا۔ وہ کہتا ہے کہ اہورا اور

---

[1] دبستان مذاہب

[2] تاریخ شام ترجمہ غلام رسول مہر

[3] عہد نامۂ قدیم کے جن نسخوں میں خدا کو الوہیم کہا

یہواہ دونوں جس مادہ سے مشتق ہیں اس کا معنی ہے ہونا ۔ یہواہ گرج چمک، طوفان اور آگ کا دیوتا تھا جس کا ثبوت عہدنامہ قدیم سے جابجا ملتا ہے ۔

"—— خداوند کی راہ گردباد اور آندھی میں ہے ۔ بادل اس کے پاؤں کی گرد ہیں ۔

"—— جب تیسرا دن آیا تو صبح ہوتے ہی بادل گرجے اور بجلی چمکنے لگی اور پہاڑ پر کالی گھٹا چھا گئی اور قرنا کی آواز بہت بلند ہوئی اور سب لوگ ڈیروں میں کانپ گئے اور موسیٰ لوگوں کو خیمہ گاہ سے باہر لایا کہ خدا سے ملائے اور پہاڑ کے نیچے کھڑے ہوئے اور کوہ سینا اوپر سے نیچے دھوئیں سے بھر گیا کیونکہ خداوند شعلے میں ہو کر اس پر اترا اور دھواں تنور کے دھوئیں کی طرح اوپر کو اٹھ رہا تھا اور وہ سارا پہاڑ زور سے ہل رہا تھا ۔"

و خیمہ اجتماع میں ابر سے ہو کر نمودار ہوتا ہے ۔

"—— تب خیمہ اجتماع پر ابر چھا گیا اور مسکن خداوند کے جلال سے معمور ہو گیا ۔

—— اور خداوند ابر کے ستون میں ہو کر اترا اور خیمہ کے دروازے پر کھڑے ہو کر ہارون اور مریم کو بلایا ۔ (خروج

میں اپنی کمان کو بادل میں رکھتا ہوں ۔ وہ میرے اور زمین کے درمیان عہد کا نشان

ن اور ایسا ہوگا کہ جب میں زمین پر بادل لاؤں گا ۔ تو میری کمان بادل میں دکھائی دے گی ۔

ے کہ قبل اسلام کے عرب دھنک کو قوس قزح یعنی قزح دیوتا کی کمان کہا کرتے تھے ۔

وہ ایک تشبیہی معبود ہے[۲] عہدنامہ قدیم میں آیا ہے کہ اس نے ایک دفعہ جناب یعقوب سے کشتی لڑی تھی ۔ جب یہواہ نے کہ وہ جناب یعقوب کو چاروں شانے چت نہیں گرا سکا تو اس نے ان کا نام اسرائیل رکھ دیا یعنی جو خدا سے مغلوب نہ ہوا ۔

وں سے جناب یعقوب کی اولاد بنی اسرائیل کہلاتی ہے ۔

وہ جنگ کا دیوتا بھی مانا گیا ہے جو رب الافواج ہے اور جنگوں میں بنی اسرائیل کی مدد کرتا ہے ۔

ئے اسے ELOHISTIC کہتے ہیں اور جس میں یہواہ کہا گیا ہے اُسے JEHOVISTIC کا نام دیا گیا ہے

[۲] ANTHROPOMORPHIC

"میں اپنے تیروں کو خون پلا کر مست کروں گا ۔

اور میری تلوار گوشت کھائے گی ۔

یہوواہ ایک واضح شخصیت ہے اور بنی اسرائیل کا قبائلی معبود ہے ۔

"خداوند نے تجھ کو روئے زمین کی اور سب قوموں میں سے چن لیا ہے تاکہ تو اس کی خاص قوم ٹھہرے

(استثناء)

"جس طرح دولہا دلہن میں راحت پاتا ہے اسی طرح تیرا خدا تجھ میں مسرور ہو گا ۔ (یسعیاہ)

"اس (فرعون) سے کہنا کہ خداوند عبرانیوں کے خدا نے مجھے تیرے پاس بھیجا ہے ۔"

جب بنی اسرائیل نے بار بار سرکشی کی اور کنعانیوں کے دیوتاؤں بعل اور مولک اور ملکرت کے معبدوں میں جا کر قربانیاں دینے لگے اور عشتورت کے مندر میں جا کر دیو داسیوں سے تمتع کرنے لگے تو یہوواہ کا غصہ بھڑک اٹھا ۔

"اے جادوگرنی کے بیٹو، زانی اور فاحشہ کے بچو! ادھر آؤ ۔ تم کس پر ٹھٹھا مارتے ہو تم کس پر منہ پھاڑتے ہو اور زبان نکالتے ہو کیا تم باغی اولاد اور دغا باز نسل نہیں ہو ۔ (یسعیاہ)

ایلیاہ نبی نے بنی اسرائیل کو راہ راست پر لانے کے لئے بعل کے پجاریوں سے کہا کہ آؤ ہمارے معبود کے ساتھ تو بعل کی طاقت آزماؤ مقابلہ اس بات پر ہوا کہ دیکھیں کس کی قربانی قبول کی جاتی ہے ۔ بعل کے نبی بلند آواز سے پکارنے لگے اور اپنے دستور کے مطابق اپنے آپ کو چھریوں اور نشتروں سے گھائل کر لیا، یہاں تک کہ لہولہان ہو گئے ۔ وہ دوپہر ڈھلے پر بھی شام کی قربانی چڑھانے تک نبوت کرتے رہے پر نہ کچھ آواز آئی اور نہ کوئی جواب نہ توجہ کرنے والا تھا ۔ اس کے برعکس آسمان سے آگ نازل ہوئی اور ایلیاہ کی قربانی کو بھسم کر دیا جو قربانی کے قبول کرنے کا ثبوت تھا ۔ (سلاطین)

جناب موسیٰ کی وفات کے بعد صدیوں تک بنی اسرائیل بعل فغور، بعل بریت اور عشتورت کو پوجتے ۔ بنوکد نظر انہیں قید کر کے بابل لے گیا جہاں وہ ستر سال کے لگ بھگ اسیری میں رہے ۔ آخر ہخامنشی شہنشاہ ایران

ورش کبیر نے انہیں رہائی دلائی اور انہیں وطن واپس جانے کی اجازت دی ۔ بابل کی قید کے دوران میں بنی اسرائیل شیطان
رقوں جنت عدن، آدم و حوا اور دوزخ کے تصورات سے آشنا ہوئے یسعیاہ ثانی کے گمنام نبی نے بنی اسرائیل کے قبائلی
ر شخصی معبود کے تصور کو وسعت دے کر اُسے دونوں جہانوں کا خداوند بنا دیا ۔

ی اسرائیل سامیین کی دیو مالائی اور مذہبی روایات کو کبھی نہ بھلا سکے ۔ ان کی قربان گاہوں کے قریب ایک بلّی نصب کی
الی تھی جو مقدس شجر کی علامت تھی اور جس کی پوجا کنعانی کیا کرتے تھے ۔ وہ بابلیوں کی طرح سانڈ اور سانپ کی پوجا
تے رہے ۔ پیتل کا بنا ہوا سانپ ان کے ہاں حزقیاہ نبی کے زمانے تک پُجتا رہا ۔ انسانی قربانی کا رواج عام تھا اور
ڑے بیٹے کی قربانی اہتمام سے دی جاتی تھی ۔

"سیموئیل نے اجاج کو خداوند کے آگے ٹکڑے ٹکڑے کیا ۔ (سیموئیل)

افتاح نے اپنی اکلوتی بیٹی کو جو کنواری تھی یہوواہ کے حضور قربان کیا (قاضیوں) ساؤل کے دو بیٹوں اور پانچ نواسوں کی قربانیا
ی گئیں (سیموئیل) بعد میں انسانوں کے بجائے مینڈھے بکرے وغیرہ قربان کرنے کا رواج ہو گیا ۔

زبور میں آیا ہے کہ یہوواہ ایک رتھ میں سواری کرتا ہے جس میں کروبی جُتے ہوئے ہوتے ہیں ۔ "اس وقت رتھ
ے چراغوں اور انگاروں کی روشنی نکلتی ہے اور رتھ حرکت کرے تو اس سے آگ اور بجلی نکلتی ہے" (حزقی ایل) ان الفا
یں سورج دیوتا کی سواری کا منظر پیش کیا گیا ہے ۔ دوسری اقوام کی طرح بنی اسرائیل آگ کی تقدیس کرتے تھے اور اس
پر سوختنی قربانیاں کرتے تھے ۔

"سوختنی قربانی مذبح کے اوپر آتش دان پر تمام رات صبح تک رہے اور مذبح کی آگ اس پر
جلتی رہے ۔ مذبح پر آگ ہمیشہ جلتی رکھی جائے ۔ وہ کبھی بجھنے نہ پائے ۔" (احبار)

قبل اسلام کے عربوں کی مانند بنی اسرائیل بھی سفر کے دوران میں کوئی پتھر کھڑا کر کے اس پر تیل گراتے اور قربانی کرتے تھے
یسے پتھروں کو بیت ایل (خدا کا گھر) کہا جاتا تھا ۔ وہ بعض چٹانوں کو بھی مقدس مانتے تھے ۔ جناب سلیمان نے

اسی نوع کی ایک چٹان پر اپنا ہیکل تعمیر کرایا تھا ۔ بعد میں مسلمانوں نے اسی چٹان پر قبۃ الصخرا (چٹان کا گنبد) تعمیر کیا تھا ۔ اسی کے حوالے سے شہر کا نام بیت المقدس رکھا گیا تھا ۔ آج بھی یہودی اور مسلمان اس کی تقدیس کرتے ہیں ۔ یہی مسلمانوں کا قبلۂ اول تھا اور یہودی اسی کی طرف رخ کر کے دن میں تین نمازیں پڑھتے ہیں ۔ بابلیوں کا سبت[1] بعد میں یہودیوں نے اپنا لیا تھا ۔

سامیوں کا ایک قبیلہ کنعان (فونیقیوں کا فونیقیہ ، آج کل لبنان) میں آباد ہو گیا ۔ کنعانی اپنے زمانے کے بہت بڑے تاجر اور جہاز راں تھے ۔ ان کی وساطت سے بابل اور مصر کے علوم ہیئت ، ریاضیات وغیرہ کی مغربی ممالک میں اشاعت ہوئی تھی ۔ ان کا خداوند ایل تھا ۔ ایل کی زوجہ عاشرہ تھی ۔ بعل کی حیثیت میں وہ شہر صور کا محافظ تھا ۔ بعل کے علاوہ کنعانیوں کے بڑے دیوتا مولک اور آدون یا ادونائی (میرے آقا) تھے ۔ آدون بعد میں یونانیوں کا اڈونس بن گیا ۔ جس کے ساتھ عشتار دیوی کا معاشقہ سمیری دیومالا سے یادگار تھا ۔ کنعانی دیومالا میں بعل اور عشترق دھرتی کی زرخیزی کی علامتیں تھیں ۔ کنعانیوں کا عقیدہ تھا کہ بعل اور عشترق کے اختلاط سے درخت پھولتے پھلتے ہیں اور فصلیں پکتی ہیں ۔ بعلبک میں بعل کے زرخیزی کے بت کے ساتھ تو قدرتاً مقدس عصمت فروشی وابستہ ہو گئی ۔ عشترق کے معبد میں دیوداسیاں رہتی تھیں ۔ جن سے یاتری تمتع کرتے تھے ۔ زرخیزی کے مت کا بنیادی خیال یہ تھا کہ کشاورزی اور جنسی ملاپ کا عمل ایک جیسا ہے ۔ اور ہوتا یہ ہے معبدوں میں کثرت و تواتر سے جنسی ملاپ کیا جائے تو فصلیں خوب پنپتی ہیں ۔ عشترق کسبیوں اور دیوداسیوں کی سرپرست دیوی تھی دیوی کو کادشُو (مقدس) کہتے تھے ۔ اس کے حوالے سے کسبیوں کو کدیشا کہا جاتا تھا ۔ لبنان میں افاکا معبد مذہبی عصمت فروشی کا سب سے بڑا مرکز تھا ۔ اس میں سیکڑوں دیوداسیاں گانے بجانے کے علاوہ عصمت فروشی کا دھندا کرتی تھیں جس کی آمدنی پروہت وصول کرتے تھے ۔ اس معبد کے ساتھ ہیجڑے پروہت بھی وابستہ تھے جو یاتریوں کے ایذائی ذوق کی تشفی کرتے تھے ۔ عشترق زمین ، پانی اور چاند کی دیوی بھی تھی ۔ اسے آسمان کی ملکہ اور ستاروں کی حکمران بھی کہا جاتا تھا ۔ خاص تقریبات پر عشترق اور بعل کے بت ایک رتھ میں رکھ کر پھراتے تھے جس کے آگے شیر جوتے جاتے تھے ۔ عشترق کے معبد میں لنگ

---

[1] یعنی سیارۂ کیوان کا دن SATURN= DAY کا انگریزی SATURDAY یعنی ہفتہ کا دن جب خداوند خدا

کی شکل کے تراشے ہوئے ستون نصب کئے جاتے تھے، جنہیں عاشترا کہا جاتا تھا۔

دوسرے سامیوں کی طرح کنعانی بھی اپنے دیوتاؤں کی رضا کیلئے انسانی قربانی کرتے تھے۔ آفات کے دفعیے کے لئے اس قربانی کو خاص طور سے موثر سمجھا جاتا تھا۔ کنعان اور قرطاجنہ کے مذبحے سدا سال خون آلود رہتے تھے۔ سامیوں کا عہد و پیمان کا قدیم دیوتا مولک (ملک بمعنی بادشاہ جو اسلامی روایت میں دوزخ کا داروغہ بن گیا) آگ کا دیوتا تھا۔ اس خوفناک دیوتا کی قربان گاہ پر انسانوں کی سوختنی قربانی کی جاتی تھی۔ خاص خاص تہواروں پر بچوں کو اس کے عظیم الجثہ برنجی بت کے شکم میں آگ کے بھڑکتے ہوئے شعلوں میں دھکیل دیا جاتا تھا۔ بچوں کی چیخوں کو دبانے کے لئے زور زور سے ڈھول پیٹے جاتے اور نفیریاں بجائی جاتی تھیں۔ زرخیزی کے دیوتا تموز اور حسن و عشق کی دیوی انانا کی محبت روایت کا میری الاصل قصہ کنعانیوں میں بھی مقبول ہو گیا۔ کنعانیوں کے ہاں تموز کو آدون اور انانا کو عشترتی کہتے تھے۔ کنعانیوں کی روایت کے مطابق دیوی عشترتی اپنے محبوب آدون کے قتل کے بعد زیریں دنیا میں گئی جہاں کی ملکہ ارکلا نے اسے قید کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دھرتی بنجر ہو گئی، فصلیں برباد ہو گئیں، پھل جھڑ گئے، پھول مرجھا گئے اور نر مادہ سے الگ تھلگ رہنے لگے۔ دنیا کے گیت اور مسرتیں غائب ہو گئیں، عشق و محبت کے سرچشمے خشک ہو گئے۔ چاروں طرف افسردگی، جمود اور اداسی پھیل گئی۔ جب کسی دیوتا نے عشترتی اور آدون کو موت اور قید سے رہائی دی اور دونوں عالم کو لوٹ آئے تو گلوں سے جھنجھنانے لگے۔ مینڈھے بھیڑوں کی طرف دوڑے، پرندوں نے نغموں کو چھیڑا، ندیاں پھر سے چلنے لگیں، کلیاں چٹکنے لگیں، پھول کھلنے لگے۔ اور زمین پھر مسرت و شادمانی سے معمور ہو گئی۔ چاروں طرف گیتوں کی لاپ اور قہقہوں کی کھنک سنائی دینے لگی۔ کنعانی لبنان و تموز کے تہواروں پر شاندار جلوس نکالتے تھے جن میں ان کے پجاری خنجروں اور چھریوں سے اپنے آپ کو لہولہان کر لیتے تھے۔ پھر ان کی واپسی کا جشن جوش و خروش سے منایا جاتا تھا اور مردوں اور عورتوں کو اختلاط کی رخصت عام مل جاتی تھی۔ قحط سالی کے ایام میں بعل کے پجاری سخت ماتم کرتے تھے۔ خیال یہ تھا کہ ماتمیوں کا لہو جاری ہو جانے سے بادلوں کو برسنے کی ترغیب ہوتی ہے۔

بعل نے کائنات کی تکوین سے فارغ ہو کر آرام کیا تھا۔

عہد نامہ قدیم میں ان رسوم کی تفصیلات دی گئی ہیں ۔

مصر قدیم کی دیو مالا میں بے شمار دیوتا اور دیویاں ہیں کیونکہ مصر والوں نے فطری مظاہر کے علاوہ تمام درختوں، پودوں، جانوروں حتیٰ کہ کیڑے مکوڑوں کو بھی دیوتا بنایا تھا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی دیو مالا پر ٹوٹم مت کے گہرے اثرات ہیں۔ ٹوٹم مت کا تعلق قدیم انسان کے مانا کے تصور سے ہے جسے وہ ایک ہمہ گیر طلسماتی توانائی سمجھتا تھا۔ اسی کے عقیدے کی رو سے یہ توانائی کائنات میں ہر کہیں طاری و ساری ہے۔ آسمان، سورج، چاند، ستاروں، پہاڑوں، دریاؤں، وغیرہ کے علاوہ پرندوں اور درندوں میں بھی یہ طلسماتی حیاتیاتی قوت پائی جاتی ہے۔ اسی کے تحت مختلف قبائل نے پرندوں، ستاروں، درختوں وغیرہ سے اپنے اپنے قبائلی نشانات چن لئے تھے اور انہیں اپنا سرپرست اور مربی بنا لیا تھا۔ وہ ان نشانات کو لکڑی کے کھمبوں پر کھود کر اپنی بستی کے قریب گاڑ دیتے تھے۔ اور انہیں مقدس سمجھ کر ان کی پوجا کرتے تھے یہ ٹوٹم ان کے لئے بھائی چارے کی علامت بن جاتا تھا۔ مصر قدیم میں ٹوٹم مت اپنی ابتدائی صورت میں رائج تھا۔ اور ان کی تاریخ میں آخر تک باقی رہا چنانچہ ان کے دیوتاؤں اور دیویوں کی شکلیں اکثر و بیشتر درندوں، پرندوں وغیرہ کی صورت پر بنائی جاتی تھیں مثلاً دیوتا اوزیرس کی صورت بیل کی تھی، ہورس کی باز کی، ہیت کی گدھے کی۔ انوبس کی گیدڑ کی، تھوت کی لق لق کی، سیبک کی مگرمچھ کی۔ باست کی بلی کی، نیت کی گدھ کی، رنوت کی سانپ کی، سرکت کی بچھو کی وغیرہ۔ اہرام کے تہہ خانوں سے بیلوں، بندروں، گیدڑوں، سانپوں، گدھوں، چیلوں، شکروں وغیرہ کی ممیاں برآمد ہوئی ہیں۔ جن کے لئے معبد تعمیر کیے گئے تھے۔ بکرے اور بیل کو خاص طور سے مقدس مانتے تھے۔ ان کے معبدوں میں جوان لڑکیاں موجود رہتی تھیں جنہیں ان کی زوجیت میں دے دیا جاتا تھا۔ سامری نے بچھڑے کی پوجا مصریوں ہی سے لی تھی۔ ممفس کے شہر میں اوزیرس دیوتا کی پوجا سانڈ آپیس کی صورت میں کرتے تھے جسے یونانیوں نے سیراپس کا نام دیا تھا۔ یہ سانڈ کالے رنگ کا ہوتا تھا جس کے ماتھے پر بالوں کی مثلث شکل کی سفید بھونری ہوتی تھی، پشت پر عقاب کی صورت کا نشان اور زبان پر بھونری کا نقش ہوتا۔ خوبصورت نوجوان عورتیں ان کی زوجیت میں دی جاتی تھیں۔ جب یہ مر جاتا تو ملک بھر میں صف ماتم بچھ جاتی اور چاروں طرف سے گریہ و بکا کی آوازیں سنائی دینے لگتیں پھر اسی قسم کا بچھڑا تلاش کرنے کے لئے ہر طرف تگ و دو

شروع ہو جاتی۔ جب اس کا کھوج مل جاتا تو خوشی کے شادیانے بجائے جاتے تھے۔ خنوم بھیڑیے کی شکل کا دیوتا تھا جسے خالق کائنات کہتے تھے۔ علم و دانش کا دیوتا تھوت جس نے تحریر ایجاد کی تھی لنگور کی صورت کا تھا۔ پیدائش اور عشق و موت کی دیوی ہاتھور کی صورت انسانی تھی لیکن سر پر گائے کے سینگ تھے۔ کاریگروں کا دیوتا پتاح گبریلے کی شکل رکھتا تھا۔ اُسے شیر کی دیوی سخمت کا شوہر کہتے تھے۔ پتاح شہر ممفس کا بڑا دیوتا تھا جس کا معبد شاہ مینا نے تعمیر کرایا تھا۔

مصر کے بڑے دیوتا تھے آتم، رع، ہورس، آمن اور اوزیرس۔ دیویوں میں سخمت، ہاتھور، نوت اور آئسز کی پوجا بڑے ذوق و شوق سے کی جاتی تھی۔ آمن شہر تھیبس کا دیوتا تھا جس کے نام کے لغوی معنی ہیں "مخفی"۔ اس کے بت کے سر پر بھیڑیے کے سینگ تھے اور سر پر زیریں اور بالائی مصر کا دوہرا تاج تھا۔ شہر تھیبس کے نواح میں اس کا شاندار معبد تھا جہاں کے پروہت سامیوں کے کاہنوں کی طرح وجد و حال کی حالت میں پیش گوئیاں کیا کرتے تھے۔ سکندر اعظم نے اس کے معبد پر حاضری دی تھی اور کاہنوں سے سوال جواب بھی کئے تھے۔ بعد میں وہ اپنے آپ کو دیوتا آمن کا اوتار سمجھنے لگا تھا۔ بعد میں دیوتا رع کو اسی میں ضم کر دیا گیا۔ اور وہ آمن رع کی صورت میں مصریوں کا خداوند خدا بن گیا۔ رع سورج دیوتا تھا جس کی پرستش ہر کہیں کی جاتی تھی۔ فرعون اپنے آپ کو اسی کی اولاد سمجھتے تھے روایت کے مطابق وہ ایک انڈے سے پیدا ہوا تھا۔ رع کی مناجات میں تثلیث مشتمل ہیں۔ پرجوش بھجن گائی جاتی تھیں جن میں اسے زندہ دیو پائندہ کہہ کر طلب کیا جاتا تھا۔ کہتے تھے کہ پہلے مرد و عورت نے اس کی آنکھ سے جنم لیا تھا۔ رع سورج دیوتاؤں کی تثلیث کا سب سے بڑا رکن تھا۔ دوسرے دو آتم اور خفرع تھے۔ اہرام مصر کی تعمیر کے دور میں آتم کی بڑی تکریم کی جاتی تھی۔ اسے دیوتاؤں کا باپ کہتے تھے اور حیات و افزائش کا سرچشمہ جانتے تھے۔ ایک سورج دیوتا ہورس کو بچے کی صورت کا دکھاتے تھے۔ کبھی کبھار اُسے باز کی شکل دی جاتی تھی جو روح آفتاب کی علامت تھا۔ ہورس آئسز دیوی اور اوزیرس کا بیٹا تھا۔ اوزیرس، آئسز اور ہورس قدیم مصریوں کی تثلیث تھی۔ بعد میں یہی تثلیث کیتھولک عیسائیوں کے یہاں خدا، مریم اور مسیح کی صورت میں نمودار ہوئی۔ کتب تواریخ میں ذکر آیا ہے کہ بعض خوش فہم عیسائی اوزیرس، آئسز اور ہورس کے بتوں کی پوجا کرتے تھے جو ان کے خیال میں خدا، مریم اور مسیح کی مورتیاں تھیں۔

چاند دیوتا خونسو کو آمن اور مت (دیوتوں کی ماں ، آمن کی زوجہ) کا بیٹا کہتے تھے جس کا عظیم معبد فرعون آمن ہوتپ نے کرنک میں تعمیر کرایا تھا ۔ دوسری اقوام کی طرح مصر قدیم میں بھی سورج کی پوجا سے پہلے چاند کی پوجا کا رواج تھا ۔ ان کا عقیدہ تھا کہ چاند کا اثر براہ راست فصلوں کی نشوونما پر ہوتا ہے ۔ یعنی چاند بڑھ رہا ہو اور فصلیں بوئی جائیں تو پودے زیادہ گھنے اور سرسبز ہوتے ہیں ۔ عورتوں کی ماہواری پر بھی چاند کے اثرات کا ذکر کیا جاتا تھا ۔ اوزیرس دیوتا کو چاند کا اوتار مانتے تھے ۔ اوزیرس فی الاصل قدیم زمانے کا ایک مصری بادشاہ تھا جس نے فصلیں اگانے اور پھل دار پیڑ بونے کا رواج معلوم کیا تھا ۔ توت ، خونسو اور آتن بھی چاند کے متعلق مظاہر تھے جیسے قدیم زمانے کے کاشتکاری اور کسان حیات اور بار آوری کا محافظ سمجھتے تھے ۔ اوزیرس زمین دوز کے ملک دیوتا قیب اور اس کی زوجہ نوت کا بیٹا تھا جو مردوں کا حساب کتاب لیتا تھا اور ان کی روحوں کو ان کے کرتوتوں کی جزا سزا دیتا تھا ۔ اوزیرس کو اس کے توام بھائی سیت نے قتل کر دیا ۔ اوزیرس کی زوجہ آئسس نے دنیا بھر کی خاک چھان کر اپنے شوہر کے بدن کے ٹکڑے تلاش کئے اور انہیں سی جوڑ کر دوبارہ زندہ کیا تھا ۔ بابلی دیومالا کے علماء کہتے ہیں کہ مصر میں بابلی دیومالا کے نفوذ کے بعد اوزیرس تموز اور ادونائی کی طرح زمین کی زرخیزی کی علامت بن گیا جو خزاں میں مر جاتا ہے اور بہار میں دوبارہ زندہ ہوتا ہے ۔ مصر پر ۱۷۲۰ ق م تا ۱۵۸۰ ق م ہکسوس حملہ آوروں کی حکومت رہی جس کے دوران ایشیائی اسرائیل نے مصر میں بود و باش اختیار کر لی تھی ۔ ہکسوس نے اپنے دیوتا بعل کو مصری دیوتا سیت میں ضم کر دیا اور بعل کی پوجا بھی مصر میں رواج پا گئی ۔ اس کے ساتھ ہی دیوی عشتار کا اتحاد آئسس کے ساتھ عمل میں آیا ۔

سیت جس نے اوزیرس کو ہلاک کیا مصریوں کا شیطان یعنی بدی اور اندھیرے کا دیوتا تھا اسے سیاہ فام اژدھے کی صورت میں دکھاتے تھے ۔ اس کے علاوہ سانپ دیوتا اپے پ روشنی کا دشمن اور اندھیرے کی علامت بن گیا ۔ اسے بد روحوں کا آقا بھی کہتے تھے مصریوں کی دیوی سخمت ہندوؤں کی کالی دیوی کی طرح نہایت خوفناک اور خونریز تھی اور ہمیشہ دوسروں کی تباہی اور ہلاکت پر کمربستہ رہتی تھی ۔

آئسس کے علاوہ مصری دیومالا میں متعدد دیویاں تھیں ۔ ان میں سخمت رشک کی دیوی تھی جس کا جسم عورت کا اور سر شیر کا بناتے تھے

دورِ رع کے دشمنوں کو ہلاک کیا کرتی تھی ۔ دیوی نُوت کو مادرِ آسمان کہتے تھے ۔ ہاثر کا نشان گائے تھی جو افزائش کی دیوی مانی گئی مصری کہا کرتے تھے کہ دیوی نُوت ہر رات سورج کو نگل جاتی ہے جو صبح کو اس کی کوکھ سے دوبارہ جنم لیتا ہے ۔ مچھلی کی دیوی کو جنگ کی علامت سمجھ کر اسے پوجتے تھے ۔ گدھ اور سانپ کو نہایت مقدّس مانتے تھے ۔ فرعون سُورج کی تمثال کے ساتھ سانپ اور گدھ کی شکل کا مکٹ تاج پر پہنا کرتے تھے ۔ نیل کا دیوتا ہاپی آمن سے گہرا ربط رکھتا تھا ۔ سالانہ طغیانی کے موسم میں آمن کا بت کشتی میں رکھ کر شہر تھیبس سے لکسر کے معبد کو لے جاتے تھے جہاں وہ ایک ماہ قیام کرتا تھا ۔ اس جشن کو بڑے جوش و خروش سے مناتے تھے ۔ اس موقع پر ایک منتخب حسین لڑکی کو دلہن کی طرح سنگار کر کے نیل کے دیوتا کی نذر کرتے تھے یعنی اسے عین منجدھار میں غرق کر دیا کرتے تھے ۔ آج بھی طغیانی کے موسم میں مصر کے فلاحین مٹی کی عروسہ دریائے نیل میں غرق کرتے ہیں تاکہ مناسب وقت پر طغیانی آجائے ۔

فرعون اخناتن (لغوی معنی آتن یا روحِ آفتاب کا خادم) نے بت پرستی کی سخت مخالفت کی اور آتن کی صورت میں خدائے واحد کی عبادت کی دعوت دی ۔ اسکا اصل نام آمن ہوتپ چہارم تھا ۔ اس نے آمن ، رع وغیرہ کے معبد مقفّل کرا دیئے اور پروہتوں اور دیوداسیوں کو نکال باہر کیا ۔ اس نے حکم جاری کیا کہ کسی دیوتا کی مورت کی پوجا نہ کی جائے اس نے بتایا کہ خدا ایک ہے جس کا کوئی شریک نہیں ہے ۔ وہ شکل و صورت سے منزّہ اور پاک ہے وہ رحیم و کریم ہے اور سب کا پالنے والا ہے آفتاب اسی معبودِ ازل کا علامتی مظہر ہے ۔ مورخین کے خیال میں اخناتن نے تاریخِ عالم میں پہلی بار وحدانیت کا درس دیا ، انسانی برادری کا تصور پیش کیا اور دنیا بھر میں امن و امان قائم کرنے کی دعوت دی لیکن اس کی یہ دعوت اس کی موت کے ساتھ ہی ختم ہو گئی اور آمن کے پروہتوں نے دوبارہ اپنا دین فروشی کا کاروبار شروع کر دیا ۔

سمیریوں ، اسائیریوں ، بابلیوں اور مصریوں کی دیومالا کے بعد ہم آریائی اقوام کی دیومالا کا ذکر کریں گے ۔ ان میں تین اقوام کی روایات قابلِ لحاظ ہیں ۔ یونان ، ایران اور ہندوستان ۔ آریائی قبائل وسطِ ایشیا سے اُٹھ کر ان ممالک میں آباد ہوئے تھے ۔

یونانی دیومالا بارہ بڑے بڑے دیوتاؤں اور دیویوں پر مشتمل ہے جو ایک ہی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں اور کوہِ اولمپس کی بلندیوں

پرستش کرتے ہیں۔ سب سے پہلے دھرتی دیوی جیا[1] تھی جس کا شوہر دیوتا یورے نس تھا۔ جیا تمام ارضی اشیاء کی ماں تھی۔ کرونس جیا کا بیٹا تھا۔ اس نے ریا سے شادی کی۔ اس ڈر سے کہ اس کے بیٹے بڑے ہو کر اس کے ہاتھوں سے اقتدار چھین لیں گے کرونس انہیں پیدا ہوتے ہی نگل جاتا تھا۔ ریا اپنے بیٹوں زیس، پوزیڈون، پلوٹو اور بیٹی ہیرا کی جان بچانے میں کامیاب ہو گئی۔ زیس نے جوان ہو کر اپنے باپ سے تخت و تاج چھین لیا۔ اور اسے الپس سے جلاوطن کر دیا۔ ہیرا زیس کی بہن اور زوجہ تھی۔ پلوٹو زیریں دنیا مملکت کا حاکم بنا اور پوزیڈون کو سمندروں کی مملکت سونپ دی گئی۔ خداوند خدا زیس کریٹ کے دیوتا ولکانس کا مثیل ہے وہ آسمان، سورج اور رعد و برق کا دیوتا ہے۔ اس کے ہاتھ میں بجلی کا کنٹرول (زیس شاہ، عصا) ہے جس سے وہ بادلوں کو اکٹھا کر کے انہیں برسنے پر مجبور کر دیتا ہے اور اپنے دشمنوں کو اس سے جلا کر خاکستر کر دیتا ہے۔ اس کی ایک بہن ہسٹیا گھر اور عورتوں کی سرپرست ہے۔ زیس اور ہیرا کی اولاد نرینہ میں اریس، اپالو، ہرمیس اور ہی فیسٹس ہیں۔ اتھینا (اتھنز کی سرپرست) ہیبی، افرودائتی اور آرٹمیس اس کی بیٹیاں ہیں۔ ہیبی شباب دوام کی، اتھینا علم و دانش کی، آرٹمیس شکار کی اور افرودائتی حسن و عشق کی دیوی ہے۔ زیس مختار کل ہے البتہ تقدیر کی تین دیویوں پر اس کا حکم نہیں چلتا۔ ان میں ایک تقدیر کا دھاگہ کاتتی ہے، دوسری ہر شخص کی تقدیر معین کرتی ہے اور تیسری اس دھاگے کو کاٹ دیتی ہے۔ ان کے سامنے انسان اور دیوتا سب بے بس ہیں۔

اپالو سورج کا دیوتا ہے اور نہایت حسین نوجوان ہے۔ وہ ایک باکمال مغنی ہے اور اپنا بربط چھیڑ کر سامعین پر جادو کر دیتا ہے۔ اپالو فنون کے علاوہ صداقت، راستی اور عقلیت کا پاسبان بھی ہے۔ اریس جنگ کا دیوتا ہے۔ ہرمیس زیس کا برق رفتار ایلچی ہے اور خداوند خدا کے پیغامات دوسروں تک لے جاتا ہے۔ وہ اپنے پیروں میں پردار جوتے پہنتا ہے جو پلک جھپکنے میں اسے دور دراز کے ملک تک پہنچا دیتے ہیں۔ وہ اپنی مکاری اور عیاری کے لئے بدنام ہے۔ ہسٹیا کنواری دیوی ہے۔ لوگ کھانا کھانے سے پہلے اور بعد میں اس کی مناجات کرتے تھے۔ اس کے معبدوں میں دن رات آگ جلتی رہتی تھی جس کی نگرانی پر کنواری دیو داسیاں مامور تھیں۔ اتھینا اور آرٹمیس بھی کنواری تھیں۔ اتھینا دانش و خرد، علم و ہنر، شائستگی اور کھیتی باڑی کی محافظ تھی۔ اسے پرتھی نان بھی کہتے تھے۔ ایتھنز کا شہر اسی کے نام پر بسایا گیا تھا جس میں اس کا شہرہ آفاق معبد پارتھی نان تعمیر کیا گیا تھا۔ افرودائتی حسن و عشق کی دیوی قبرص کے کنارے سمندر کے جھاگ سے نکلی تھی۔

---

[1] جیالوجی (ارضیات) اور جیوگرافی (جغرافیہ) اس کے نام سے یادگار ہیں۔

یونانی زبان میں افرودیس کا معنی جھاگ ہے۔ یہ پری چہرہ، جادو نگاہ حسینہ نہایت چنچل اور عشق باز ہے اور ہمیشہ انسانوں اور دیوتاؤں کے جذبات سے کھیلتی رہتی ہے۔ لوگوں کی متاعِ صبر و ضبط کو غارت کرنا اس کا محبوب مشغلہ ہے جس میں اس کا بیٹا کیوپڈ (عشق کا دیوتا) اس کا ہاتھ بٹاتا ہے۔ کیوپڈ نوجوان لڑکے لڑکیوں کے دلوں میں ہلچل مچاتا رہتا ہے۔ اس کے تیروں سے دیوتاؤں اور انسانوں کی طرح اس کی ماں بھی محفوظ نہیں ہے۔ کیوپڈ اور سائیکی (روح) کا معاشقہ یونانی دیومالا کی دلچسپ کہانیوں میں سے ہے اس میں علامت کے پیرائے میں یہ حقیقت واضح کی گئی ہے کہ روح کا عشق سے ملاپ انسانی زندگی کا عظیم نصب العین ہے۔ ہرکولیز خداوند خدا زیس کا شہ زور بیٹا ہے۔ رستم اور اسفندیار کی طرح اس کے ہفت خواں مشہور ہیں۔ ایک دفعہ موت کے فرشتے نے الکسٹیز کی جان قبض کر لی تو ہرکولیز نے موت سے کشتی لڑ کر الکسٹیز کی روح چھڑا لی تھی۔ یونانی دیومالا میں عفریت تیتان کا ذکر بھی ملتا ہے جو دیوتاؤں کے مخالف تھے۔ ایک عفریت پرومیتھیس (لغوی معنی عاقبت اندیش) دیوتاؤں کے محل سے انسان کے لئے آگ کا تحفہ چرا لایا خداوند خدا نے غضب ناک ہو کر اسے ایک چٹان سے جکڑ دیا جہاں ایک گدھ ہر روز اس کا کلیجہ چباتا رہتا ہے۔ رات کو یہ زخم خود بخود مندمل ہو جاتے ہیں اور اگلے صبح پھر وہی گدھ آن موجود ہوتا ہے۔ پرومیتھیس کو ایک ہیرو یا بطل جلیل کا مقام دیا گیا ہے جس نے انسان کی بہبود کی خاطر زیس سے سرکشی کی اور عذاب بھگتا۔ مشاہیر شعراء اور تمثیل نگاروں نے اس کے گرد نظمیں اور ناٹک لکھے ہیں۔ زیس نے بنی نوعِ انسان کو آگ کا راز پا لینے کی سزا یوں دی کہ ایک عورت پنڈورا کو ایک صندوقچہ دے کر دنیا میں بھیج دیا اور ساتھ ہی اُسے منع کیا کہ کسی حالت میں یہ صندوقچہ نہ کھولے۔ پنڈورا تجسس کے باعث ضبط نہ کر سکی اور یہ صندوقچہ کھول دیا۔ جس پر اس میں بند کی ہوئی آفات بنی نوعِ انسان پر ٹوٹ پڑیں۔ بعض اہلِ تحقیق نے پنڈورا کو یونانِ قدیم کی اماں حوا کہا ہے۔ دوسرے دیوتاؤں میں دائونیسس (زیوس کا بیٹا) اصلاً تھریس کا زرخیزی، شراب اور نشے کا دیوتا تھا جو یونانی دیومالا میں شامل کر لیا گیا۔ وہ مستی اور از خود رفتگی کا تمثیلی پیکر بن گیا جو شراب کے نشے سے پیدا ہوتی ہے۔ لوگوں کا عقیدہ تھا کہ شراب پینے سے دیوتا دائونیسس اُن کے اندر حلول کر جاتا ہے یونانیوں کا عارفانی مَت اسی دیوتا سے یادگار ہے۔ اس میں حصولِ صداقت کے لئے عقلیت اور ضبطِ نفس کے بجائے مستی اور بے خودی کو مؤثر وسیلہ مانا گیا ہے۔ اس مت کا بانی مشہور مغنی عارفیوس تھا جو اپالو دیوتا کا بیٹا تھا اور اپنی زوجہ یوری ڈیکی کی تلاش میں

زیریں دوزخ عالم کر گیا تھا۔ عارفی مت میں جہانِ فانی کو روح کا زنداں سمجھا جاتا ہے۔ اور اس سے نجات پانے کی تدبیریں کی جاتی تھیں مشہور یونانی فلسفی فیثاغورس یونانی سرّیت کے علاوہ عارفی مت کا مُصلح بھی تھا۔ یونانی دیو مالا کی ایک دیوی دمیتر کو بھی خاص مقام حاصل تھا۔ دمیتر اپنی بیٹی پرسی فونی کو زیریں دوزخ مملکت میں جا کر ڈھونڈ لائی تھی۔ اس کے مت کی پُر اسرار رُسوم الیوسیاس کے شہر میں چھپ کر منائی جاتی تھیں۔ ان رُسوم کا مرکزی خیال یہ تھا کہ انسان مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہوگا۔ اس مت والوں کی علامت اناج کا خوشہ تھا جسے سب کو دکھا کر کہتے تھے دیکھو جیسے بیج زمین میں غائب ہو کر دوبارہ خوشے کی صورت میں نمودار ہو گیا ہے اسی طرح انسان بھی مر کر زندہ ہو جاتا ہے۔

مرورِ زمانہ سے دایونیسیس دھرتی کی زرخیزی اور بار آوری کا دیوتا بن گیا کہتے تھے کہ وہ جاڑے کی آمد پر مر جاتا ہے اور بہار کے آغاز میں دوبارہ جی اُٹھتا ہے۔ اس کی موت بڑے دردناک حالات میں واقع ہوئی تھی روایت کے مطابق اسے عفریتوں نے جان سے مار کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا تھا چنانچہ اس کے تہوار پر اس کے پیرو ماتم کرتے تھے اور بہار کے آغاز میں اس کی پیدائشِ نو کا تہوار شان و شوکت سے مناتے تھے اس جشن پر اس کے پجاری شراب کے نشے میں دُھت از خود رفتگی کے عالم میں والہانہ ناچتے پھرتے تھے۔ رستے میں جو کوئی جانور مل جاتا اُسے دانتوں سے کُترے کُترے کر کے کچا چبا جاتے تھے تاکہ دیوتا ان کے اندر بھی حلول کر جائے۔ اس والہانہ سرخوشی اور جنون پرور وارفتگی کے باعث دایونیسیس شاعرانہ الہام کا دیوتا بھی بن گیا تھا۔ یونانیوں کی المیہ اور فرحیہ تمثیلیں دایونیسیس کے تہوار کے جشن میں کھیلی جاتی تھیں۔ اہلِ علم کہتے ہیں کہ المیہ اور فرحیہ نے دایونیسیس کے جشن ہی سے جنم لیا تھا یونانی تمثیل نگار یوری پیڈیز نے اپنے ایک ناٹک میں اس کے پجاریوں کے جلوس کا نقشہ کھینچا ہے۔

اپالو کے معبد میں ایک کاہنہ رہتی تھی جو مستی کے عالم میں پیش گوئیاں کیا کرتی تھی جب اس سے کسی بات کے بارے میں استفسار کیا جاتا تو وہ کوئی نشہ آور مشروب پی کر اور بخور جلا کر اس کا دھواں سونگھتے ہوئے مقفیٰ شعروں میں پیش گوئی کرتی اور لوگوں کے استفسار کا جواب دیا کرتی تھی لوگ دور دور سے مستقبل کا حال معلوم کرنے کے لئے ڈلفی کے اس معبد میں آیا کرتے تھے تموز اور نانا کا سُمیری قصہ جو بابلی روایات میں آدون اور عشتار اور کنعانیوں کے ہاں دموزی اور عشترتی کے معاشقے کی صورت میں

یہ ہوا اعتقاد یونان میں اودونس اور افرودائتی کے عشق کی صورت میں بار پا گیا۔ یونانی روایت یہ تھی کہ ایک دفعہ افرودائتی ایک وان رعنا اودونس پر عاشق ہو گئی۔ زیریں دور عالم کی دیوی پرسی فونی بھی اودونس پر مرتی تھی وہ اُسے اپنے یہاں لے گئی اس پر افرودائتی اور پرسی فونی میں جھگڑا ہو گیا اور وہ اس کے تصفیے کے لئے زیوس کے پاس گئیں۔ زیوس نے دونوں کی تالیفِ قلب کرتے ہوئے کہا کہ اودونس ماہ تک زمین پر افرودائتی کے پاس رہے اور چھ ماہ پرسی فونی کے آغوشِ شوق کی زینت بننے کے لئے زیریں دور عالم میں جایا کرے چنانچہ اودونس سرما کا موسم زیرِ زمین گزارتا اور بہار آتے ہی اس دنیا میں آجاتا۔ ایک روایت کے مطابق دیوتا مریخ نے حسد سے جل بھن کر خنزیر کا روپ دھار کر اودونس کو ہلاک کر دیا۔ جس جگہ اودونس کے خون کے قطرے گرے وہاں لالے کے پھول اُگ آئے چنانچہ عربی میں گلِ لالہ کو شقائق النعمان (محبوب یا اودونس کے زخم) کہا جاتا ہے۔ شیکسپئر نے ایک خوبصورت نظم وینس اور اودونس میں اس معاشقے کا دلآویز نقشہ کھینچا ہے۔ جے جی فریزر نے اودونس کے دیومالائی قصے اور جناب عیسیٰ کی موت اور احیاء کی روایات میں مماثلت کا کھوج نکالا ہے اور دعویٰ کیا ہے کہ جناب عیسیٰ کی موت اور احیاء کی روایت اسی دیومالائی قصے سے اخذ کی گئی ہے ۔

یونان کے دیویاں دیوتا اولمپس کی سیر گاہوں سے اکتا جاتے تو انسانوں کے معاملات میں دلچسپی لے کر جی بہلایا کرتے تھے ہومر میں ایک دلچسپ کہانی بیان کی گئی ہے جس میں جنگِ ٹرائے کا اصل سبب بتایا گیا ہے کہتے ہیں کہ ایک دفعہ تین دیویوں ایتھینا، افرودائتی اور آرٹمیس نے سونے کا ایک سیب کہیں راستے میں پڑا ہوا پایا۔ اس کی ملکیت پر ان میں جھگڑا ہو گیا ۔ وہ یہ جھگڑا لے کر خداوند زیوس کے پاس گئیں لیکن وہ اپنی بہنوں اور بیٹی میں سے کسی کو ناراض نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس نے انہیں کہا کہ ٹرائے کے شہزادے پیرس کے پاس جاؤ۔ وہ دانا آدمی ہے۔ اس قضیے کا تصفیہ کر دے گا۔ تینوں دیویاں پیرس کے پاس گئیں ایک نے پیرس کو انعام و اکرام دلانے کا وعدہ کیا تاکہ فیصلہ اپنے حق میں کرا سکے۔ پیرس ایک عشقباز نوجوان تھا جب افرودائتی نے کہا کہ میں تمہیں دنیا کی حسین ترین عورت دلاؤں گی تو اس نے سیب اس کے حوالے کر دیا جب پیرس افرودائتی کی مدد سے سپارٹا کی حسین ہیلن کو بھگا لایا تو یونانیوں اور ٹرائے والوں میں جنگ چھڑ گئی۔ آرٹمیس اور اتھینا نے اپنی توہین کا انتقام

لینے کے لیے لڑنے والوں کی قدم قدم پر مخالفت کی اور انہیں شکست دی [illegible] کئی بار دیوتا خوبصورت عورتوں کو اور عورتیں دیوتاؤں کو دل دے بیٹھتی تھیں جس سے بے شمار عشقیہ قصوں نے جنم لیا۔ انہیں اپالو کے معاشقے بے شمار ہیں۔ ایک دلچسپ کہانی یہ ہے کہ ایک لڑکی کلائٹی نام دیوتا اپالو پر فریفتہ ہو گئی۔ اپالو نے توجہ نہ کی۔ دیوتاؤں نے اس پر رحم کھا کر اسے سورج مکھی کے پھول میں تبدیل کر دیا۔ اور اب وہ پہروں سورج کا دیدار کیا کرتی ہے۔ اسی طرح ایک نوجوان نرسیس پر جنگل کی ایک دیوی فریفتہ ہو گئی۔ اس نے التفات نہ کیا۔ ایک دن نرسیس کا ایک چشمے کے کنارے پانی پینے کے لیے جھکا تو اپنے ہی حسن پر فریفتہ ہو گیا۔ وہ نہایت انہماک کے عالم میں لیٹا پانی میں اپنا عکس دیکھتا رہا۔ آخر دیوتاؤں نے اسے نرگس کے پھول میں بدل دیا۔ ٹرائے کی جنگ کے دو سورمے اکلیس اور اینیس دیویوں کے بیٹے تھے جن کے معاشقے آدمیوں سے ہو گئے تھے۔

یونانی دیومالا کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس کی دیویاں اور دیوتا شکل و صورت، عادات و خصائل اور اوضاع و اطوار کے اعتبار سے روز مرہ کی زندگی کے چلتے پھرتے انسان دکھائی دیتے ہیں۔ یونانی سنگ تراشوں نے ان کے مجسمے اپنے ہی متناسب ڈیل ڈول پر ڈھالے ہیں۔ عالمی دیومالا میں یہ بات نرالی ہے۔ سمیری، بابلی اور مصری اپنے دیوتاؤں کے مجسمے بسا اوقات درندوں اور پرندوں کی شکل و صورت پر بنایا کرتے تھے۔ مثلاً مصری دیوتا ہورس کا جسم انسان کا تھا لیکن سر شکرے کا تھا۔ آمن دیوتا کا سر عقاب کا تھا۔ بابلی دیوتا بعل مردوک کا مجسمہ پردار سانڈ کی صورت میں تراشتے تھے۔ یونانی ورزش کے دلدادہ تھے اور اپنے بدن کے تناسب اور توانائی کو برقرار رکھنے کے لیے کھیلوں میں حصہ لیتے تھے۔ ان کے اس شوق نے ان کی سنگ تراشی کو امتیازی حیثیت بخشی اور انہوں نے اپنے دیوی دیوتاؤں کے مجسمے اپنے ہی خوبصورت جسموں پر تراشے ہیں۔ اس طرح یونانی دیوتا اپنے پجاریوں کے قریب آ گئے اور دونوں میں یگانگت پیدا ہو گئی چنانچہ گلبرٹ مرے کے اس خیال پر صاد کرنا پڑے گا کہ یونان کے دیوتا فی الاصل ممتاز انسان تھے جن کے کارناموں پر مافوق الطبع کا رنگ چڑھا دیا گیا تھا۔

یونانی دیومالا میں انسان کی پیدائش یوں ہوئی کہ اس کا پتلا مٹی کو پانی میں گوندھ کر بنایا گیا اور سورج کی شعاعوں نے اس میں گرمی پیدا کر کے اُسے زندہ کیا۔ یونانی دیومالا میں عالمگیر طوفان کا تذکرہ ہے۔ زیوس نے بنی نوع انسان سے خفا ہو کر انہیں ہلاک

کرنے کے لئے بھیجا تھا۔ دیوکلین اور اس کی زوجہ پیرا نے کشتی میں بیٹھ کر اپنی جان بچائی تھی۔ بعد میں نسل انسان کی پیدائش زوجین سے ہوئی تھی۔ یونانی معاصر اقوام کی طرح دیوتاؤں کی رضا کے طلب کے لئے انسانی قربانی دیا کرتے تھے۔ ہیروز زمانے کے بعد یونانیوں نے پرائم شاہ ٹرائے کی بیٹی پولی زینا کو اکلیس کی قبر پر قربان کیا تھا۔ اس کی دوسری بیٹی کساندرا کو اگا میمنون شاہ سپارٹا کے مرقد پر ذبح کر دیا گیا۔

زردشت (چھٹی صدی قبل از مسیح) کے ظہور سے پہلے ایران میں صابئیت یا ستارہ پرستی نفوذ کر چکی تھی۔ ایک روایت کے مطابق ستارہ پرستی کا آغاز شاہ اژدہاک (عربی ضحاک۔ بہت ہنسنے والا) کے دور حکومت میں ہوا تھا۔ صابئین بابل کی طرح ایرانی بھی سات سیاروں کے معبدوں میں جاتے تھے جنہیں وہ ہیکل یا پیکر یا شیدان کہتے تھے۔ وہ آفتاب کو خداوند خدا مانتے تھے۔ اور اسے نیر اعظم (سب سے بڑا ستارہ) کہا کرتے تھے۔ ہر معبد یا پیکر کے نام کے ساتھ شت (بعد میں اسے شید کہنے لگے یعنی جناب) کا اضافہ کرتے تھے۔ سورج کے لئے خور کا لفظ تھا جو شید کے لاحقے کے ساتھ خورشید بن گیا۔ ہندی آریائی قبائل کے جدا ہونے سے پہلے ایران قدیم کے معبود دو گروہوں میں منقسم تھے (۱) دیوا بمعنی روشن اور (۲) اہورا بمعنی آقا۔ بعد میں دیوا ہندوستان میں دیوتا کہلائے جب کہ ایران میں انہیں دیو (عفریت) کہا جانے لگا۔

ایران قدیم کا آسمان کا دیوتا اہورا تھا جسے یونان قدیم میں اورے نس اور ہندوستان میں ورونہ کہا گیا۔ جب زردشت نے صابئین کی اصلاح کی تو اس کے مسلک یزدانیت یا مجوسیت میں اسے اہورا مزدا (آقائے دانش) کہنے لگے۔ یزدانیت دوئی کا مسلک ہے۔ زردشت نے کہا کہ منبع ازل کو زروان اکارن (زمانہ) کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ زروان نے توام بیٹوں کو جنم دیا اہورا مزدا یا ہرمزد اور انگرا مینیو یا اہرمن۔ ہرمزد خیر کا نمائندہ تھا اور اہرمن شر کا۔ ان دونوں میں شروع سے کشمکش جاری ہے۔ زردشت کے مسلک کو دین مزدا یا آتش کا نام دیا گیا۔ اس میں تین بڑے فرشتے مانے گئے۔ وہو منو (نیک ذہن) مزدا (دانش) اور اشا (نیک) مجوسیوں کا الہام کا فرشتہ سروش[1] ہے۔ جو خدا کا پیغام ان کے برگزیدہ بندوں پر لاتا ہے۔ فردوسی کے بقول سروش فریدون بادشاہ پر بھی الہام لاتا تھا۔

---

[1] لغوی معنی ہے بھیجا ہوا (خدا کی طرف سے) ملک لغوی معنی "ابلاغت"

سروشی بدو آمد از بہشت کہ تا باز گوید بدو خوب و زشت

اسی طرح شاہ جمشید پر بھی الہام کا نزول ہوتا تھا ؎

جہاں بُد بآرام ازاں شاد کام زیزداں بدو نو بنو بُد پیام

خورداد آتش کا فرشتہ ہے اور مُرداد موت کا ۔ خورداد کو آذر بھی کہتے ہیں جو برق کی صورت میں آسمان سے نازل ہوتا تھا اور فرشتہ کا امین سروش ہے جو انسانوں کو دیووں سے بچانے کے لئے ہر رات زمین کے گرد سات چکر لگاتا ہے ۔ فرشتوں کا یہ تصور یہودیوں نے اسیری بابل کے دوران میں اپنا لیا تھا ۔ مجوسی آفتاب یا آگ کو قبلہ سمجھتے ہیں اور ان کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھتے ہیں ۔ وہ انہیں خدا نہیں مانتے ۔ فرشتوں کے علاوہ بدروحوں پر بھی عقیدہ رکھتے ہیں جنہیں اوستا میں جنّی کہا گیا ہے بعد میں یہ عربوں کے جن بن گئے ۔ مجوسیوں کے آدم کا نام کیومرث ہے اُسے قتل کر دیا گیا تو اس کے خون سے میشیا اور میشیانہ پیدا ہوئے جن سے نسل انسانی چلی ۔ ایرانی دیو مالا میں ہفت دوزخ اور ہفت بہشت کا ذکر آیا ہے جنہیں اوستا میں ہفت کشور کہا گیا ہے ۔ نیک روحیں بہشت میں جاتی ہیں ۔ سب سے شاندار طبقہ فردوس ہے جس کا محافظ فرشتہ وہو منو ہے ۔ اہل بہشت کا جی بہلانے کے لئے سیاہ چشم ابھری ہوئی چھاتیوں والی حسینائیں ہیں جنہیں اوستا میں پریکا (پریاں) کہا گیا ہے ان کا نگران فرشتہ زمیاد ہے اوستا میں شجرِ حیات ہیپوت (طوبیٰ حنی الحاکرنا) کے پل کا ذکر آیا ہے جو بال سے باریک تر اور استرے سے تیز تر ہے ۔ قیامت کے روز سب روحوں کو اس پل پر سے گزرنا پڑے گا ۔ نیک لوگ آسانی سے گزر جائیں گے اور اشرار کٹ کر نیچے دوزخ کے بھڑکتے ہوئے شعلوں میں جا گریں گے ۔ مجوسی آگ کو زمین پر آفتاب کا علامتی نشان مان کر اس کی تقدیس کرتے ہیں اور دن میں پانچ مرتبہ اس میں خوشبودار لکڑیاں ڈال کر پانچ نمازیں پڑھتے ہیں جنہیں وہ پنج گاہ کہتے ہیں ۔ اسی سے لفظ پنج گانہ یادگار ہے ۔ قیامت برپا ہونے تک تمام روحیں ایک خاص عالم میں رہیں گی جسے وہ ہمستگان (یعنی کا برزخ) کہتے ہیں ۔ مجوسیوں کا عقیدہ ہے کہ قیامت سے پہلے شاہ بہرام کا ظہور ہوگا ۔ جو یزدگرد سوم کی اولاد سے ہوگا ۔ اس کا ذکر ان کی ایک مقدس کتاب جاماسپ نامہ میں آیا ہے ۔ شاہ بہرام مجوسیوں کو ذلت کی زندگی سے نجات دلا کر دنیا بھر میں ان کا بول بالا کرے گا ۔

دوسری اقوام کی طرح ایرانی دیو مالا میں بھی آفتاب دیوتا اور دوسری دیوی کو نمایاں حیثیت دی گئی ہے۔ بابلی اثرات کے تحت مزدائیت میں اہورامزدا کو بعل پر، اناہتا (دریاؤں اور افزائش کی دیوی) کو عشتار پر اور سورج دیوتا متھرا (فارسی کا مہر یعنی دوست سنسکرت کا مترا) کو شمش پر قیاس کیا گیا۔ شمس کی طرح متھرا بھی نصرت، صداقت، شاہی جلال، عدل و حکمت کا مظہر ہے اور شمس کی طرح اسے بھی شفیع اور نجات دہندہ کے القاب دیئے گئے ہیں۔ اہلِ تحقیق کے خیال میں متھرا کی یہ صفات بعد میں جناب مسیح اور سکندریہ کے لوگس سے منسوب کر دی گئیں جس نے خدا سے منتقل ہو کر کائنات کو خلق کیا تھا۔ متھرا کے پجاری دن میں تین مرتبہ یعنی صبح، دوپہر، شام اس کی ستائش میں نماز پڑھتے تھے۔ کلیسائے روم میں بھی انہی اوقات میں دعائیں مانگی جاتی ہیں۔ متھرا کے پجاری سال میں ایک مرتبہ یوم الشمس یا متھرا کی پیدائش کا تہوار مناتے تھے۔ اس کا یوم میلاد ۲۵ دسمبر تھا۔ جب سورج زوال کی انتہا کو پہنچ کر دوبارہ شمال کی جانب لوٹتا ہے۔ عیسائیوں کا کرسمس اسی تہوار سے ماخوذ ہے۔ متھرا کے ماننے والے اس کے نام پر جو مقدس روٹی کھاتے تھے وہ عشائے ربانی کے نام سے رومن کیتھولک کلیسا میں موجود ہے۔ متھرا ایک چٹان سے پیدا ہوا تھا جسے دیکھ کر چرواہوں نے اس کے سامنے سر جھکا دیئے۔ تب اس نے مقدس بیل کی قربانی دی۔ جو لوگ بیل کے خون کا قشقہ لیں گے وہ موت کے بعد دوبارہ جی اٹھیں گے۔ یہی روایات عیسائیت میں بھی اختیار کر لی گئیں۔ عیسائیوں کا جناب مسیح کی پیدائش پر آسمان پر روشنی دیکھنا اور جناب مسیح کی عبادت کرنا متھرا مت ہی سے لیا گیا ہے۔

اوستا میں متھرا کو آسمانی روشنی کا نقیب کہا گیا ہے جو طلوعِ آفتاب سے پہلے پہاڑوں پر ظاہر ہوتا ہے۔ وہ دیوؤں یا خبیث روحوں کے خلاف جو تاریکی، بانجھ پن اور دروغ کی علامتیں ہیں جنگ کرتا ہے اور انہیں شکست دیتا ہے۔ وہ بیل کی قربانی کر کے اس کے بہتے ہوئے خون سے حیات کی قوتوں کو زندہ اور موت کے چنگل سے نجات دلاتا ہے۔ قیامت سے پہلے متھرا ایزدوانی بیل کو ذبح کرے گا جس سے اہرمن اور اس کے ساتھی بد روحیں شکست کھا جائیں گی اور حق و عدل کی فتح ہوگی۔ ہخامنشی خاندان کے دورِ حکومت میں متھرا کو رب الانواع کہتے تھے۔ روم کے سپاہی جو ایران پر حملہ آور ہوئے تھے واپسی پر اپنے ساتھ متھرا مت کی رسوم بھی لیتے گئے۔ قیصر ڈائو کلیشن کے زمانے میں روم میں متھرا مت کا رواج ہو گیا اور تین سو برس تک باقی

رہا۔ اگر قسطنطین نہ ہوتا تو آج مغرب کے لوگ متھرائیت کے پیرو ہوتے۔ پال ولی اور اس کے پیروؤں نے عوام میں عیسائیت کو مقبول بنانے کے لئے متھرائیت کے اکثر رسوم و شعائر اپنا لئے جن کا ذکر مختصراً ہو چکا ہے۔

سورج دیوتا ہونے کی حیثیت سے سرخ پوش متھرا کی بے شمار آنکھیں ہیں، اس کی نظروں میں کوئی بات اور کوئی فعل پوشیدہ نہیں رہ سکتا۔ اس کے ایک ہاتھ میں مشعل ہے اور دوسرے میں خنجر جس سے وہ بیل کو ذبح کرتا ہے جس کا خون اس کے پجاری اپنے آپ پر چھڑک لیتے ہیں اور اس سے لتھڑی ہوئی کھالیں اوڑھتے ہیں۔ وہ ہر شام کو دھرتی ماتا کی گود میں غائب ہو جاتا ہے اور صبح دم دوبارہ جنم لیتا ہے گویا مر کر جی اٹھا ہے۔ اس کے نام پر خزاں میں مہرگان کا تہوار منایا کرتے تھے۔

مجوسیوں کے خیال میں یمہ پہلا انسان تھا، اس کی بہن یمی اس کی زوجہ تھی۔ فارسی میں اسے یم یا جم اور پہلوی میں ییما کہتے تھے۔ وہ مُردوں کا بادشاہ سمجھا جاتا تھا اور ہندی آریاؤں کے یم کی طرح روحوں کا حساب کتاب لیتا تھا اور موت کا دیوتا تھا۔ ییما کے پیام بر کبوتر اور الو ہیں۔ اس کے پاس دو چار چشم کتے بھی رہتے ہیں۔ آج بھی پارسی مرتے ہوئے آدمی کے پاس چار چشم کتے لے جاتے ہیں تاکہ موت کے بعد بد روحیں اس کے جسم میں داخل نہ ہو جائیں۔ اور بلا وڈیا سگ دید بھی ان کا عقیدہ کی جاتی ہے۔

ایرانی دیو مالا میں اناہتا (عیلامی ناہید) حیات بخش دریاؤں کی پراسرار دیوی تھی جو بعد میں حسن و عشق اور دھرتی کی دیوی بن گئی۔ وہ ایک حسین و جمیل، کشیدہ قامت، پاک مشرب، توانا کنواری ہے۔ جسے پانی اور بارش کی دیوی بھی کہتے تھے۔ اناہتا وضع حمل میں عورت کی مدد کرتی ہے اور اس کی چھاتیوں میں دودھ بڑھاتی ہے۔ بوسہ، دمشق، بابل اور باختر میں ہخامنشی شہنشاہ ارتا خشتر دوم نے اس کے لئے معبد تعمیر کرائے اور دیوی کے پیکر تراش کر ان میں رکھے۔ ان پیکروں میں دوسری مورت کی دیویوں کی طرح اس کی چھاتیوں کا غیر معمولی ابھار دکھایا گیا تھا۔ اس کے سر پر سونے کا تاج، بر میں سنہری کمل تیروں کا جبہ، کانوں میں آویزے، گلے میں مالا اور طلائی کمر بند ہوتا تھا۔ اسے مہا دیوی کے طور پر پوجتے تھے۔ اور "خاتون" اور "معصومہ" کے القاب سے پکارتے تھے وہ شام کی انات، سمیری کی اننا، بابل کی عشتار اور حطیوں کی کبابا کی مثیل بن گئی اس کے معبدوں میں بھی دیویوں کی طرح پجاریوں اور دیوداسیوں میں جنسی ملاپ کی آزادی تھی۔ بعد میں وہ مجوسی دیوتاؤں کی تثلیث کی رکن بن گئی۔ اہورامزدا، متھرا، اناہتا۔ ہخامنشیوں کے

دور کی چیکانی تحریروں میں اسکا ذکر منتروں کے ساتھ آیا ہے۔ انا ہتا کا مت آج بھی اسلام کے بعض غالی فرقوں یزیدیہ وغیرہ اور زرتشتی کردوں میں باقی ہے۔ وہ اسکے نام پر خفیہ مجالس برپا کرتے ہیں جن میں جنسی اختلاط کی رخصت عام ہوتی ہے۔

ہندی آریائی ویدی مالا کا ذکر کرنے سے پہلے دراوڑوں کے ہڑپائی تمدن کا ذکر ضروری ہے کیونکہ ہندوؤں کے مذہب اور دیو مالا پر اس کے گہرے اثرات ثبت ہوئے ہیں۔ وادی سندھ میں موہن جو ڈرو اور ہڑپہ کے شہروں کی کھدائی سے پہلے جس کا آغاز سر جان مارشل نے ۱۹۲۴ء میں کیا عام طور سے سمجھا جاتا تھا کہ ہندوستان کے تہذیب و تمدن کا آغاز آریاؤں کی آمد (۲۰۰۰ — ۱۵۰۰ ق م) سے ہوتا تھا۔ ہڑپائی تمدن کے آثار نے اس نظریے کو باطل قرار دیا اور اس حقیقت کا انکشاف ہوا کہ آریاؤں کے تمدن پر ہڑپائی تمدن کی چھاپ موجود ہے۔ ہڑپائی تمدن عراق کے سمیری تمدن کا معاصر تھا اور دونوں میں تجارت کا ربط صدیوں تک قائم رہا۔ ہڑپائی تمدن کا نظام معاشرہ بڑی حد تک زرعی اور مادری تھا۔ اسلئے اس میں بھی دوسرے معاصر تمدنوں کی طرح مہامیا یا دھرتی دیوی اور لنگ یونی کی پوجا کی جاتی تھی۔ دھرتی دیوی اور لنگ کے بت ان شہروں کے کھنڈروں سے دستیاب ہوئے ہیں جو واضح طور پر زرخیزی کے رمز کی نشان دہی کرتے ہیں۔ یہ دھرتی دیوی سمیری اننا اور بابل کی عشتار کی یاد دلاتی ہے۔ موہن جو ڈرو کی معروف تراشی ہوئی مہر میں تین چہروں والے ایک دیوتا کی شبیہ ملی ہے۔ جو یوگی کے آسن میں بیٹھا ہے یعنی ایڑیاں جوڑ کر اور بازو پھیلا کر اسکے گرد حیوانات کھڑے ہیں اس کے ہاتھ میں ترشول ہے اور بازوؤں میں کڑے ہیں۔ یہ دیوتا ہندوؤں کے شیو کی اصل ہے جسے پشوپتی (جانوروں کا آقا) اور یوگیوں کا آقا سمجھا جاتا ہے۔ ہڑپہ میں مخروطی وضع کے چونے کے پتھر کے بنے ہوئے لنگ ملے ہیں۔ ہندوستان میں آج بھی ان کی حیات بخش صلاحیتوں کے باعث شیومت کے پجاری انہیں پوجتے ہیں۔ شیو لنگ کے ساتھ پتھر کے بنے ہوئے گول حلقے یونی کی علامتیں ہیں۔ دراوڑی مہروں پر کھدا ہوا سواستکا کا نشان بھی دکھائی دیتا ہے جو بعد میں ہندی آریاؤں، بودھوں اور جین ناستیوں کا نشان بن گیا۔ سواستکا اکثر طور پر سورج کی علامت ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ قدیم دراوڑ دھرتی دیوی کے ساتھ ساتھ سورج دیوتا کی پوجا بھی کرتے تھے۔ بعد میں وشنو کے نام سے اسے ہندوؤں نے اپنا لیا۔ کالی دیوی کا تعلق قدیم زمانے سے شیو کے ساتھ چلا آرہا ہے۔ حکایات بابت دراوڑ کالا بھجنگ بتایا جاتا ہے وہ کبھی شیو کی زوجہ اور کبھی دھرتی دیوی کے روپ میں

دکھائی دیتا ہے۔ دراوڑی مہروں پر گینڈوں اور سانڈوں اور بھینسوں کے نقوش کندہ کئے گئے ہیں جو بناوٹ کے لحاظ سے بڑے خوبصورت ہیں۔ ان میں بندر، ہاتھی، سانڈ، شیر، بارہ سنگا، گینڈے کے نقوش خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ ناگ لنگ جنسی جبلت کے اظہار اور حیات کی علامت سمجھا جاتا رہا ہے۔ ایک مہر پر دو سروں والا ناگ بھی دکھائی دیتا ہے۔ سانڈ شیو کا محبوب جانور بھی ہے اور زرخیزی اور باروری کا دیوتا بھی ہے۔ دراوڑی اہل مصر کی طرح گائے اور بیل کی پوجا بڑے ذوق و شوق سے کرتے تھے۔ دراوڑوں کا گایوں کا چرواہا کرشن دیوتا کے نام سے ہندو دیو مالا میں شامل ہو گیا۔ کرشن کا لغوی معنی ہے "کالا" لہٰذا بقول رادھا کرشنن گورے چٹے آریاؤں کا دیوتا نہیں ہو سکتا تھا جو دراوڑوں کو حقارت سے چپٹے ہوئے ناک والے سیاہ فام لنگ پجاری کہا کرتے تھے۔ اسی بنا پر کالی دیوی کو بھی دراوڑی دیو مالا کی یادگار سمجھا جاتا ہے۔ کالی دیوی بعد میں اما، چنڈی، شکتی، درگا وغیرہ کے ناموں کے ساتھ ہندو دیو مالا میں شامل کر لی گئی۔ یہ بات قابل غور ہے کہ کرشن کا نام ویدوں میں نہیں ملتا۔ اسی طرح منو نے اپنے شاستر میں وشنو اور شیو کا کہیں ذکر نہیں کیا۔ یہی امر ان کے غیر آریائی ہونے کا بڑا ثبوت ہے۔ بیساکھی، بسنت، ہولی، شوراتری، ناگ پنچمی وغیرہ کے مذہبی تہوار خالصتاً دراوڑوں کی یادگار ہیں جن کا معاشرہ زرعی تھا۔ یہ کوہستانی آریائی چرواہوں کے تہوار نہیں ہو سکتے تھے۔ بیساکھی کے میلے میں آج بھی کالا لنگ نچاتے ہیں، جو لنگ کی علامت ہے۔ ہولیکا ایک دلکشی کی چیز شیو کے ہاتھوں قتل ہونے والی شخصیت تھی قدیم دراوڑوں کی دیوی اسکا تہوار ہولی کے نام سے مناتے ہیں۔ شوراتری کا تہوار ماگھ کے دوسرے پندرہواڑے میں منایا جاتا ہے اس تقریب پر برت رکھتے ہیں اور شیو لنگ کی پوجا کرتے ہیں۔

آریائی قبائل جو گھوڑے پال چرواہے تھے ایران سے پنجاب اور ہندوستان میں وارد ہوئے۔ اپنے ایرانی بھائیوں سے جدا ہونے اور ہندوستان میں داخل ہونے سے پہلے وہ صدیوں تک عراق میں مقیم رہے جہاں سامیوں میں ستارہ پرستی کا رواج تھا چنانچہ دوسرے آریائی قبائل ایرانیوں، یونانیوں اور رومیوں کی طرح وہ بھی بابلی دیو مالا سے متاثر ہوئے جیسا کہ ان کے ہفتے کے دنوں سے ثابت ہے جو دیوتاؤں کے ناموں پر رکھے گئے ہیں۔ سوم (چاند دیوتا) بابلی ننار، اشتری بن، منگل (ایرانی بہرام) یونانی ایریس، رومی مارز۔ بدھ (ایرانی تیر) یونانی ہرمیس، بابلی عطارد، شکر (بابلی عشتار) زہرہ، ایرانی اناہیتا، یونانی افرودائتی، سنیچر (ایرانی کیوان) رومی سیٹرن، آدیت (رومی اپالو)، بابلی شمش، ایرانی آفتاب، یونانی اپالو، ہندی آریاؤں کا آسمانی دیوتا دیوس پتر یا ورونا تھا جس پر بعد میں اندر دیوتا غالب آگیا اور ان کا خداوند ہوا

بن گیا ۔ اندرا سنسکرت کا لفظ نہیں ہے ۔ ابتدا میں اسکا نام سندرا تھا جو کسی غیر آریائی زبان سے لیا گیا تھا ۔ ایک قیاس کے مطابق سندرا دریائے سندھ کا بگڑا ہوا نام ہے ۔ رگ وید کے منتر پنجاب ہی میں اکٹھے کئے گئے تھے ان میں کل ۳۳ دیوتاؤں اور دیویوں کا ذکر کیا گیا ہے ۔ ان میں اندر ، اگنی ، وایو ، سوریہ ، سوم کے لئے سب سے زیادہ بھجن لکھے ہیں ۔ پرتھوی دھرتی کی دیوی ہے ایک اور دیوی اوشا ہے جو صبح کی دیوی ہے اور سورج کی دلہن ہے ۔ اندرانی یا شچی اندر کی زوجہ ہے یہ سب دیوتا دیویاں میرو کے پہاڑ میں قیام کرتے ہیں یہ فرضی پہاڑ کوہ ہمالیہ کے شمال میں بتایا جاتا ہے ۔

اندر کے ہاتھ میں وجر (رعد) کا ہتھیار ہے جس سے وہ بادلوں کو گھیر کر لاتا ہے اور مینہ برساتا ہے ۔ اسکا صدر مقام بہشت اندر لوک ہے جہاں وہ سوم[1] رس پی کر مست و بیخود پڑا رہتا ہے ۔ اندر لوک میں چاروں طرف رنگ برنگ کے پھولوں سے لدی ہوئی بیلیں اور سرسبز پیڑ لہلہا رہے ہیں ۔ اس میں سونے چاندی کے محل ہیں جہاں خوبصورت گندھرو (نو عمر خوبصورت لڑکے) جادو نگاہ اپسرائیں ہیں ۔ گندھرو دلکش تانیں اڑاتے ہیں اور ان کی گتوں پر حسین اپسرائیں نہایت ترغیب آمیز اور ہوس پرور انداز میں آنکھیں مٹکا مٹکا کر اور کولہے ہلا ہلا کر ناچتی ہیں یا دیوراج اندر اور اسکے محبوب سورماؤں کو رجھاتی رہتی ہیں ۔ اپسراؤں کی تعداد ۳۴ ہے ان کے دو گروہ ہیں ۔ دیویکا اور لوکیکا ۔ دیویکا کی تعداد دس ہے اور وہ صرف دیوتاؤں کا جی بہلاتی ہیں ۔ باقی لوکیکا ہیں جو اندر کے سورماؤں کے حسن ذوق کی پرورش کرتی ہیں ۔ جب کوئی تپسوی اپنی ریاضت کے بل پر دیوتاؤں کی حکومت پر قبضہ کرنا چاہتا ہے تو کوئی اپسرا اس کے پاس بھیج دی جاتی ہے جو اسے لبھا کر تپ جپ سے باز رکھتی ہے ۔ مینکا ، گھرتاچی ، رمبھا وغیرہ کا ذکر پرانوں میں آیا ہے ۔ کالیداس کے ایک ناٹک کی ہیروئن شکنتلا مینکا کے بطن سے تھی ۔ اندر کے القاب میں دیوپتی (دیوتاؤں کا آقا) ، مہیندر (بڑا اندر) ، میگھ واہن (بادلوں کا شہسوار) ، سورگ پتی (بہشت کا آقا) ۔

دوسرا بڑا دیوتا اگنی (آگ) ہے جسے ایرانی آذر کہتے ہیں ۔ سب سے زیادہ منتر رگ وید میں اگنی ہی کی مناجات میں ہیں ۔ اس کے القاب میں وہنی (جو ہوم یا سوختنی قربانی قبول کرتا ہے) ، دھوم کیتو (دھوئیں کے نشان والا) ، چھاگ رتھ (بکرے کا سوار) ، سپت جیہا (سات زبانوں والا) یہاں شعلوں کو زبانیں کہا گیا ہے ۔ اگنی کے نام پر ہوم کیا جاتا ہے یعنی کھلے میدان میں کنڈ (گڑھا) بنا

---

[1] سوم کی محبوبہ کا نام روہنی تھا ۔

کنڈ میں آگ جلا اور اس پر گھی، دودھ، جاگنی اور خوشبودار لکڑیاں ڈال کر منتر پڑھتا۔ ابتدائی دور میں ہوم آریاؤں کی سب سے بڑی عبادت تھی۔ آج کل کے آریہ سماجی بھی ہوم کرتے ہیں۔ انہوں نے بھی ضروری قرار دیا ہے کہ برہمن بھی ہوم منتر پڑھے۔

رگ وید میں سوریہ کے کئی ناموں کا ذکر ملتا ہے۔ وشنو، سُوریہ (پروردگار)، ہوتری (حیات بخش)، متر (دوست)، یا سورج کی نفع بخش توانائی، پوشن (خوشحال کرنے والا)، وشنو کے متعدد القاب ہیں، دنکر (دن کرنے والا)، بھاسکر (روشنی کا خالق)، پرسُوت (درخشاں)، گرہ پتی (ستاروں کا آقا)، کرم ساکشی (لوگوں کے اعمال کا شاہد)، آنند، پرسُوت (طلوع ہونے والا)، ہوتری (ڈوبنے والا)، برہمن طلوع و غروب آفتاب کے وقت خاص طور پر سورج دیوتا کی مناجات میں گایتری منتر پڑھتے ہیں جسے سوریہ نمسکار کہا جاتا ہے رگ وید کا مقدس منتر یہی ہے۔ اس کے الفاظ ہیں۔

"ہم دائی آفتاب کے درخشندہ جلال پر جو ہماری عقل کو متحرک کرتا ہے ہم تعمق کرتے ہیں۔"

شت پتھ برہمن میں لکھا ہے کہ اگر برہمن یہ منتر نہ پڑھیں تو سورج طلوع نہ ہو۔

وایو ہوا کا دیوتا ہے اور اندر کا خاص رفیق ہے۔ اسکے القاب میں خوشبوؤں کا حامل اور سدا رواں دواں ہے۔ انیلا (دانش)، مرت (ہوا جو زندگی کے لئے ضروری ہے) اور وات بھی کہتے تھے۔ رودر طوفانوں کا دیوتا ہے جو بعد میں شیو بن گیا۔ یم (ایرانیوں کا جم یا یما) مُردوں کا خداوند ہے جو موت کے بعد مردے سے حساب کتاب لیتا ہے۔ اس کے کارندوں کو یم دوت کہتے ہیں۔ انکے پاس دو کتے ہیں۔ سوم (ایران کا ہوم) شراب اور نشے کا دیوتا ہے جو چاند دیوتا کی حیثیت سے زیادہ مقبول ہوا۔ اسے چندرا بھی کہتے ہیں۔ اسے جنگلوں کا راجہ اور کھیتوں کا محافظ سمجھتے تھے جس کے گھٹنے اور بڑھنے سے فصلیں متاثر ہوتی رہتی ہیں۔ عورتوں کے نام پر بھی اسکا اثر ہے۔ کاٹھیاواڑ کا شاندار مندر اسی کے نام پر بنایا گیا تھا۔ جہاں اس کا لنگ معلق تھا۔ عورتیں سوم ناتھ (چاند، آقا) کے اس مندر پر جا کر اولاد نرینہ مانگا کرتی تھیں۔ محمود غزنوی نے گرز مار کر سے پاش پاش کر دیا۔ تقسیم ہند کے بعد اسے دوبارہ اپنی اصل صورت میں تعمیر کرایا گیا ہے۔ رگ وید میں دریائے سندھ اور دریائے

ٹھ کنڈ سا داہ

سرسوتی کے لئے بھی مستعمل ہیں ۔ دریائے سندھ کو وہ لوگ بھی مقدس مانتے تھے ۔ آج بھی اسے دریا شاہ کہہ کر اس کی عظمت کی جاتی ہے ایرانیوں نے سندھو کو اپنے لہجے میں ہندو کہا جسے یونانیوں نے انڈس بنا لیا ۔ اور اس طرح سارے ملک کا نام انڈیا رکھا گیا ۔ چھوٹے موٹے دیوتاؤں میں پرجنیہ ہے جس کے ہاتھ میں برق و رعد ، بارش مینہ ، درختوں اور حیوانات کی تخلیق اور نمو ہے ۔ وہ بادل کے تھنوں کو دوہا کرتا ہے ۔ مرت طوفان کے دیوتا ہیں ۔ اور تعداد میں ایک سو اسی ہیں ۔ انہیں رودر کے بیٹے کہا جاتا ہے ۔ توشتری یا وشوا کرم دیوتاؤں کا معمار ہے جو اندر کے لئے رعد کے تیر بناتا ہے ۔ اس کے شاگرد ربھو ہیں جنہوں نے اندر کا شاندار رتھ بنایا تھا واچ لفظ کا دیوتا ہے ۔ ان دیوتاؤں اور دیویوں کے ساتھ کئی کہانیاں منسوب ہیں ۔ ششیش یا اننت ناگ کے پھن پر دنیا قائم ہے ۔ وہ سانپوں کا بادشاہ ہے ۔ برہس پتی دیوتاؤں کا استاد ہے جس کی زوجہ تارا کو سوم (چاند دیوتا) لے بھاگا تھا ۔ پروفیسر راتھ نے یم اور یمی (اس کی زوجہ) کو ہندوؤں کا آدم اور حوا کہا ہے ۔ یمی اس کی توام بہن ہے ۔ بعد میں یم کے کئی نام مشہور ہوئے ۔ دھرم راج (صداقت کا راجہ) پتری پتی (باپوں کا آقا) سمن (برابر کرنے والا) کال (زمانہ) ڈنڈا دھر (عصا بردار) شرادھ دیو (شرادھ کی رسوم کا دیوتا) انتک (جو زندگی کا خاتمہ کر دیتا ہے) ہندو اس کی رضا میں بڑا غلو کرتے رہے ہیں ۔

ویدک دور کے خاتمے پر ہندوؤں کے یہاں دو تصورات ابھر کر سامنے آئے (۱) شخصی خدا کا تصور (۲) ترمورتی کی تثلیث جس کی نمود گپتا راجاؤں کے دور میں برہمن مت کے احیاء سے وابستہ ہے ۔ شخصی خدا کا ایشور یا پرمیشور کا نام دیا گیا جو نیکی کا خالق اور سراپا خیر ہے ۔ اس کا مخالف مارا ہے جو بدی کا خالق اور سراپا شر ہے ۔ مارا ہندوؤں کا ابلیس یا شیطان ہے جو نیک لوگوں کو راہ راست سے ہٹانے کا جتن کرتا رہتا ہے ۔ مثلاً جب گوتم بدھ بودھی کے درخت کے نیچے مراقبے میں بیٹھا تو اسے گمراہ کرنے کے لئے مارا نے نازک اندام پری چہرہ برہنہ اندام عورتیں بھیجیں جو گوتم کے سامنے نہایت ہوسناک اور ترغیب آمیز پیرائے میں ناچنے لگیں ۔ یہ تدبیر کارگر نہ ہوئی تو مارا نے بدروحیں بھیجیں جو شیروں اور چیتوں کے روپ میں دہاڑتی ہوئی بدھ پر لپکیں تاکہ وہ خوفزدہ ہو کر بھاگ جائے برہما ، وشنو اور شیو ترمورتی (ایک دھڑ پر تین چہرے) کے رکن ہیں ۔ برہما کو کائنات کا خالق ، وشنو کو پروردگار اور شیو کو فنا کر دینے والا مانتے ہیں ۔ روایت کے مطابق برہما مصر کے رع دیوتا کے مانند ایک سنہرے انڈے سے نکلا تھا ۔ دوسری روایت یہ

جیسے کہ اس نے کنول کے پھول سے جنم لیا۔ جب سے کنول کا پھول پیدائش کی علامت بن گیا ہے۔ بعض کتابوں میں لکھا ہے کہ برہم خنزیر کی شکل میں ظاہر ہوا۔ اس نے سمندروں کے گہراؤ سے زمین کو اپنے دانتوں سے کھینچ کر باہر نکالا اور پھر انسان کو خلق کیا بارہ مولا (بارہ یعنی خنزیر) کشمیر میں اسکا شاندار معبد ہے جہاں اس کے بت کو خنزیر کی صورت میں تراشا گیا ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ بت اسکا اوتار ہے۔ برہما کی بیٹی سرسوتی اس کی زوجہ بھی ہے بعد میں اس نے گائیتری سے بیاہ کر لیا۔ وشنو پران میں لکھا ہے کہ گندھرو برہما کے بیٹے ہیں جن سے گندھرو بیاہ یادگار ہے۔ سندھیا برہما کی بیٹی تھی برہما نے اس کی عصمت دری کرنے کی کوشش کی تو شیو نے سندھیا کو اپنے باپ سے بچا لیا۔ برہما کا سب سے بڑا دشمن وشنو کا ہے جو قدم قدم پر برہما کی مخالفت کرتا ہے۔ مشہور ہے برہما نے گھوڑا بنایا تو وشنو کی ماننے سے بگاڑ کر گدھا بنا دیا۔ برہما نے گائے بنائی تو وشنو کی ماننے بھینس بنا دی۔ ہندو دیو مالا میں برہما کو جاپتا (زرگھوں کا باپ) مہیش وشنو اور شیو کے مقابلے میں اس کی حیثیت ہمیشہ ثانوی رہی ہے۔ ہندوستان بھر میں اس کے صرف دو تیرتھ ہیں جن میں سے ایک پشکر جھیل ہے جو اجمیر کے نواح میں ہے۔ کہتے ہیں کہ خواہ آدمی دنیا بھر کے تیرتھوں پر جائے اگر وہ پشکر میں نہیں نہائے گا تو اسکا کوئی کام سپھل نہ ہوگا۔ برہما کے تصور میں اس کی پوجا کی جاتی ہے جیسے دانش و خرد کی علامت مانتے ہیں۔ بطخ برہما کی سواری ہے برہما کے ذہن سے کئی بیٹوں نے جنم لیا۔ انہیں پرجاپتی (خلقت کے آقا) کہتے ہیں۔ برہما کا مقدس درخت ڈھاک ہے۔ شیو کا لفظی معنی ہے "مبارک"۔ وہ ہمالیہ کے قریب اوتر میں یا پہاڑوں کے چشمے سے ظاہر ہوا تھا۔ وہ ویدوں کے دیوتا رودر کا مثیل بن گیا اگرچہ اصلاً وہ دراوڑی مذہب سے یادگار ہے۔ شیو جنات و مادیوں کا آقا ہے یعنی بھیانک ہے، پشو پتی (حیوانات کا باپ) ہے نیل کنٹھ (نیلے گلے والا) ہے ایک دفعہ زہر پینے سے اسکا گلا نیلا پڑ گیا تھا۔ اسکی تیسری آنکھ اس کے ماتھے میں ہے۔ وہ بھوتیشور (بھوتوں اور بدروحوں کا دیوتا) گریشا (پہاڑ والا) چندر شیکھر (چاند کی کلغی والا) بھی اس کے القاب ہیں۔ بنارس اسکی پوجا کا بڑا مرکز تھا جہاں کاشیشور کا مندر اسکا معبد تھا اورنگ زیب نے اسے گرا کر اسکی جگہ مسجد تعمیر کر دی۔ شیو کو اردھ ناری (آدھا مرد آدھی عورت) کہتے ہیں۔ اسکا مجسمہ اجنتا (دہلی کے قریب) غار میں ہے۔ اسکی سب سے بڑی زیارت گاہ امرناتھ (کشمیر) میں ہے جہاں ہندو برف کی لاٹ کو شیولنگ سمجھ کر اس کی پوجا کرتے ہیں اور مرادیں مانگتے ہیں۔ شیو کے پجاری لنگ اور بیل کو مقدس مان کر انہیں پوجتے ہیں۔ اس کے

نام پر جو سانڈ کھلے چھوڑ دیے جاتے ہیں وہ لوگوں کی کھیتیوں میں کھلے چرتے پھرتے ہیں ۔ انہیں کوئی روک نہیں سکتا ۔ شیو کے مقدس بیل کا نام نندی ہے جس کی مورتیاں بنا کر مندروں میں رکھی جاتی ہیں کسی زمانے میں شیو کے مندر میں جوان عورتیں اس کی زوجیت میں دی جاتی تھیں جن سے پجاری جنسی ملاپ کرتے تھے ۔ شیو مت والوں کو لنگا دھاری کہتے ہیں جو سیاہ پتھر کا بنا ہوا شیو لنگ بنوا کر گلے میں ڈالتے ہیں اور ماتھے پر افقی قشقہ لگاتے ہیں ۔ شیو کا مقدس درخت برگد ہے موجودہ صورت میں لنگ پوجا کا رواج شنکر اچاریہ نے دیا اور شیو کو لنگ کی صورت میں پوجنے کی دعوت دی ۔ شیو کی زوجہ کو کئی نام دیئے گئے ہیں (۱) کالی دیوی نہایت خونخوار ہے اور اس کے معبد میں انسانی قربانی دی جاتی تھی آج کل کلکتہ میں اس کا بڑا معبد ہے جہاں ہر روز بکریاں قربان کی جاتی ہیں جن کا خون اولاد کی خواہش مند عورتیں چاٹتی ہیں جیسا کہ ذکر ہو چکا ہے ۔ یہ دراوڑی ماتا یا دھرتی دیوی ہے ۔ اس کی شکل نہایت خوفناک بنائی جاتی ہے ۔ گلے میں کھوپڑیوں کی مالا ہے اور کئی ہاتھ ہیں باہر نکلی ہوئی زبان لال ہے گویا خون ٹپک رہا ہے (۲) درگا یہ جنگ و جدال کی دیوی ہے ۔ (۳) چنڈی (۴) گوری (روشن) (۵) شکتی (قوت) ۔ جسے شاکت پوجتے ہیں ۔ خالق کی حیثیت سے شیو نے اپنی ذات کے نسوانی پہلو سے شکتی کو پیدا کیا جو مجسم ہو کر اس کی زوجہ بنی ۔ وہ شیو سے جدا نہیں بلکہ تخلیق و تخریب کے عمل میں اس کی برابر کی شریک ہے برہمنوں نے ماتا دیوی کی پوجا کا جواز شکتی کی صورت میں پیش کیا جو شیو کی شکتی کی صورت میں حیات اور موت کے اتحاد کی تمثیل بن گئی ۔ بلند تر سطح پر شکتی کو ازلی تخلیقی اصول (پرکرتی) قرار دیا گیا جو ازلی مذکر اصول (پرشا) کے ساتھ واصل ہو کر دیوتاؤں اور کائنات کی تکوین و تخلیق کا سبب بن گئی ۔ اسے ستی بھی کہتے ہیں ۔ جب اس کے باپ نے شیو کا اپمان کیا تو وہ چتا پر جل مری تھی ۔ پھر پاروتی کا روپ دھار کر دوبارہ پیدا ہوئی اور یزدانی دانش و خرد کا پیکر بن گئی ۔ مہاکالی صورت میں وہ رودر دیوتا کی بہن ہے ۔ اس کا ایک روپ پاروتی کا ہے جو ہمالیہ کی بیٹی ہے شیو نے ایک دفعہ اسے کالی ہونے کا طعنہ دیا تو اس نے اس قدر تپ کیا کہ اس کے چہرے کا رنگ سنہرا ہو گیا ۔ چیچک کی دیوی کی حیثیت سے اسے شیتلا یا ماتا (ہمارے دیہات میں چیچک کو ماتا کہا جاتا ہے) کہتے ہیں جو چیچک کے مریض کی خوفناک صورت میں نمودار ہوتی ہے ۔ اس کا سب سے مشہور مندر کانگڑہ میں تھا جہاں یاتری اپنی زبانیں کاٹ کر اس پر چڑھا جاتے تھے ۔ کہتے ہیں کہ ان کی زبانیں پھر سے اصلی حالت میں آ جاتی تھیں ۔ دوسرا مندر تھانیسر میں ہے جہاں دو

کے جب ٹکڑے کئے گئے تو اس کا مخرج گرا تھا ۔

لنگ پوجا اور شکتی پوجا لوگوں میں عام رواج ہے۔ اسے کے کارسوامی کے بقول ہندومت کے جو بڑے بڑے عناصر دراوڑی سماج سے لئے گئے ان میں شیو لنگ، شکتی پوجا اور بھگتی مارگ خاص طور پر اہم ہیں۔ ویدک دور کے اختتام اور ترمورتی کی پوجا کی ترویج کے ساتھ بھاسیا یا بھاو دیوی کی پوجا بڑی مقبول ہو گئی اور تنتر مت کی صورت میں ہر کہیں پھیل گئی۔ تنتر مت باسٹھ رسالوں پر مشتمل ہے جن میں شکتی پوجا کی تفصیلات دی گئی ہیں جنہیں کولا دھرم کہتے ہیں۔ کولا اپاسک اور شاکت (شکتی کے پجاری) خفیہ مجالس برپا کرتے ہیں۔ جن میں ہر ذات کے لوگ شامل ہوتے ہیں۔ کپالک انتہا پسند مشرک ہیں اور ان کا بھیرو چکر (بھیرون بھی کالی دیوی کا ایک نام ہے) پرانے زمانے سے ایسا ہی شراب اور بھنا ہوا گوشت لایا جاتا ہے۔ عورتیں مرد شراب پیتے ہیں گوشت کھاتے ہیں پھر ایک برہنہ لڑکی کی یونی کی پوجا دیوی کے نام پر کی جاتی ہے اور ساری رات فسق و فجور میں گزارتے ہیں۔ شاکتوں کے پنچ تتو ہیں مدھیہ (شراب)، ماسس (گوشت)، متسی (مچھلی)، مدرا (غلہ)، میتھنا (جنسی ملاپ)۔ شاکت کسی رات کو ان اشیاء کا اہتمام کرتے ہیں۔ وہ دائرے یا چکر (بیرا) میں بیٹھ جاتے ہیں پہلے شراب کا دور چلتا ہے۔ پھر بھنی ہوئی مچھلی کھائی جاتی ہے۔ اس کے بعد بھنے ہوئے دانے کھاتے ہیں اور پھر جنسی بے راہروی کے مظاہرے کرتے ہیں۔ بیرا میں ایک جوان لڑکی کو برہنہ کھڑا کیا جاتا ہے اور اسے شکتی کی شکل بنا کر اس کی پوجا کی جاتی ہے۔ چولی مارگ بھی ان کا ایک فرقہ ہے۔ یہ لوگ راتوں کو مل بیٹھتے ہیں۔ عورتوں کی چولیاں ایک جگہ رکھ دی جاتی ہیں اور پھر جس کے ہاتھ میں جس عورت کی چولی آ جائے وہ اس سے جنسی ملاپ کرتا ہے خواہ وہ اس کی ماں بہن یا بیٹی ہی کیوں نہ ہو۔

لنگ یونی کے آپس میں جڑے ہوئے مجسموں کو کنڈی کہتے ہیں۔ کنڈی میں لنگ یونی کے دائرے میں نصب ہوتا ہے اس پر پروہت تیل گراتے ہیں جو مادہ منویہ کی علامت ہے پھول چڑھاتے ہیں اور پانی ڈالتے ہیں تاکہ اس کی حرارت اور جوش رفع ہو جائے۔ کھجوراہو بھونیشور، جگن ناتھ اور کونارک کے مندروں میں اور ان کی دیواروں پر میتھنا (جنسی ملاپ) کے سینکڑوں آسن تراشے گئے ہیں۔ ہندو ان کی تشریح پرش اور پرکرتی کے اتحاد کے حوالے سے کرتے ہیں لیکن اہل مغرب کا خیال ہے کہ کسی زمانے میں ان مندروں میں دیو داسیاں رکھی جاتی تھیں اور یاتری ان سے اختلاط کرنے آتے تھے جنسی ملاپ کے یہ آسن انہیں ترغیب دلانے کے لئے تراشے

گئے تھے ۔ یاد رہے کہ آج بھی رامیشورم اور کونارک کے معبدوں میں دیوداسیاں موجود ہیں ۔ اور پروہتوں نے عصمت فروشی کا دھندا کر رہی ہیں ۔ دکن میں جابجا سڑکوں پر پتھر کے تراشے ہوئے لنگ اور ارگھا یونی (لنگوٹی نما برتن) سے لگے دکھائی دیتے ہیں جنکی پوجا پاٹ آرتی اور ان پر چڑھاوا کی جاتی ہے ۔ جو لوگ صرف لنگ کی پوجا کرتے ہیں انہیں لنگایت کہا جاتا ہے وہ اپنے مردے دفن کرتے ہیں اور تناسخ کو نہیں مانتے ۔ ان کے ایک فرقے ویر شیوا ذات پات کی تمیز کے قائل نہیں ہیں اور کہتے ہیں کہ لنگ نے سبکو ایک جیسا پیدا کیا ہے لیکن جنوبی ایلیفنٹا کے پجاری یونی کو لنگ سے برتر جانتے ہیں اور صرف اسی کی پوجا کرتے ہیں ۔

ترمورتی کا تیسرا رکن وشنو سورج دیوتا ہے جو کائنات اور نوع انسان کا محافظ ہے ۔ اس کے القاب میں جگن ناتھ (بہشت کا مالک) کیسو (خوبصورت زلفوں والا) چناون (جسے لوگ پوجتے ہیں) ہری (نجات دلانے والا) اننت (غیر فانی) داسودر (رسی میں بندھا ہوا) مکند (رہا کرنے والا) پرشوتم (برتر روح) تریگا نیشور (قربانی کا آقا) ۔ لکشمی یا سری اس کی زوجہ ہے جس کے القاب ہیں پدما (کنول) چنچل (شوخ) لوک ماتا (دنیا کی ماں) ۔ وشنو بھگتوں کو نام دھاری کہتے ہیں جو اپنے ماتھے پر عمودی تلک لگاتے ہیں ۔ اور لنگ دھاریوں کی طرح جنسی بے راہ روی کے لئے بدنام ہیں ۔ کام دیو عشق کا دیوتا وشنو کا بیٹا ہے ۔ اسکے القاب ہیں منمتھ (دلوں میں گڑبڑ کرنے والا) مارا (زخم لگانے والا) مدن (پیار کے نشے میں سرشار) پیراؤں کا مالک ۔ ابھی روپ (خوبصورت) دیپک (شعلہ زن) کشتو (خوش) دھرودیپ (پیار کا چراغ) مرمر (چمکنے والی آگ) راگ ورنت (جھسانے قہر) روپ استر (حسن کا ہتھیار) ہتھو ڈاگ ، پشپ دھنو (پھولوں کی کمان والا) اسکی زوجہ رتی پیار کی علامت ہے ۔ کام دیو ایک کمان اٹھائے پھرتا ہے جو گنے کی بنی ہے ۔ اس کمان کی تانت شہد کی مکھیوں کی ہے ۔ کوئی دیوتا یا انسان اس کے تیروں سے محفوظ نہیں ہے ایک دفعہ اس نے شیو دیوتا پر بھی اپنا پھولوں والا بان چلا دیا ۔ شیو غضبناک ہو گئے ماتھے والی تیسری آنکھ سے دیکھا جس سے کام دیو جل کر بھسم ہو گیا ۔ اس کے بعد وہ دکھائی نہیں دیتا اور اسکا نام اننگ (جسم کے بغیر) پڑ گیا ۔ طوطا اس کی سواری ہے ۔ طوطے کو جنسی جذبے کے ہیجان کی علامت مانتے ہیں چنانچہ بیاہ پر جو بیدی بنائی جاتی ہے اس میں لکڑی کے بنے ہوئے طوطے کے مجسمے جڑے جاتے ہیں ۔

ٹ اس کے دوسرے نام ہیں کامی ، کام کلا ، مایاوتی (دھوکہ دینے والی) کیلیکا ، مرنیہائی

وشنو مت والے ناگ، بندر اور عقاب (گروڑ) کو خاص اہتمام سے پوجتے ہیں۔ ملا محسن فانی نے وشنوؤں کے تین فرقوں کا ذکر کیا ہے (۱) رامانندی: یہ ٹیکا مثلث صورت کا لگاتے ہیں۔ (۲) پربیاسی: ان کا ٹیکا لچھن کی طرح کا ہوتا ہے۔ (۳) رادھا بلبھی: یہ لوگ اپنی عورتیں اپنے گرو کے پاس لے جاتے ہیں اور اس میں ننگ و عار محسوس نہیں کرتے۔

گیا میں وشنو پد مندر ہے جہاں وشنو دیوتا کے پاؤں کا نشان کھدا ہوا ہے۔ ہر سال ہزاروں وشنو پجاری وہاں جا کر اس قدم کی پوجا کرتے ہیں۔ وشنو کا مقدس درخت پیپل ہے جسے دیوتا سمجھ کر پوجا جاتا ہے۔ اولاد کی خواہشمند عورتیں اس کی ٹہنیوں سے رنگ برنگ کے دھاگے لپیٹ کر دعائیں مانگتی ہیں اور اسکا پرکرما (طواف) کرتی ہیں۔ وشنو پجاری تلسی کی بھی پوجا کرتے ہیں۔ ہر صبح اس کے گرد گئو کے گوبر سے لیپ کر کے جگہ صاف کی جاتی ہے۔ رات کو اسکے سامنے چراغ جلاتے ہیں اور آرتی اتارتے ہیں مرنے والے کے سرہانے تلسی کی ٹہنی رکھی جاتی ہے تاکہ اس پر نزع کا وقت آسان ہو جائے۔

دنیا میں سچائی اور دھرم کا بول بالا کرنے کے لئے وقتاً فوقتاً وشنو اوتار کی صورت میں آتا ہے۔ اس کے سب سے مشہور اوتار کرشن اور رام ہیں جن کی پوجا آج کل کروڑوں سناتن دھرمی کرتے ہیں۔ آخری اوتار کلکی سفید گھوڑے پر شمشیر بدست نمودار ہوگا۔ جو دنیا کو بدی سے پاک کر کے ہندو دھرم کو فتح یاب کرے گا۔ کرشن اور رام کے سوانح اور قصے بالمیک پرانوں میں بیان کئے گئے ہیں بھاگوت پران میں کرشن کی داستانیں تفصیل سے بیان کی گئی ہیں۔ تمام پران منظوم ہیں۔ آج کل کے ہندوؤں میں پران پڑھے جاتے ہیں۔ ویدوں کا مطالعہ آریا سماج والوں تک محدود ہو کر رہ گیا ہے جن کی تعداد سناتن دھرم والوں کے سامنے انتہائی قلیل ہے۔ پرانوں میں لکھا ہے کہ دیوتاؤں کی پوجا اور مذہبی رسوم ادا کرنا ہر طرح کی نیکی سے بہتر ہے۔ اس عقیدے نے ہندوؤں کے اخلاق پست کر دینے میں کیونکہ جو مذہب پوجا پاٹ کی رسوم تک محدود ہو کر رہ جائے اسکے پیرو اخلاق حسنہ سے عاری ہو جاتے ہیں

کرشن دیوکی کا بیٹا تھا۔ جو واسودیو کی زوجہ تھی۔ کنس متھرا کا راجہ بنا تو اس نے اپنے باپ سے راج پاٹ چھین لیا۔ اور نومولود کرشن کو ہلاک کرنے کے درپے ہوا۔

ایک گوالا نند اکرشن کو گوکل لے گیا۔ جہاں اُس نے گوالوں میں پرورش پائی جوان ہو کر وہ گوالوں کی عورتوں یا گوپیوں سے عشق بازی کرنے لگا۔ اس کی بنسری کی ٹیر سن کر عورتیں بے اختیار اسکے پاس کھنچی چلی آتی تھیں۔ ایک گوالے ائن گھوش کی زوجہ رادھا کے ساتھ کرشن کا معاشقہ شاعری اور مصوری کا خوبصورت موضوع بن گیا۔ بھگتی تحریک والوں نے رادھا کو آتما قرار دیا۔ جو برہمن یا کرشن کے ساتھ واصل ہونے کے لئے بے قرار رہتی ہے۔ کرشن پوجا واضح طور پر دراوڑوں سے یادگار ہے جو گائے اور بیل کو زرخیزی اور افزائش کی علامتیں مانتے تھے۔ گؤوں کے چرواہے کرشن کو دراوڑوں کا دیوتا تسلیم کر لیا گیا ہے۔ کرشن کا آریائی سروپ ہمیں مہابھارت میں دکھائی دیتا ہے جہاں وہ ارجن کا رتھ بان ہے اور ارجن کو اپنے عزیزوں کے خلاف لڑنے کی ترغیب دیتا ہے۔ اس اپدیش کو گیتا کا نام دیا گیا ہے۔ بھگوت پران میں کرشن سے متعلق عجیب و غریب مافوق الطبع قصے بیان کئے گئے ہیں۔ رام راجہ دسرتھ والی ایودھیا کے گھر پیدا ہوا جس نے اس کی سوتیلی ماں کے کہنے پر اسے ملک بدر کر دیا۔ رام کی زوجہ سیتا بن باس میں اس کے ساتھ تھی۔ سیتا کو لنکا کا راکھشس راجہ راون اغوا کر کے لے گیا جس پر جنگ چھڑ گئی۔ راون نے شکست کھائی اور مارا گیا۔ رام اپنی فوج کو ایک بہت بڑے ومان (ہوائی جہاز) میں بٹھا کر ایودھیا لے آیا۔ جہاں اس نے صدیوں تک رام راجیہ قائم رکھا۔ رامائن کا پہلا باب ادب کا شاہکار ہے لیکن بن باس کے بعد اس میں بھی مافوق الطبع قصوں کی بھرمار ہو گئی ہے۔ ایودھیا واپس آنے پر رام نے سیتا کے چال چلن پر شک کا اظہار کیا تو وہ محل کو چھوڑ کر چلی گئی۔ سیتا کا تعلق دھرتی دیوی کے ساتھ ہے۔ جس میں سے وہ راجہ جنک کے ہل چلانے کے ساتھ برآمد ہوئی تھی۔ آخر تنگ آ کر سیتا دھرتی کے سینے میں سما گئی۔ رام کے سوانح میں ایک واقعہ بڑا حیرت انگیز اور افسوسناک ہے۔ ایک دن اسے بتایا گیا کہ ایک شودر جپ تپ کرتا ہے اس پر رام غضب ناک ہو گیا اور اس شودر کو قتل کر دیا۔ رام بھگتوں کا سب سے بڑا شاعر تلسی داس ہے جب کہ میرا کرشن بھگتوں کی عظیم شاعرہ ہے۔

پُران تین قسم کے ہیں (۱) برہما کی ستائش میں (۲) وشنو سے متعلق (۳) شیو کی مدح میں۔ آج کل کے اکثر ہندوؤں کا مذہب اور اس کی رسوم انہی سے اخذ کی گئی ہیں۔

مارکنڈیا سمرتی نے عالمگیر سیلاب کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے ۔

" منو تپسیا کر رہا تھا جب ایک مچھلی نے جس کی جان اس نے بچائی تھی کہا ۔ " اے میرے محافظ تپسوی ! جان دار کائنات کی تباہی قریب آگئی ہے اور دنیا کو پاک صاف کرنے کا وقت آگیا ہے ۔ جو کچھ میں کہوں اس پر عمل کرو ، اسی میں تمہاری بہتری ہے ۔ ایک مضبوط اور بھاری کشتی بناؤ ، اس میں ایک لمبا رسّا باندھو ۔ اس میں سات رشیوں سمیت سوار ہو جانا اور قدیم زمانے کے برہمنوں نے جن اشیاء کا ذکر کیا ہے ان کے بیج اپنے ساتھ رکھ لینا پھر میرا انتظار کرنا میں ایک عظیم الجثہ حیوان کی صورت میں ظاہر ہوں گی ۔ میری باتوں پر عمل کرنا میری امداد کے بغیر تم اس خوفناک سیلاب سے بچ کر نہ جا سکو گے ۔ اس مچھلی نے رسّہ پکڑ لیا اور کشتی کو متلاطم موجوں پر سے کھینچتی ہوئی ہماوت کی چوٹی پر لے گئی اور کہا " میں برہما ہوں جس نے تمہاری جان بچائی ہے ۔ منو دوبارہ دیوتاؤں ، اسروں اور انسانوں کو خلق کرے گا ۔ "

ہندوؤں کے کل ۳۳ کروڑ دیوتا ہیں ۔ ان میں شیو ، وشنو ، انکے اوتاروں اور برہما کے علاوہ دولت کا دیوتا کوبیر ، لکشمی (جنگ کا دیوتا) جگن ناتھ ، گنیش (عقل و فن کا دیوتا) دوزخ کی دیوی نرتی بھی اہمیت رکھتے ہیں ۔

راکشس اور گنیش دیوتاؤں کے دشمن ہیں اور ہمیشہ ان کی مخالفت پر کمربستہ رہتے ہیں ۔ راون اور راہو کا تعلق بھی اسی زمرے سے ہے راون کے نو سر آدمی کے اور ایک سر گدھے کا تھا جو اس بات کی علامت ہے کہ آدمی خواہ کتنا ہی دانا ہو اس میں حماقت کا عنصر سدا موجود رہتا ہے راہو ایک اسُر (عفریت) ہے جو سورج کو نگلنا چاہتا ہے تو سورج گرہن لگ جاتا ہے ۔ ہندو دیومالا میں ناگ کی پوجا بڑی اہمیت رکھتی ہے اور دراوڑوں سے یادگار ہے ۔ دکن میں ہر گھر میں گُھپا کی پوجا منڈھی بنا کر کی جاتی ہے سانپوں کو دودھ پلاتے ہیں ۔ شیش یا اننت ناگ جسے واسوکی بھی کہتے ہیں ، ناگ دیوتا ہے ۔ اسکے ایک ہزار سر ہیں اور دیوتا وشنو تخلیق کے درمیانی وقفوں میں اس پر آرام کے لئے لیٹتا ہے ۔ دنیا شیش ناگ ہی کے سر پر قائم ہے ۔ جو ایک کچھوے پر کھڑا ہے ۔ جب کچھوا حرکت کرتے تو زلزلہ آجاتا ہے ۔ یاد رہے کہ ناگ ابتدائے تمدن سے لنگ کی علامت سمجھا جاتا رہا ہے اسلئے اس کی پوجا

ک پرجاپے گہری وابستگی رکھتی ہے ۔

ندوؤں کے آدم کو منو اور حوا کو شت روپا کہا گیا ہے۔ پرجاپے نے برہما کو اپنے جسم کے دو ٹکڑے کئے ایک سے مرد ج بنا اور دوسرے سے عورت یعنی شت روپا پیدا ہوئی۔ بنی نوع انسان انہی کی اولاد ہے ہیں۔ ستھوپدھاتا کے ریے کے مطابق کائنات اور بنی نوع انسان کا خالق سورج ہے جس کے ایک ہزار نام ہیں ۔

وسے دیوتاؤں کی دیو مالائی پہلوؤں سے منفرد ہے۔ اس میں شجاعت اور جوانمردی کو مرکزی مقام دیا گیا ہے اس میں ی اور روشنی کے دیوتا خیر کی علامت ہیں۔ تاریخ پارے اور اندھیارے کے عفریت دیوتاؤں کے دشمن ہیں اور شر کے علامتی ا ہر میں جن کا سردار لوکائی ہے۔ دیو مالا کے قصوں میں سرکیں جاڑے کی طویل پر غبار راتوں، طوفانی باد و باراں برف پہاڑوں کی چوٹیوں اور دل ہلا دینے والے مناظر کا ذکر کیا گیا ہے۔ سب سے بڑے دیوتا کا نام اوڈن یا وودن دیوتاؤں کا مسکن اسگرد ہے جس تک پہنچنے کے لئے دھنک کا پل عبور کرنا پڑتا ہے۔ اسگرد میں چاروں طرف سونے کے محل دکھائی دیتے ہیں جن میں یک چشم اوڈن کا شاہی محل والہلا سب سے بڑا اور شاندار ہے۔ اس میں ایک جڑاؤ ت بچھا ہے جس پر خداوند خدا اوڈن اپنی ملکہ فرگا کے ساتھ بیٹھتا ہے۔ اوڈن کے کندھوں پر دو کوّے بیٹھے رہتے ہوگن اور مونن یعنی خیال اور حافظہ جو دن میں ایک مرتبہ ساری دنیا کا چکر لگاتے ہیں۔ اور اوڈن کو دنیا بھر کے حالات باخبر کرتے رہتے ہیں۔ والہلا کی ضیافتوں میں منتخب سورمے شریک ہوتے ہیں۔ یہ وہ بہادر ہیں جو میدان جنگ میں مردانہ تے ہوئے مارے گئے تھے اور جنہیں حسین کنواریوں والکائریز نے والہلا پہنچایا تھا۔ ضیافت سے فارغ ہو ورمے تلواریں سونت کر ایک دوسرے پر پل پڑتے ہیں۔ ان کے کھائے ہوئے زخم معجزانہ طور پر اسی دم مندمل ہو ہیں۔ یہی ان کا پسندیدہ مشغلہ ہے۔ اوڈن کے کئی بیٹے ہیں۔ تھور، وودار، بروگی، بالڈر، ہوڈر وغیرہ۔ تھور بجلی کا دیوتا ہے اور بروگی شاعری کا۔ اس کی زوجہ ادونہ کے پاس سیبوں کی ٹوکری ہے۔ جس کے سیب کھا کر سالخوردہ دیوتا جوان ہو جاتے ہیں۔ بالڈر سورج کی شعاعوں، جشنوں اور خوشی کا دیوتا ہے۔ ہوڈر جاڑے کا اندھا دیوتا ہے ۔

فریا حسن و عشق اور بہار کی دیوی ہے ٹیو لہ دیوتاؤں کا پہلوان ہے ۔ ہیمڈال و ہلالا کا چوکیدار ہے جو کسی کو دھنک کے پل پر سے گذرنے نہیں دیتا ۔ جنگ کے دیوتا ٹیر کا ایک بازو کٹا ہوا ہے ۔

نارو سے سویڈن کی دیو مالا کی رو سے روز ازل کو چاروں طرف کہر اور اندھیرا محیط تھا جس میں سے دیو وامر عالم وجود میں آیا اور ایک گائے کا دودھ پی کر پروان چڑھا ۔ اس دیو کو دودھ پلاتے ہوئے گائے نے ایک پتھر کو چاٹا کرتی تھی جس میں سے انسان کا سر ظاہر ہوا اور وہ تیسرے دن مکمل ہوا ۔ اسکا نام بور تھا اور یہی اوڈن کا دادا تھا ۔ وامر دیو کی اولاد کہر اور پالے کے دیوؤں پر مشتمل ہے جو دیوتاؤں کے دشمن ہیں ۔ اس دیو مالا میں عالمگیر سیلاب کا تعلق وامر سے ہے ۔ جب اوڈن اور اس کے بھائیوں نے وامر کو قتل کیا تو انکے جسم سے خون کا سیلاب بہہ نکلا جس میں بیرل مر اور اس کی زوجہ کے سوائے سب ہلاک ہو گئے ۔ انھوں نے ایک بہت بڑے صندوق میں چھپ کر جان بچائی تھی ۔ دیوتاؤں نے وامر کے جسم کے ٹکڑے کئے ۔ اور ان سے آسمان ، زمین ، پہاڑ ، دریا ، وادیاں اور سمندر بنائے ، پھر آسمان پر تارے ٹانک دیئے اور زمین کے گرد خلا میں پانی بھر دیا ۔ اس کے بعد دیوتاؤں نے مرد کو بنایا اور عورت ملیہ کی لکڑی سے تراش کر بنائی ۔ مرد و عورت مل جل کر رہنے لگے ۔ ایک وقت ایسا بھی آئے گا جب و ہلالا کے دیوتا اور بنی نوع انسان نیست و نابود ہو جائیں گے ۔ سورج و چندر ماند پڑ جائے گا ۔ زمین سمندر میں غرق ہو جائے گی ۔ ستارے اور آسمان پاش پاش ہو جائیں گے ۔ اسکے بعد خداوند خدا نیا آسمان اور نئی دھرتی بنائے گا ۔ جو سمندر سے نمودار ہوگی زمین نیکی سے بھر جائے گی ۔ کھانے پینے کی چیزوں کی فراوانی ہوگی ۔ اور ہر طرف امن و امان کا دور دورہ ہو جائے گا ۔

نارو سے سویڈن کی دیو مالا میں المیہ کا رنگ بہت گہرا ہے ۔ اسکا مرکزی خیال یہ ہے کہ آدمی موت سے بچ کر کہیں نہیں جا سکتا اسلئے جوانمرد خوش دلی سے موت اور فنا کا سامنا کرتے ہیں ۔ اس عقیدے نے جرمنوں کے دل و دماغ پر گہرے اثرات ثبت کئے ہیں جن کا تجزیہ ژنگ نے کیا ہے ۔ ژنگ کہتا ہے ۔ کہ اس خیال نے جرمنوں کو جنگجو بنا دیا ہے وہ جنگ کو دعوت دیتے ہیں اور مردانہ وار موت کے گھاٹ اتر جانا پسند کرتے ہیں ۔ نارو سے سویڈن کی دیو مالا میں بہادرانہ جد وجہد کو سب سے بڑی نیکی اور فضیلت سمجھا جاتا ہے ۔ اپنی ہلاکت اور فنا کی پیش بینی اور اسکے شجاعانہ خیر مقدم نے اس دیو مالا میں المیہ اور نجابت کا دو

لہ ہفتے کے دن یا THURSDAY TUESDAY دیوتاؤں ، مشتری ، بدھ اور وڈن سے یادگار

پیدا کر دیا ہے جو دنیا کی کسی دوسری دیومالا میں نہیں ملتا جرمن موسیقار واگنر نے اپنے مشہور غنائی اوپیرا "حلقہ بے جنگ" میں
ضوع کو سامنے رکھ کر سیگ منڈ اور سیگ لنڈ کے عشق کی المناک داستان بیان کی ہے۔ سیگ منڈ ایک سورما تھا جس کی تلوار کا
ر تشک تھا۔ سیگ فریڈ اسکا بہادر بیٹا تھا جس نے ایک اژدہے کو ہلاک کرکے اسکا دل بھون کر کھا لیا تھا جس سے وہ
ں کی بولی سمجھنے لگا تھا۔ سیگ فریڈ نے ووڈن کی حسین بیٹی برونھلڈ کو اپنی جان پر کھیل کر حلقہ آتش سے نجات دلائی تھی جس
ے قید کر دیا گیا تھا۔ برونھلڈ اس سے پیار کرنے لگی۔ ماگن نے حسد سے جل کر سیگ فریڈ پر جادو کر دیا جس پر اسکا حافظہ زائل
ر وہ برونھلڈ کو بھول گیا۔ سیگ فریڈ بستر مرگ پر تھا جب یہ طلسم ٹوٹا اور برونھلڈ اس کی چتا پر جل مری۔ واگنر نے اپنے
وپیرا میں اس دیومالا کی پوری روح کو سمیٹ لیا ہے۔

ل دور روایات وسطی ایشیا اور قدیم مصر کی دیومالا سے متاثر نہیں ہوئیں۔ میکسیکو اور پیرو کی دیومالا۔ جب ہسپانیوں نے نئی دنیا
ں تو انہیں جا بجا قدیم تمدنوں کے آثار دکھائی دیے۔ ان میں قدیم ترین تمدن میکسیکو کا تھا جہاں اہرام مصر سے ملتے جلتے
ے دکھائی دیتے تھے۔ ان مناروں پر قربان گاہیں بنی ہوئی تھیں۔ میکسیکو والے سورج دیوتا کو زنل ٹوٹل پوجتے
ں کی نہایت خوفناک بنائی گئی تھی۔ وہاں کے باشندے ازٹک اس پر انسان قربان کیا کرتے تھے جو عموماً جنگی قیدی ہوتے
زٹک یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ انہی کی دعائیں سورج کو زندہ رکھتی ہیں۔ وہ لہو کو دوسری قدیم اقوام کی طرح حیات
ت سمجھتے تھے اور کہتے تھے کہ انسان کا لہو پینے سے سورج دیوتا ہر روز غروب ہونے کے بعد زندہ ہو جاتا ہے
ے طلوع آفتاب کے وقت سورج کے بت کے سامنے کئی آدمی بھینٹ دیئے جاتے تھے۔ پروہت قربانی کا سینہ
قو سے چیر کر اسکا دھڑکتا ہوا دل باہر کھینچ لیتا اور اسے مشرقی افق پر ابھرتے ہوئے سورج کو پیش کرتا تھا۔ ان کی دھرتی
و کی تھی جس کے معبد میں جوان لڑکیاں اسی طرح قربان کی جاتی تھیں تاکہ دھرتی کی زرخیزی اور بار آوری میں اضافہ ہو۔
نیوں کا سلسلہ جاری رکھنے کے لئے ہمسایہ قبائل پر حملہ کرکے جنگی قیدی پکڑ لاتے تھے۔ سورج دیوتا اور دھرتی دیوی کی
ے سال بھر خون کے دھارے بہتے رہتے تھے۔ جب ہسپانوی سپاہی فتح کے بعد ان مناروں تک پہنچے تو وہ

یہ دیکھ کر دہشت زدہ رہ گئے کہ چاروں طرف دور دور تک کھوپڑیاں اور ڈھانچے بکھرے پڑے تھے ۔

چینی دیومالا کی رو سے ابتدائے آفرینش سے پہلے ہر کہیں فساد تھا ۔ گھپ اندھیارے چھائے ہوئے تھے ۔ مرور زمانہ سے دو قوتیں یانگ اور ین کا ظہور ہوا جو مل کر کھیل کھلاتی ہیں ۔ یہ دوئی کائنات میں ہر کہیں پائی جاتی ہے ۔ یانگ آسمان، زندگی، روشنی، حرارت اور تذکیر کا اصول ہے جب کہ ین دھرتی، سکون، ظلمت، جمود اور تانیث کا علامتی مظہر ہے ۔ ان کے ربط باہم کو ایک دائرے کی صورت میں دکھاتے ہیں جس میں سفیدی اور سیاہی اس طرح گھل مل گئی ہے کہ ایک کو دوسری سے جدا نہیں کیا جا سکتا ۔ یانگ اور ین کے اس علامتی دائرے کو تاؤ مت میں وہی مقام دیا جاتا ہے جو مصری انخ (دستہ دار صلیب) دراوڑی لنگ، آریائی سواستکا اور عیسائی صلیب کو دیتے رہے ہیں ۔ جو ہزاروں سال کے بعد یانگ اور ین سے دیوتا پان کو نے جنم لیا جو اٹھارہ ہزار برس تک کائنات کی تعمیر میں جتا رہا ۔ یہ مشقت کرتے ہوئے اس کی پھولی ہوئی سانس ہوا اور بادل بن گئی، پسینے سے سمندر، دریا اور بارش کا ظہور ہوا ۔ وہ بڑھتا گیا بڑھتا گیا حتیٰ کہ اس کا سر پہاڑ بن گیا ۔ آواز رعد بنی، شریانیں ندیاں بن گئیں، جلد اور بال جنگل بنے، دانت اور ہڈیاں معدنیات بن گئیں اور کیڑے جو اس کے بدن پر رینگتے تھے انسان بن گئے ۔ تخلیق کے اس کام میں ایک اژدھے، ایک عنقا اور ایک کچھوے نے اس کی مدد کی، انہیں چینی مقدس سمجھنے لگے ۔ انقلاب سے پہلے کے چینی پھریرے میں زرد زمین پر ایک سیاہ اژدھے کا پیکر دکھایا جاتا تھا ۔ اور شہنشاہ چین اژدھے کی شکل کے تخت پر بیٹھا کرتا تھا ۔

قدیم چینی بزرگوں کی روحوں کو پوجتے تھے ۔ اور ان کے معبدوں میں خاص خاص تہواروں پر ان کی ضیافت کا اہتمام کیا کرتے تھے ۔ وہ ان معبدوں میں قیمتی اشیا کی بھینٹ دے کر مرادیں مانگتے تھے ۔ روحوں کی یہ پوجا ظاہر ہے قدیم روحوں کے مت سے یادگار تھی ۔ چینیوں کا خداوند خدا شانگ تی شخصی معبود سمجھا جاتا تھا جب کہ تاؤ (اصل لفظ داؤ بمعنی شاہراہ) کو کائنات میں جاری و ساری مانتے تھے ۔ ان کا عقیدہ تھا کہ تاؤ ایک آفاقی توانائی ہے جو ساری کائنات میں سمائی ہوئی ہے ۔ اسے گھیرے ہوئے ہے غیر متغیر ہے ۔ مشہور چینی مصلح لاؤتسے (پیدائش ۵۰۷ ق م) نے تاؤ کے اس تصور پر اپنے مسلک کی

بنیاد رکھی تھی جب کہ کنفیوشس مافوق الطبع کو چنداں اہمیت نہیں دیتا تھا ۔

دوسرے معاصر تمدنوں کی طرح چین قدیم میں بھی زرخیزی کا مسلک رائج تھا ۔ دھرتی کی بارآوری کو تقویت دینے کے لئے فصلیں بونے کے موقع پر نوجوان لڑکے اور لڑکیاں کھیتوں میں جا کر راتوں کو ناچا کرتے اور جنسی ملاپ کیا کرتے تھے تاکہ فصلیں خوب پنپ سکیں اور برداشت زیادہ ہو ۔ البتہ ان کے یہاں اننا ، عشتار ، آستر ، اناہتا وغیرہ کی جیسی دھرتی دیویاں نہیں تھیں جن کے معبدوں میں جنسی ملاپ کی ضرورت محسوس کی جاتی ۔ ان کے ہاں مردوک ، بعل ، تموز ، اوزیرس وغیرہ جیسے دیوتا تھے جن کی پیدائش اور موت کے ناٹک رچائے جاتے ۔ وہ یانگ اور ین کی دوئی ہی کو تخلیقی عمل کے لئے کافی جانتے تھے ۔

جاپانی تمدن چینی تمدن ہی سے مستعار لیا گیا تھا ۔ گرچہ زمانے کے گذرنے کے ساتھ جاپانی دیومالا کی اپنی منفرد خصوصیات بھی سامنے آگئیں ۔ جاپان میں سورج کی دیوی اماتیراسو کی پوجا کا رواج تھا ۔ بادشاہ یا میکاڈو کو اسی دیوی کی اولاد کہتے تھے ۔ جاپانیوں کا آدم ازاناگی اور حوا ازانامی تھی ۔ ایک دن یہ دونوں ایک پل پر کھڑے ہوئے اور سمندر میں ایک جڑاؤ برچھا دھکیلا ۔ اسے کھینچ کر باہر نکالا تو اس سے جو قطرے پانی کے گرے وہ جاپان کے مقدس جزیرے بن گئے ۔ پھر ازاناگی اور ازانامی کے اختلاط سے جاپانی قوم نے جنم لیا ۔ وہ اپنے میکاڈو کو دیوتا سمجھ کر اس کی پوجا کرتے رہے ہیں ۔ ان کے مذہب شنتومت کی بنیاد بزرگوں کی پوجا پر رکھی گئی ہے ۔

عالمگیر دیومالا کے مطالعے سے ایک حقیقت واضح طور پر سامنے آگئی ہو گی کہ اس کے اکثر قصے عالمگیر ہیں ۔ تقابلی دیومالا کے طالب علم کہتے ہیں کہ ان قصوں کے موازنے سے ہمیں نوع انسانی کی فکری وحدت اور احساس کی یگانگت کا ثبوت ملتا ہے ۔ ایڈون سڈنی نے تو کسی دیومالائی قصے کی اصلیت کا یہ معیار قرار دیا ہے کہ وہ اقوام عالم کی دیومالاؤں میں کثرت و تواتر کے ساتھ پایا جائے ۔ وہ اسے دیومالا کا محکم اصول قرار دیتا ہے ۔ ہارٹ لینڈ نے کہا ہے ۔[1]

انسان کے دوسرے قویٰ کی طرح اس کا تخیل بھی چند مقررہ قوانین کے تحت کام کرتا ہے جن کی موجودگی اور

---

[1] SCIENCE OF FAIRY TALES.

> کارفرمائی کا کھوج لگایا جا سکتا ہے۔ تخیل کا عمل خارجی کائنات کے مشاہدے، انسانوں کے باہمی تعلقات اور ان کی ذہنی و خلاقی ساخت پر مبنی ہوتا ہے۔ اس لئے اگرچہ بادی النظر میں مہذب اہل مغرب، وحشی لال ہندیوں، نسبتی ہندوؤں اور مغرب اقصیٰ کے وحشی قبائل کے نتائج تخیل مختلف دکھائی دیتے ہیں لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان سب کا تخیل ایک جیسے خطوط ہی پر کام کرتا ہے اور ان کے قصے اور وقائع نہ صرف ہیئت اور موضوع کے لحاظ سے ایک جیسے ہوتے ہیں بلکہ بسا اوقات ان میں کسی قسم کا فرق نہیں کیا جا سکتا"

یہی وحدتِ تخیل دیومالا کے عالمگیر تصورات میں ہیئت اور موضوع کی یک جہتی کو برقرار رکھتی ہے۔ ہم نے دیکھا کہ اقوام عالم کی دیومالا میں تکوین و تخلیق، جنت و دوزخ، بقائے روح، زمین دوز عالم کی سیر، لنگ پوجا، دھرتی دیوی، سورج کی پوجا، بارآوری کے تصورات، پتھروں اور چٹانوں کی پوجا، آگ کی تقدیس، خیر اور شر کی دوئی، یزدان و شیطان کی کشمکش، سیلاب کی کہانی، شجر و حجر کے دیوتاؤں اور سیاروں وغیرہ کے ملتے جلتے قصے ملتے ہیں۔ جن کے مطالعے سے ہمیں معلوم ہو جاتا ہے کہ کس طرح قدیم زمانے کے انسان نے مظاہر فطرت کو اپنے ہی جیسا ذی شعور، ذی حیات سمجھا اور ان سے ذہنی و قلبی ربط و ضبط پیدا کرنے کی کوشش کی تاکہ وہ اس وسیع کائنات میں اپنے اجنبی ہونے کے تلخ احساس سے نجات پا سکے۔ اس طرح گویا دیومالا روحوں کے مت ہی کی ارتقائی صورت تھی اور ان زمانوں سے یادگار تھی جب کہ ابھی فلسفے اور سائنس نے اسے غور و فکر کی روشنی عطا نہیں کی تھی۔ فلسفے اور سائنس کے فروغ کے ساتھ جب عقل و خرد اور مشاہدے اور تجربے کے طفیل وہ قوانین فطرت کے انکشاف پر قادر ہو گیا۔ اور انہیں اپنے مقاصد کے لئے بروئے کار لانے لگا تو روحوں کے مت اور جادو کی طرح دیومالا بھی غائب ہو گئی۔ جیسا کہ کارل مارکس نے کہا ہے۔

"دیومالا تخیل کے وسیلے سے فطری طاقتوں پر غلبہ اور قابو پا لیتی ہے اور انہیں مختلف شکلیں عطا کرتی ہے۔" لہٰذا جب انسان فطرت کی ان طاقتوں پر قابو پا لیتا ہے تو دیومالا غائب ہو جاتی ہے۔

سائنس کی ترقی کے ساتھ مغرب میں دیو مالا کا تصرف ٹوٹ چکا ہے لیکن ہندوستان میں عوام ابھی تک اس کی گرفت میں ہیں ہندوستان جہاں ہر قسم کے قدیم توہمات کا عجائب گھر ہے وہاں دیو مالا کی آخری پناہ گاہ بھی ہے۔ دیو مالا پرکھوں کی روحوں کی ترقی یافتہ صورت تھی اور صدیوں تک انسانی ذہن و فکر پر مسلط رہی۔ مذہب، آرٹ، ادب، لوک بات، شاعری اور تمثیل پر اس کے گہرے اثرات آج بھی اس کی یاد دلاتے رہتے ہیں۔ ہماری فنی اور ادبی تلمیحات اور روایات میں ان دیوتاؤں اور دیویوں کے دلچسپ سوانح محفوظ ہیں جو شاید ہمیشہ کے لئے صفحۂ ہستی سے نابود ہو چکے ہیں دیو مالا کی ایک عطا باقی رہے گی۔ لوک بات میں جنّوں، پریوں۔ دیویوں دیوتاؤں کی کہانیاں ہوں گی سدا بہار رہیں گی۔

مذہب

مذہب، شریعت اور طریقت کے الفاظ کا معنی ہے "راستہ" چینی زبان میں "تاؤ" کا مفہوم بھی یہی ہے۔ سنسکرت میں لفظ دھرم کا مادہ ہے دھر بہ معنی رکھنا۔ اصطلاح میں دھرم سے مراد راستی، عدل یا اخلاقِ حسنہ ہے[1]۔ اہلِ نظر نے مذہب کی تعریف اپنے اپنے نقطۂ نظر سے کی ہے۔ چند اقوال درج ذیل ہیں۔

"مذہب اس عقیدے پر مبنی ہے کہ ہمارے اور کائنات کے مابین توافق پایا جاتا ہے۔ (میکٹیگارٹ)

"مذہب اس بات پر عقیدہ رکھنا ہے کہ کائنات بامعنی ہے" (ولیمس)

"مذہب چند بندشوں اور پابندیوں کے مجموعے کا نام ہے جو ہماری صلاحیتوں کے آزادانہ اظہار میں مانع ہیں۔

(سالومن ریناخ)

"مذہب اس کوشش کا نام ہے جو آدمی اپنی تنہائی کے ساتھ مفاہمت پیدا کرنے کے لئے کرتا ہے۔" (وائٹ ہیڈ)

"مذہب ان مافوق الفطرت ہستیوں یا قوتوں کی تالیفِ قلب کا نام ہے جو اہلِ مذہب کے خیال میں انسانی زندگی پر متصرف ہیں۔ (جے۔ جی۔ فریزر)

"مذہب کامل احتیاج اور انحصار کا نام ہے۔ (شلائرماخر)

"مذہب قدیم زمانے کے انسان کی وحشت کی تخلیق ہے۔" (لکریشیس)

"مذہب وہ مابعد الطبیعیات ہے جو تجربے میں آئے۔ (اسپنگلر)

"مذہب انسانی ذہن کی آرزوؤں اور تمناؤں کو ایسی بیرونی قوتوں کے ساتھ مربوط کرنے کی کوشش ہے جو ان کی کچھ بھی پروا نہیں کرتیں" (ارٹ مان)

"مذہب نفسیاتی عدم توازن کے مماثل ہے" (فرائڈ)

---

[1] انگریزی کے لفظ RELIGION کا مادہ ہے RELEGERE (غور کرنا) اس کا متضاد ہے NEGLEGERE (نظر انداز کردینا)

"مذہب ہمارا احساس ہے ان برتر قوتوں کے بارے میں جو انسانی مقدر پر حکمراں ہیں" (مارٹے)

"مذہب اس بات کی کوشش ہے کہ قدیم رسوم کی مناسبت عقلیاتی اور سائنٹیفک نظریے سے کی جائے اور بے معنی عمل کے لئے محکم عقلی اساس مہیا کی جائے" (ناسلوم)

"مذہب عوام کے لئے افیون ہے" ۔ (کارل مارکس)

"غیر مرئی طاقتوں کا خوف انفرادی صورت میں توہم ہے اور اجتماعی صورت میں مذہب ہے" ۔ (ہابس)

ان اقوال پر غور کیا جائے تو مذہب کے پانچ عناصر ترکیبی سامنے آتے ہیں ۔ ۱۔ عقیدہ ۲۔ جذبہ ۳۔ رسوم عبادت ۴۔ اخلاق یا دستورِ عمل ۵۔ علم کلام ۔

ان عناصر کا تجزیہ کرنے سے پہلے ہمیں یہ معلوم کرنا ہوگا کہ مذہب کی تشکیل اور تدوین کیسے عمل میں آئی تھی۔ اس کے بارے میں اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ ای۔ بی۔ ٹائلر[1] کہتا ہے کہ دیومالا اور جادو کی طرح مذہب بھی روحوں کے مت کی ایک ترقی یافتہ صورت ہے ذہن و شعور کی نشوونما کے ساتھ قدیم عہد کے انسان کی غور و فکر کی صلاحیتیں بیدار ہو گئیں تو اس نے قدرتی مظاہر کو سمجھنے کے لئے قیاس آرائیاں شروع کیں۔ اس دور کے انسان کے خیالات اور احساسات کا تجزیہ معاصر وحشی اقوام کے مطالعے و مشاہدے اور نفسیات طفل کی روشنی میں کیا گیا ہے۔ ٹائلر کہتا ہے کہ پہلے پہل نیند، خواب، موت اور حوادث پر غور کرتے ہوئے انسانی ذہن میں روح کا تصور جاگزیں ہوا تھا۔ جب وہ دیکھتا کہ سوتے میں وہ دور دراز کے جنگلوں میں شکار کھیل رہا ہے یا اپنے مرے ہوئے ساتھیوں سے ملاقات کر رہا ہے تو وہ سوچنے لگتا کہ اس کے اندرون میں کوئی ایسی شے موجود ہے جو اس کے جسم سے علیحدہ بھی ہو جاتی ہے اور دوبارہ جسم میں واپس بھی آجاتی ہے۔ اس کے ساتھ وہ دیکھتا کہ خواب میں اس کے مرے ہوئے عزیز اس کے پاس آتے ہیں، باتیں کرتے ہیں ہنستے بولتے ہیں جس سے قدرتاً اس کے ذہن میں یہ بات راسخ ہو گئی ہے کہ انسان مر کر مٹ نہیں جاتا بلکہ کسی اور پراسرار عالم میں زندہ رہتا ہے۔ چنانچہ اسے اس بات کا یقین ہو گیا کہ میں بھی مر کر زندہ رہوں گا۔ ٹائلر کے خیال میں روح کے تصور، اس کی بقا اور حیات بعد موت

---

[1] PRIMITIVE CULTURE

کا یہی خیال بعد میں مذہب کا سنگِ بنیاد بن گیا تھا۔ قدیم زمانے کا انسان اپنے مرے ہوئے آباؤ اجداد کو زندہ سمجھ کر ان کی عبادت بھی کیا کرتا تھا۔ مُردوں کی روحوں کی یہ عبادت آج بھی اقوامِ عالم میں باقی ہے۔ انسانی ذہن کی ایک معروف خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے واردات و تاثرات کو ہمیشہ مرتب و مُدوّن کرتا رہتا ہے۔ چنانچہ مرورِ زمانہ سے قدیم دور کے انسان نے بے شمار ذی ارواح ہستیوں اور اشیا میں سے چند بڑی بڑی ہستیاں منتخب کرلیں اور انہیں دیوتا بنا کر پوجنے لگا۔ زرعی انقلاب کے ساتھ جب پیداوار و وسائل بدل گئے اور شکار کے بجائے کاشتکاری کی داغ بیل ڈال گئی تو لوگ دھرتی کے ساتھ وابستہ ہوگئے اور قبائلی تنظیم عمل میں آئی جو ریاست کی نمو کے ساتھ شاہیت کی صورت اختیار کرگئی۔ بادشاہ تمام سرداروں کا سربراہ بن گیا۔ اسی عمل کے تحت دیوتاؤں کا بھی ایک آقا (الوہ خدا قدیم پہلوی میں خوتائی تھا بمعنی آقا) تسلیم کرلیا گیا جسے خداوند خدا کہنے لگے اور بنی نوع انسان نے کثرت پرستی سے دوئی، تثلیث اور توحید کی جانب بتدریج قدم بڑھایا۔ ڈبلیو رج وے[1] نے مذہب کو مُردوں کا مسلک[2] کہا ہے اور یہ نظریہ پیش کیا ہے کہ ابتدا میں لوگ دیوتاؤں کی نہیں بلکہ اپنے مرے ہوئے بزرگوں (آباؤ اجداد) کی پوجا کیا کرتے تھے۔ دیوتاؤں کا ظہور بعد میں ہوا۔ دیوتا شروع شروع میں بزرگوں کی روحیں ہی تھیں جن پر فوق الطبع کا رنگ چڑھا دیا گیا تھا۔

جے جی فریزر نے ٹوٹم مت کے حوالے سے مذہب کی صورت پذیری کی توجیہ کی ہے۔ ٹوٹم مت آج بھی آسٹریلیا، افریقہ اور بحرالکاہل کے جزائر کے وحشی قبائل میں موجود ہے۔ جب کسی قبیلے کے افراد اپنے آپ کو کسی جانور یا درخت سے منسوب کرلیتے ہیں، اسے اپنا بھائی یا باپ کہتے ہیں اور اسے جان سے مارنا یا کھانا پاپ سمجھتے ہیں تو وہ جانور یا درخت ان کا سرپرست یا ٹوٹم بن جاتا ہے۔ ٹوٹم کی اصطلاح سب سے پہلے ایک انگریز جے لانگ نے ۱۷۹۱ء میں لال ہندیوں سے سیکھی تھی۔ جے ایف میک لینن نے اس کے مفہوم کی تشریح کی۔ وُنٹ نے بھی فریزر کی رائے سے اتفاق کیا ہے کہ مذہب ٹوٹم مت ہی کی بدلی ہوئی صورت ہے۔ ٹائلر نے ٹوٹم کا رشتہ بزرگوں کی روحوں کی پوجا سے جوڑا ہے اور کہا ہے کہ وحشیوں کے عقیدے کے مطابق ان کے بزرگوں کی ارواح نے حیوانوں، پرندوں، پودوں وغیرہ کو اپنا مسکن بنایا تھا اس لئے انہیں مارنا یا کھانا ممنوع (ٹیبو) قرار دیا

---

[1] DREAMS AND DRAMATIC DANCES

[2] CULT OF THE DEAD

ہندوستان کے ناگا ٹیبو کو گنا کہتے ہیں۔ لفظ ٹیبو کا مطلب ہے ایسا امتناع جسے مذہب نے تقدس دے دیا ہو۔ ٹیبو قدیم ترین غیر تحریر شدہ قانون ہے جس کی پابندی معاشرے کے لئے لازمی قرار دے دی گئی تھی۔ رابرٹسن سمتھ نے تقدس کے حوالے سے ٹیبو کی تشریح کی ہے۔ ان کے خیال میں تقدس کے دو پہلو ہیں مثبت اور منفی، پاک اور مکروہ، رحمانی اور شیطانی۔ یہی وجہ ہے کہ قدیم زمانے میں مقدس اشیا حرام (حرام میں امتناع اور پاکی کے دو مفہوم پائے جاتے ہیں جیسے خنزیر کا کھانا حرام ہے اور محرم الحرام) یا ممنوع سمجھی جاتی تھیں۔ فرائڈ نے اپنی کتاب ٹوٹم اینڈ ٹیبو میں اڈیپس الجھن کے حوالے سے ان کی تشریح کی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جب قدیم زمانے میں بیٹوں نے باپ کو قتل کر دیا اور اسے چبا کر کھا گئے تو ان میں احساس جرم پیدا ہو گیا۔ اور پرائشچت کے طور پر انہوں نے محرمات سے اختلاط اور ماں باپ کو مارنا ممنوع کر دیا جس سے اخلاق کی بنیاد پڑی لیکن یہ تشریح دور از کار ہے۔ قدیم ترین معاشرہ مادری تھا جس میں باپ کو کوئی اہمیت نہیں دی جاتی تھی اس لئے ایسے معاشرے میں اڈیپل الجھن کی نوبت نہیں آتی تھی۔ آج کل کے وحشی قبائل میں بھی اخلاق اور معاشرے کو ٹوٹم اور ٹیبو ہی کی بنا پر منظم کیا گیا ہے۔ ان کے ہاں کسی جانور کو ٹوٹم بنا لیا گیا ہے۔

جسے وہ اپنا باپ خیال کرتے ہیں اور جس میں ان کے عقیدے کے مطابق جد اعلیٰ کی روح نے حلول کیا ہوا ہے۔ ان کے ہاں اپنے ٹوٹم کے نشانات کھمبوں پر کھدے ہوئے ہیں جن کی پوجا وہ بتوں کی طرح کرتے ہیں۔ چھوٹا ناگپور کا کھریا قبیلہ آٹھ شاخوں میں منقسم ہے سورن (چٹان) ، موڑو (کچھوا) ، سماڈ (ہرن) ، بر لیبا (ایک چیل) ، گرہ (ایک پرندہ) ، ٹنبا (کچلی) وغیرہ۔ دوسرے وحشی قبائل کی طرح ان کا مذہب ٹوٹم اور ٹیبو پرستی پر مشتمل ہے۔ ڈرخائم نے اسے ہمہ ٹوٹم پرستی کہا ہے۔

اگسٹس کومٹ نے مذہب کی ابتداء اشیا پرستی سے کی ہے یعنی ایسی اشیا کو مقدس جن میں پراسرار قسم کی طلسماتی قوت موجود ہوتی ہے ہربرٹ سپنسر نے مذہب کا آغاز بزرگوں کے بھوتوں کی پوجا سے کیا ہے جو ظاہر ارواح کے مت ہی کی ایک صورت ہے ایک جرمن عالم اے بیسکلے نے دونوں کے مت کے برعکس ستارہ پرستی کو مذہب کا ماخذ قرار دیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ دیو مالا اور مذہب شروع سے ستاروں کی پوجا سے وابستہ رہے ہیں جن کا مرکز شہر بابل تھا۔ اس کی اشاعت بابل سے مشرق وسطیٰ

۱؎ PAN -TOTEMISM

۲؎ FETICHISM یہ ترکیب پرتگیزی مادے FEITICO سے مشتق ہے۔

کے ممالک سے ہے کر عرب یونان اور اسرائیل میں ہوتی تھی ای ونکلے نے اسے ہمہ گیر بابلیت[1] کا نام دیا ہے۔

رابرٹسن سمتھ نے قربانی کو مذہب کا نقش اولیں کہا ہے۔ اس کے خیال میں جب قدیم انسان نے اپنے بزرگوں کی روحوں یا دیوتاؤں کو خوش کرنے کے لئے ان کے نام پر قربانی کی جہاں سے مذہب کا آغاز ہوا۔

مانا کے تصور سے بھی مذہب کی توجیہہ کی گئی ہے۔ میلانیشیوں کے یہاں عالم ارواح کے لئے مانا کا لفظ ہے۔ وہ مانا کو ایک قسم کی پراسرار توانائی سمجھتے ہیں جو کائنات میں ہر کہیں پھیلی ہوئی ہے اور ہماری صحت اور خوشحالی پر اثر انداز ہوتی رہتی ہے۔ اس غیر مرئی اور غیر شخصی توانائی کو جو بعض اوقات اشخاص یا اشیاء میں حلول کر کے انہیں مقدس یا بابرکت بنا دیتی ہے شمالی امریکہ کے قبائل اورنڈا، واکن یا مانیٹو کہتے ہیں، مراکش میں اسے برکہ (برکت) کہا جاتا ہے جو مراکو والوں کے خیال میں سلاطین، اولیاء، سادات اور مجذوبوں میں ہوتی ہے۔ جزائر ہند میں مانا کو شکتی کہتے ہیں جو دو قسموں کی ہوتی ہے، ایک بری جو آزار پہنچاتی ہے اور دوسری اچھی جو خوشحالی کا باعث ہوتی ہے۔ مڈگیسکر کے وحشی قبائل میں مانا کو ہزینا اور کوآ کہا جاتا ہے۔ رابرٹسن سمتھ کے خیال میں مانا کا تصور مقدس ضیافت سے پیدا ہوا جس میں قبیلے کے لوگ مل کر اپنے ٹوٹم جانور کو مار کر کھا جاتے تھے تاکہ اس کی طلسماتی پراسرار توانائی ان میں بھی حلول کر جائے۔ گولڈن وزر نے میلانیشی معاشرے کے حوالے سے مانا پر تفصیلی بحث کی ہے اور اشارۃً کہا ہے کہ یہی ہمہ گیر توانائی بعد میں مذاہب کی روحانیت کی صورت اختیار کر گئی جس کے حوالے سے آج کل مذہب کا جواز پیش کیا جا رہا ہے۔

علم الانسان کے طلبہ نے خدا کے تصور کو تشبیہی[2] قرار دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ خدا نے انسان کو اپنے نمونے پر تخلیق نہیں کیا جیسا کہ اہل مذہب کہتے ہیں بلکہ انسان نے خدا کو اپنے نمونے پر تخلیق کیا ہے کیونکہ خدا انسان کی ذات سے علیحدہ کوئی وجود نہیں رکھتا اور انسانی ذہن ہی کی مخلوق ہے۔ فرائڈ اور اس کے پیروؤں کا ادعا یہ ہے کہ مذہب محض ایک نفسیاتی عدم توازن[3] کے مماثل ہے، جذبۂ عبدیت دور طفلی کی بے بسی کے احساس سے یادگار ہے اور اس میں نوع انسان کے عہد طفلی یا ابتدائی دور تہذیب کی بے چارگی کا احساس بھی شامل ہے۔ وہ خدا کو باپ کا عکس مانتے ہیں جو دہشت اور شفقت دونوں کا مجسمہ ہے بچہ اپنے باپ سے ڈرتا بھی ہے

---

[1] PAN BABYLONIANISM

[3] NEUPOSIS

[2] ANTHROPOHORPHIC

اور اس کا سہارا تلاش کرتا ہے چنانچہ خدا کا تصور، اوڈیپی الجھن[لے] کی پیداوار ہے۔ اسی بنا پر خدا کو آسمانی باپ بھی کہتے ہیں۔ فرائڈ کا ایک پیرو ڈاکٹر ڈیوڈ فارسٹ[ئے] لکھتا ہے۔

"مذہب انسان کو سہارا دیتا ہے لیکن یہ سہارا ایسا ہی ہے جیسا کہ ایک بچہ تلاش کرتا ہے۔ بالغ آدمی کسی کا سہارا لے گا تو یہ اس کی ذہنی ناپختگی اور طفلانہ پن کا ثبوت ہوگا۔ انسان کے لئے خدا کی ذات کا سہارا لینے کے بجائے خود اپنی ذات کا سہارا لینا زیادہ ضروری ہے۔ بہشت اور نجات کی تلاش کرنے کے بجائے اسی دنیا میں اپنی حالت سنوارنا ہوگی۔ موت کے بعد کی زندگی کے بارے میں سوچنے کے بجائے کیوں نہ اسی دنیا کے بارے میں سوچا جائے۔ مذہب نے شقی اور سعید، نیک و بد، صادق اور کاذب کی جو تفریق کر رکھی ہے وہ غیر ضروری ہے۔ کوئی شخص فطرتاً اچھا یا برا نہیں ہوتا ماحول سے اچھا یا برا بنا دیتا ہے۔ ماحول کو مساعد بنا کر ہر شخص کو اچھا بنایا جا سکتا ہے۔"

تحلیل نفسی کی رو سے نفس انسانی کے دو پہلو ہیں: ۱۔ خلط فکری ۲۔ حقیقت نظری[ئے]۔ مذہب اور تصوف خلط فکری کی پیداوار ہیں۔ جب کہ سائنس حقیقت نظری کی دست پروردہ ہے۔ حقیقت پسند آدمی خواب و خیال کی دنیا کے بجائے حقائق کی دنیا میں گذر بسر کرتا ہے۔ اور اپنی زندگی میں حقائق کا مردانہ وار مقابلہ کرتا ہے خواہ وہ کتنے ہی تلخ کیوں نہ ہوں۔ اس کے برعکس جو شخص ان کا سامنا نہیں کر سکتا، وہ حقائق سے فرار کر کے تخیلات سے رجوع لاتا ہے اور تخیل ہی میں اپنی محرومیوں اور ناکامیوں کا مداوا تلاش کر لیتا ہے۔ مذہب بھی اسی اجتماعی تخیل آرائی کا کرشمہ ہے۔ بنی نوع انسان نے اپنے ابتدائی دور میں بچوں کی طرح نامساعد قدرتی ماحول سے گریز کر کے تخیل آرائی کے دامن میں پناہ لی تھی۔ اور بچوں کی طرح دیوتاؤں کا سہارا تلاش کیا تھا۔ رفتہ رفتہ وہ زمانے کے تقاضوں اور فکری ارتقاء کے ساتھ وسعت نظر و احساسات سے بہرہ یاب ہو گیا اور تخیلات میں خدا و مسرت تلاش کرنے کے بجائے اپنے عقدے حقیقت پسندانہ انداز میں سلجھانے لگا۔

لے PSYCHOLOGY OF RELIGION

ئے REALITY THINKING

تحلیلِ نفسی کے علماء کے خیال میں سائنس کی ترقی کے ساتھ انسان کی پچھلی تخیل آرائی سے ہٹ کر حرفی صداقت پر مرکوز ہوتی جا رہی ہیں۔ اور نفسیاتی بلوغت کے مرحلے میں داخل ہو گیا ہے۔

فی تاریخ سے مذہب کی تشکیل میں دو عوامل کار فرما رہے ہیں۔ معاشی اور نفسیاتی۔ بھوک کے خوف اور تشویش کے باعث قدیم زمانے کے انسان کو اپنی بے بسی اور بے چارگی کا نہایت تلخ احساس تھا جس کی تلافی کے لئے اس نے تخیل آرائی سے کام لیا اور مافوق الطبع عناصر کا سہارا لیا۔ مافوق الطبع کا سہارا وہی شخص لیتا ہے جو موت سے ڈرتا ہو۔ یا غریب اور مفلس ہو۔ مذہب کی مقبولیت کا راز یہی بات ہے کہ وہ موت کے بعد زندگی کی بشارت دیتا ہے۔ مافوق الطبع سہاروں کی ضرورت کا ذکر کرتے ہوئے والٹیئر اور ولیم جیمز نے کہا ہے کہ اگر خدا کا وجود نہ بھی ہو تو بھی سکونِ قلب کے لئے خدا پر عقیدہ رکھنا ضروری ہے۔

مذہب کے اجزائے ترکیبی کے مطالعے کا آغاز ہم عقیدے سے کریں گے۔

روح کے تصور ہی کو مذہب کا سنگِ بنیاد کہا جا سکتا ہے کیوں کہ روح کے ساتھ ہی حیات بعد موت، بقا و معاد، حشرِ اجساد، جزا سزا، جنت دوزخ اور خدا کے عقائد وابستہ ہیں۔ کوئی بھی شخص جو روح کے وجود کا منکر ہو وہ با مذہب نہیں ہو سکتا کیوں کہ روح کے منکر پر اس بات کا انکار لازم آئے گا۔ کہ موت کے بعد روح باقی رہے گی یا روزِ حشر انسان دوبارہ زندہ ہو کر اٹھ کھڑا ہوگا۔ یا انسان کو اپنے اعمالِ نیک و بد کی جزا سزا ملے گی۔ یا وہ خدا کے سامنے جوابدہ ہوگا۔ دوسرے الفاظ میں روح پر عقیدہ رکھنا عالمِ عقبیٰ پر عقیدہ رکھنا ہے، خدا کے وجود پر عقیدہ رکھنا ہے۔ روح کے وجود کا منکر خدا کے وجود کا قائل نہیں ہو سکتا۔

جیسا کہ ہم پچھلے باب میں لکھ چکے ہیں، قدیم زمانے کا انسان سانس یا ہوا کے جھونکے کو روح کہا کرتا تھا۔ آج بھی متعدد بڑی بڑی زبانوں میں روح کے لئے جو الفاظ ہیں ان سب کا معنی سانس یا ہوا کا جھونکا ہی ہے۔[1] بعد میں خوابوں کی بیداری کے ساتھ انسان کے آبا نے روح کو اپنی ہی شکل و صورت اور قد و قامت کی چلتی پھرتی ہوئی کایا یا بھوت کہا یا جو موت کے بعد کسی دوسرے عالم کو چلی جاتی ہے۔ اسی کایا سے عفریت، ہمزاد، جن، پریت وغیرہ کے تصورات وابستہ ہیں۔ یہ روح موت کے بعد بھی زندہ رہتی ہے۔ اپنے عزیزوں کی امداد کرتی ہے۔ ان کی ضیافت میں شریک ہوتی ہے۔ پرانے زمانے کے شمن اور کاہن اور آج کل

---

[1] عربی میں روح، نفس، نسمہ؛ عبرانی رواح، نفش؛ یونانی: سائیکی؛ لاطینی: اینی ما؛ سنسکرت: آتما؛ انگریزی: سپرٹ؛

کے "روحانیت پسند"[1] اس کی حاضرات کے دعوے بھی کرتے رہے ہیں۔ اہلِ مذہب و تصوف کی "روحانیت" اسی عقیدے سے وابستہ ہے۔

متکلمین نے روح کے بارے میں عجیب و غریب موشگافیاں کی ہیں۔ صوفیوں اور سریت پسندوں کا مشہور عقیدہ ہے کہ ابتدائے آفرینش میں انفرادی روح (آتما)، روحِ کل کا جزو تھی جو اس عالمِ مادی میں آکر اپنی اصل سے جدا ہو گئی۔ یہاں وہ اپنے ماخذ میں دوبارہ جذب ہونے کے لیے بے قرار رہتی ہے۔ اور اس کے فراق میں تڑپتی رہتی ہے۔ ان کے خیال میں انسانی زندگی کا مقصد واحد یہ ہے کہ وہ اپنی روح کو ریاضت، تجرد، مراقبے اور تپ سے کام لے کر مادے کی بندشوں سے رہائی دلوائے تاکہ دوبارہ روحِ کل میں جذب ہو جانے کے قابل ہو جائے۔ یہی جذب و فنا روح کی بقا ہو گی۔ اسی مقصد کے لیے صوفیہ، ویدانتی، اشراقی اور سریت پسند دنیا سے کنارہ کشی کر کے جپ تپ کرتے رہے ہیں۔ غزالی نے مشکوٰۃ الانوار میں روح کی چار قسمیں گنائی ہیں۔ روح الحساس، روح الخیالی (تصور)، روح العقل (فکر)، روح الذکر (حافظہ)، روح القدس صرف انبیاء کو ارزانی ہوتی ہے۔ جعفر شریف[2] کے بقول روح کی تین قسمیں ہیں۔ روحِ سفلی یا روحِ حیوانی، روح الجاری جو سوتے میں ادھر ادھر گھومتی پھرتی ہے اور جس سے آدمی خواب دیکھتا ہے، روح العلوی روح جو موت کے بعد باقی رہتی ہے۔ غزالی اور جعفر شریف کی یہ تقسیم قدیم نفسیات سے یادگار ہے جس میں نفسِ انسانی کو کئی حصوں میں بانٹ دیا گیا ہے۔ یہ نفسیات اب متروک ہو چکی ہے۔ جدید نفسیات کی رو سے روح کو ذہنِ انسانی سے خارج میں کوئی مستقل بالذات ہستی تسلیم نہیں کیا جاتا۔ غزالی کے بقول روح جسم کے وجود میں آنے کے بعد حادث ہوتی ہے جیسے صورت آئینے میں آتی ہے اور موت پر عالمِ ارواح کو لوٹ جاتی ہے۔ غزالی کے اس بیان پر تنقید کرتے ہوئے سر سید احمد لکھتے ہیں۔

> "یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ جب غزالی نے روح کو مادی تسلیم نہیں کیا بلکہ غیر جسم کے مانا ہے اور کہا ہے کہ نہ وہ جسم میں داخل ہے نہ اس سے خارج میں ہے، نہ اس سے ملی ہوئی ہے نہ

روح کا نفس سب کا معنی سانس یا ہوا کا جھونکا ہی ہے۔

[1] SPIRITUALISTS

[2] تاریخِ اسلام

اس سے جدا ہے بلکہ اس کا تعلق بدن سے ایسا ہے جیسے کہ صورت کا آئینہ میں تو وہ انسان کے افعال سے اخلاقِ حسن یا اخلاقِ قبیح کیوں کر حاصل کرتی ہے"۔ [1]

یہ اعتراض معقول ہے اگر روح ایک ایسی ہی لطیف شے ہے جس کا بدن سے محض آئینے اور صورت کا تعلق ہے تو شقی یا سعید کیسے بن جاتی ہے اور اُسے موت کے بعد اعمال کی جزا و سزا کیسے دی جا سکتی ہے۔ اس سے ملتی جلتی بات ایک فرانسیسی دانشور خاتون الزبتھ نے دے کارت فلسفی سے کہی تھی۔

"روح کو مادی سمجھنا آسان ہے مگر یہ سمجھنا سخت مشکل ہے کہ وہ غیر مادی ہو کر مادے کو متحرک کرتی ہے"

مادیت پسندوں کا استدلال یہ ہے کہ جس شے کو روح کہا جاتا ہے وہ انسانی ذہن سے الگ نہیں ہو سکتی۔ ذہن مغزِ سر کا فعل ہے اور مغزِ سر مادی ہے لہٰذا روح بھی مادی ہے۔ جب موت پر مغزِ سر کا فعل ختم ہو جاتا ہے تو روح بھی فنا ہو جاتی ہے۔ اسی بنا پر وہ روح کے علیحدہ وجود کے منکر ہیں۔ مسلمانوں میں کرامیہ اور حنابلہ روح کو جسم مانتے ہیں اور حشرِ اجساد کے قائل ہیں یعنی ان کے خیال میں قیامت کے دن انسان اسی جسم اور روح کے ساتھ دوبارہ زندہ ہو کر اٹھے گا جس کے ساتھ وہ اس دنیا میں گزر بسر کر رہا ہے۔ شیخ ابن العربی نے روح اور نفس میں فرق کیا ہے (روح، نفس، بجالی نفَس دونوں کا معنی سانس یا ہوا کا جھونکا ہی ہے) وہ کہتے ہیں کہ روح انسان میں عقلی اصول ہے جس سے انسان علم حاصل کرتا ہے جب کہ نفس حیات حیوانی ہے۔ تاج العروس میں نفس سے مراد ذہن اور روح سے مراد زندگی ہے۔ بعض عرب لغت نویسوں نے روح کی تین قسمیں بیان کی ہیں ۱۔ حیوانی ۲۔ نفسانی ۳۔ طبعی کہا جاتا ہے کہ جسم کثیف و الروح فیہ جسم لطیف و العقل فیہ جوھر نورانی۔

روح کے وجود سے تناسخِ ارواح یا آواگون کا عقیدہ بھی وابستہ ہے۔ یہ عقیدہ مصرِ قدیم میں بھی تھا لیکن ہندوؤں نے اس سے بڑی شرح و بسط سے بحثیں کی ہیں۔ ہندوؤں کے خیال میں آتما (انفرادی روح) ایشور (خدا) اور پرکرتی (مادہ) تینوں ازلی و ابدی اور غیر مخلوق ہیں۔ ایشور آتما اور پرکرتی کے میل جول سے تخلیق کا کام کرتا ہے کٹھ اپنشد میں لکھا ہے۔

"آتما نہ پیدا ہوتی ہے نہ مرتی ہے۔ وہ ایک چولے سے دوسرے چولے میں منتقل ہوتی

---

[1] مضامین

رہتی ہے۔"

موسیو لیبون کے خیال میں تناسخ ارواح کا تصور غیر آریائی ہے اور دراوڑوں سے یادگار ہے۔ رگ وید میں اس کا ذکر نہیں ملتا اس میں یہی کہا گیا ہے کہ موت کے بعد آتما پانیوں میں چلی جاتی ہے۔ ہندوؤں نے دراوڑوں کے تصور پر کرم کا پیوند لگایا اور کہا کہ انسان کی روح اپنے نیک اعمال کی جزا اور اعمال بد کی پاداش میں موت کے بعد نیا چولا بدلتی ہے۔ اصطلاح میں اسے سنسار چکر یا آواگون (آنا، جانا) کہتے ہیں جب تک نجات یا مکتی حاصل نہ ہو تو روح کو چوراسی لاکھ جنموں میں سے گزرنا پڑتا ہے گوتم بدھ اور جین روح کے وجود کے منکر ہیں۔ اسی لئے انہیں ناستک (ملحد) کہا جاتا ہے۔ بدھ مت کا بڑا تضاد یہ ہے کہ جب روح کا کوئی وجود ہی نہیں ہے تو انسان سنسار چکر میں گرفتار ہو کر اپنے کرم کی نسبت سے نئے نئے قالب اختیار کرتا ہے اور اپنے اعمال بد کی سزا کیوں کر بھوگتا ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ گوتم بدھ سنسار چکر کا تو قائل ہے لیکن روح کا منکر ہے۔ شت پتھ برہمن میں آواگون کا نظریہ ہندومت کا لازمی عنصر قرار دیا گیا۔ بدھ مت، جین مت اور سکھ مت میں ہندوؤں کے توہمات و عقائد کو رد کر دیا گیا ہے لیکن وہ آواگون کے برابر قائل رہے ہیں۔ البتہ برہسپتی کے پیروؤں نے جنہیں چارواک کہا گیا ہے جب روح کے وجود سے انکار کیا تو اس کے منطقی نتیجہ کو قبول کر لیا اور حیات بعد موت کے ساتھ آواگون کو بھی ماننے سے بھی انکار کیا۔ آواگون ظاہر ہے نہایت رجعت پسندانہ عقیدہ ہے۔ مکار برہمنوں نے نیچ ذات والوں کو اس بات کا یقین دلا دیا ہے کہ سابقہ جنم کے گناہوں کی پاداش میں انہیں نیچ ورنا میں پیدا کیا گیا ہے۔ جب تک ہندوستان میں آواگون کا عقیدہ موجود ہے وہاں کے کروڑوں نیچ ذات والوں کو ان کا اصل انسانی مقام میسر نہیں آ سکتا۔ مسلمانوں میں اہل غلو تو جیسے آواگون کے قائل ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ منکر نکیر مردے سے پہلا سوال یہی کرتے ہیں کہ کیا تم اپنے امام کو پہچانتے ہو۔ جواب نفی میں ہو تو مردے کی روح کو قالب بدلنا پڑتا ہے اور جب تک وہ اپنے امام کی شناخت نہ کرے یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔

اخوان الصفا بھی تناسخ ارواح کے قائل تھے۔ وہ کہتے تھے کہ روح جمادات، نباتات اور حیوانات میں سے گزرتی ہوئی بالآخر انسان تک آتی ہے اور پھر عالم علوی کو پرواز کر جاتی ہے۔

دی کہانیوں میں اکثر یہ ذکر آتا ہے کہ کوئی دیو اپنی روح کسی طوطے کے قالب میں منتقل کر کے اس کا پنجرہ چھپا دیتا ہے لیکن شہزادہ کئی کٹھنائیوں کا سامنا کر کے اس پنجرے کو ڈھونڈ نکالتا ہے اور طوطے کی گردن مروڑ دیتا ہے جس پر دیو مر کر گر پڑتا ہے۔ اسی طرح جوگی اپنی روح کو جانوروں کے چولے میں بدلنے پر قادر ہوتے ہیں۔

مذہبی عقیدہ کامل سپردگی چاہتا ہے اس میں چون و چرا کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ اس بنا پر کارل ژنگ نے مذہبی عقیدے کو عشق کے مماثل قرار دیا ہے۔ وہ کہتا ہے۔

"عشق اور مذہبی عقیدے میں ایک سے زیادہ عناصر مشترک ہیں۔ دونوں میں کامل سپردگی ضروری ہے۔ صرف وہی اہلِ مذہب جو اپنے خدا کے سامنے پوری طرح سرِ تسلیم خم کر دیتے ہیں اس کی بارگاہ میں مقبول سمجھتے ہیں اور اس کی رحمت کے مستحق ہو سکتے ہیں۔ اسی طرح عشق کے حیرت انگیز اسرار بھی اسی شخص پر کھلتے ہیں جو اپنی محبوبہ کے سامنے کامل سپردگی سے کام لیتا ہے۔"

مذہبی عقیدے اور تقدس کے احساس کا بھی آپس میں گہرا تعلق ہے۔ جولین ہکسلے[1] نے تقدس کے احساس کو مذہب کا جوہر قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ جو شخص کسی وجود یا شے پر عقیدہ رکھتا ہے وہ اس کے لئے مقدس بن جاتا ہے۔ چنانچہ اہلِ مذہب خداوند کے علاوہ پتھروں، چٹانوں، دریاؤں، پہاڑوں کی چوٹیوں، چشموں، جھیلوں، پتھر اور لکڑی سے تراشی ہوئی مورتیوں[2]، درختوں، پھولوں، پرندوں، جانوروں، قبروں وغیرہ کو مذہبی عقیدے کی بنا پر ہی مقدس سمجھ کر ان کی پوجا کرتے رہے ہیں اور ان سے مرادیں مانگتے رہے ہیں۔ تقدس کا احساس محبت اور خوف کے ملے جلے جذبات پر مشتمل ہے یعنی انسان جس وجود کو اپنے لئے مقدس سمجھ لیتا ہے اس سے ڈرتا بھی ہے اور اس کی جانب کشش بھی محسوس کرتا ہے۔ یہی کیفیت مقدس اشیاء، دیوتاؤں میں پائی جاتی ہے۔ جیسا کہ ذکر ہو چکا ہے تقدس کا ذکر مانا کے حوالے سے بھی کیا جاتا ہے۔ مانا یا غیر معمولی طلسماتی قوت اشیاء اور اشخاص سے وابستہ ہو جائے تو وہ مقدس بن جاتے ہیں۔ اسی بنا پر انسان بجلی کی کڑک، چمک، آتش فشاں پہاڑ، گھنے جنگلوں، گہرے غاروں اور عجیب وضع کے پتھروں کو مقدس سمجھتا رہا ہے اور انہیں عقیدت کی نگاہ سے دیکھتا

---

[1] RELIGION WITHOUT REVELATION.

[2] FETICHES

رہا ہے۔

عقیدے سے بعد جذبۂ مذہبیت کی بات ہوگی۔ فرائڈ کے خیال میں جذبۂ مذہبیت سراسر منفی ہے اور محبت پر نہیں بلکہ خوف پر مبنی ہے۔ اس سے کسی محبوب ہستی کے ساتھ قلبی ربط و تعلق پیدا کرنا مقصود نہیں ہوتا بلکہ کسی مافوق الطبع ہستی کی تالیف قلب مطلوب ہوتی ہے۔ فرائڈ سے بہت پہلے لکریشیس نے اس خیال کا اظہار کیا تھا کہ مذہب دہشت کی پیداوار ہے غاروں کا انسان اپنے آپ کو چاروں طرف سے خطرات میں گھرا ہوا محسوس کرتا تھا۔ وہ صدیوں تک گوناگوں اندیشوں میں مبتلا رہا اور مظاہر فطرت سے خوف کھاتا رہا۔ اندھیرے کا خوف، مرے ہوئے دشمنوں کے بھوتوں کا خوف، بھوک اور قحط کا خوف، موت کا خوف، امراض کا خوف، درندوں کا خوف، سانپ کا خوف، چوروں اور ر لٹیروں کا خوف، سیلاب کا خوف، بجلی کی کڑک کا خوف اس کے اعصاب پر مسلط رہا اور اس کے دن کے آرام اور رات کی نیند کو حرام کرتا رہا۔ علم کی ترقی کے باوجود انسان آج بھی نامعلوم کے خوف کی گرفت سے پوری طرح آزاد نہیں ہو سکا۔ لکریشیس کی طرح ہابس، ہیوم، لباخ، کنڈورسے وغیرہ نے جذبۂ خوف کے حوالے ہی سے مذہب کی توجیہ کی ہے دوسری طرف کارل مارکس نے مذہب کو افیون کہا ہے کیونکہ وہ عوام کو اگلے جہان کی نعمتوں کی بشارت دے کر انہیں اپنے جائز حقوق کے لئے کشمکش کرنے سے روکتا رہا ہے۔

بعض اہل تحقیق احساس جرم کو جذبۂ مذہبیت کا لازمہ قرار دیتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ جہاں تک اسرائیلی مذہب کا تعلق ہے احساس جرم اور جذبۂ مذہبیت لازم و ملزوم رہے ہیں۔ مذہبی احساس جرم یہودیت سے شروع ہوا اور عیسائیوں میں سرایت کر گیا۔ یہودیوں کا خدا یہوواہ ایک قبائلی معبود تھا جس کے ہر حکم کو بجا لانا وہ اپنا مذہبی فرض سمجھتے تھے۔ یہوواہ کے احکام ان کی روزمرہ کی زندگی کی چھوٹی چھوٹی باتوں پر پھیلے تھے اس لئے قدرۃً انہیں ان کی تعمیل میں دقت محسوس ہوتی تھی اور لغزشوں سے اپنا دامن نہیں بچا سکتے تھے جس کے باعث ان کے دلوں میں احساس جرم گھر کر لیتا تھا اور وہ خطاؤں کی قربانیاں دے کر اپنے ضمیر کو مطمئن کر لیتے تھے۔

شروع شروع میں ان کے ہاں شیطان کا تصور موجود نہیں تھا۔ شیطان کو بابل کے ایام اسیری میں یہودیوں نے اپنے مذہبی عقائد میں شامل کیا۔ اسلئے وہ ہر بُرے کام کا ذمے دار شیطان کو نہیں بلکہ اپنی فطرت بد کو ٹھہراتے تھے۔ آبائے کلیسا پال، ولی آگسٹائین اور کلیمنٹ نے کہا کہ جب آدم نے حکم خداوندی کی سرتابی کرتے ہوئے ثمر ممنوعہ کھا لیا تو اس نے سنگین گناہ کا ارتکاب کیا تھا یہ گناہ آدم کی اولاد کو ورثے میں ملا ہے لہٰذا سب نوع انسان بالطبع بد باطن اور بد ضمیر ہے اور نیکی کرنے سے گریز کرتی ہے۔ جناب مسیح ہی ان کی شفاعت کر سکتے ہیں اور انہیں عذاب سے نجات دلا سکتے ہیں۔ اسی بنا پر جناب مسیح کو شفیع اور منجی کے القاب دیئے گئے۔ ازلی اور موروثی گناہ سے بحث کرتے ہوئے ولی امبروسی نے کہا کہ آدم اور حوا کی جنسی مواصلت ہی ان کا اصلی گناہ تھا جس سے بچنے کے لئے تجرد کی زندگی گذارنا لازم ہے۔ اس عقیدے کے باعث جنسی مواصلت سے گناہ کا احساس وابستہ ہو گیا جو جنسی آزادی کے باوجود آج بھی عیسائی دنیا کے لئے ذہنی اذیت کا باعث بنا ہوا ہے۔ بعد میں عیسائی تجربیت پسندوں مانسٹر اکہارٹ وغیرہ اور ولی فرانسس کے پیرووں نے گناہ کا ایک نیا فلسفہ پیش کیا اور کہا کہ بخشش کے لئے گناہ کرنا ضروری ہے کیوں کہ خدا کی رحمت صرف گنہگاروں ہی کے لئے جوش مارتی ہے اور گنہگار ہی خدا کے محبوب ہوتے ہیں۔

ہیلن گوڈز واکر نے لکھا ہے کہ حیاتیاتی پہلو سے مذہبیت کا جذبہ بے چارگی اور بے بسی کے طویل طفلی دور کی پیداوار ہے۔ ننھا بچہ قدم قدم پر اپنے ماں باپ کا سہارا لیتا ہے۔ جب وہ بالغ ہو جاتا ہے تو بے مہر دنیا کے مصائب کا سامنا کرتے ہوئے اس کے بچپن کی ناتوانی کا احساس اور تنہائی کا خوف از سر نو اس کے ذہن و قلب پر حاوی ہو جاتا ہے جس کا مداوا وہ مذہب میں تلاش کرتا ہے۔ جب تک مناسب تربیت اور تعلیم نے بچپن کی بے بسی اور ناتوانی کے احساسات پر قابو پا کر نامعلوم کے خوف کا ازالہ نہیں کر

ے FREUD

دیا جاتا اس وقت تک وہ مذہب کا محتاج رہے گا۔

جذبۂ مذہبیت کا ایک منفی پہلو یہ ہے کہ ہر اہلِ مذہب اپنے آپ کو راستی پر سمجھتا ہے اور دوسروں کو گمراہ خیال کرتا ہے جس سے تعصب، منافرت اور مذہبی جنون کو تقویت ہوتی ہے۔ بعض اوقات ایک ہی مذہب کے مختلف فرقے معمولی اختلافات کی بنا پر ایک دوسرے کو مردود اور مستحق ازل قرار دے کر ان کا گلا کاٹنے پر مستعد ہو جاتے ہیں۔ تاریخ عالم کے اوراق شاہد ہیں کہ تعصب بے جا اور مذہبی جنون کی تسکین کے لئے بے گناہوں کا خون بے دریغ بہایا گیا۔ طالع آزما صدیوں سے اپنے سیاسی مفادات کی پرورش کے لئے مذہب کے نام پر اپنے مخالفوں کو بے دردی سے کچلتے رہے ہیں اور مطمئن ضمیر کے ساتھ انہیں تلوار کے گھاٹ اتارتے رہے ہیں۔ اس نوع کی تنگ دلی اور شقاوت کا جواز یہ کہہ کر پیش کیا جاتا ہے کہ ہم تو مذہب کی خدمت اور اس کے فروغ کے لئے یہ اقدامات کر رہے ہیں۔ حکام کے اس ظلم و ستم میں پروہت، پادری، برہمن اور ملا اپنے سرپرستوں کا ساتھ دیتے رہے ہیں اور ان کے مخالفین کو کفر و زندقہ کے فتووں سے تیر باراں کرتے رہے ہیں۔ غالباً اسی لئے وِل ڈیوراں نے لکھا ہے کہ مذہب کے زوال کے بعد لوگوں میں رواداری کا جذبہ پیدا ہوا تھا۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ بنی اسرائیل کے صفحۂ تاریخ پر نمودار ہونے سے پہلے مذہبی جنون کا کہیں نام و نشان نہ تھا۔ سمیر، بابل، مصر، یونان، روم کے باشندے دوسری اقوام کے دیوتاؤں اور معبودوں کا احترام کرتے تھے اور بسا اوقات انہیں اپنی دیومالا میں شامل بھی کر لیتے تھے مثلاً سمیر کا اناج دیوتا دموزی بعد میں تموز، اڈونس، اتیس اور اوزیریس کی صورت میں معاصر اقوام کے مذاہب میں شامل کر لیا گیا۔ اسی طرح بابل کی حسن و عشق اور بارآوری کی دیوی عشتار کو ایران میں اناہتا، مصر میں آئسس، یونان میں افروڈائٹی اور روم میں وینس کے نام سے پوجنے لگے۔ یہودیوں کے قبائلی خدا یہواہ کا حکم تھا کہ تم میری ہی پوجا کرو گے، میرے نام ہی پر قربانیاں دو گے اور مجھی سے مرادیں مانگو گے جہاں کہیں کسی کو

میرے سوا کسی دوسرے معبود کی پوجا کرتے دیکھو تو بے تکلف اس کی گردن مار دو۔ چنانچہ یریحو کے شہر کی تسخیر کے بعد یہواہ کے حکم پر وہاں کے ہزاروں بوڑھوں، بچوں، مردوں عورتوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا اور سوائے ایک رنڈی کے جس نے انہیں شہر پناہ کے اندر آنے کا راستہ بتلایا تھا کسی کو زندہ نہ چھوڑا

نظر غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ مذہب کے دو پہلو ہیں: موضوعی اور معروضی۔ اس کا موضوعی پہلو یہ ہے کہ انسان اپنے معبودوں سے جذباتی رشتہ؎ قائم کرتا ہے۔ معروضی پہلو میں رسوم عبادت، تجرد و ریاضت، قربانی، دستور عمل اور علم کلام شامل ہیں۔ اب تک ہم نے عقیدے، جذبے اور احساس جرم کی بات کی اب معروضی پہلو رسوم عبادت وغیرہ کا ذکر آئے گا۔

جیسا کہ مسلک ارواح کے باب میں ذکر آچکا ہے جب روح (ہوا کا جھونکا یا سانس) کا تصور بھوت یا ہمزاد یا چلتی پھرتی لطیف کایا میں بدل گیا تو انسان نے اپنے پرکھوں کی ارواح کو پوجنا شروع کیا چنانچہ ہم قبر ہی کو پہلا مندر کہہ سکتے ہیں۔ یہی پوجا بعد میں منظم ہو کر دیو مالا اور مذہب کی صورتیں اختیار کر گئی۔ جس طرح روحوں کو شقی اور سعید یا نیک و بد میں تقسیم کیا گیا تھا اسی طرح دیوتا بھی دو گروہوں میں بٹ گئے ۱۔ ہمدرد اور خیر خواہ جو اس کی امداد کرتے تھے ۲۔ بدگن اور خبیث جو اس کے درپے آزار رہتے تھے۔ انسان کو ان دونوں کی تالیف قلب اور رضامندی مقصود تھی۔ خیر خواہ دیوتاؤں اور دیویوں کی پوجا شکریے کے اظہار کے لئے کی جاتی تھی اور بدگن دیوتاؤں اور دیویوں کو راضی رکھنے کے لئے پوجتا تھا مبادا وہ خفا ہو کر ایذا پہنچائیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ آج بھی ہندوؤں کے ہاں جو دیوتا یا دیوی جتنی زیادہ بد شکل اور کریہہ المنظر ہو اتنی ہی زیادہ عقیدت سے اس کی پوجا کرتے ہیں۔ کالی دیوی، گنیش اور جگن ناتھ اس کی معروف مثالیں ہیں۔ انسان نے دیوتاؤں کو اپنے آپ پر قیاس کیا تھا اور انہیں اپنے ہی عادات و خصائل اور جذبات و احساسات منسوب کئے تھے اس لئے قدرتاً اسے دیوتاؤں کو خوش اور راضی رکھنے کے لئے وہی طریقے اختیار کئے جو خود اس کی خوشی اور رضا کا باعث ہوتے ہیں۔ عام مشاہدے کی بات ہے کہ ہم سب لذیذ کھانے، اچھے

؎ جیمز والم ڈبلیو سمتھ کہتا ہے کہ عابد اور معبود میں منطقی رشتہ ہونا ضروری ہے۔ لہٰذا مذہب کا خدا لازماً ایک شخصیت

لباس اور کشادہ مکان کو پسند کرتے ہیں اور انہیں خوبصورت اور ہم خیال ساتھی کی تلاش ہوتی ہے۔ جس کے ساتھ وہ عیش کی زندگی گزار سکیں۔ چنانچہ انسان نے اپنے دیویوں دیوتاؤں کے لئے شاندار معبد تعمیر کئے جن کی دیواروں پر پھولدار نقاشی گری کی گئی اور در و دیوار کو دلآویز تصویروں اور مجسموں سے سجایا گیا۔ ان کے بت سونے چاندی کے ڈھالے گئے، انہیں اطلس و کمخواب کے لباس پہنائے گئے، انہیں قیمتی پتھروں ہیرے جواہرات، یاقوت لعل، زمرد، نیلم، پکھراج وغیرہ سے آراستہ کیا گیا۔ ان کی خواب گاہوں میں شمعیں جلانے کا اہتمام کیا گیا۔ ان کے سامنے کھانے کے اوقات میں لذیذ کھانے اور طرح طرح کی نعمتیں چنی جاتی تھیں۔ ہندو آج بھی دودھ اور اس سے بنی ہوئی اشیاء مکھن، بالائی اور دہی اپنے ٹھاکروں کی بھینٹ کرتے ہیں۔ پوجا کے وقت رنگ برنگ کے پھول ان کے چرنوں میں بکھیرتے ہیں قیمتی بخور سے مندروں کی فضا کو معطر کرتے ہیں۔ دیوتاؤں کے ذوقِ حسن کی تسکین کے لئے سینکڑوں پری چہرہ نوخیز دیوداسیاں ان کی خدمت میں کمربستہ رہتی تھیں اور دن میں دو تین بار ناچ کر اور گا کر ان کا جی بہلاتی تھیں۔ مندروں میں بیل اور بکرے کی زوجیت میں خوش شمائل لڑکیاں دی جاتی تھیں۔ دیوتاؤں کی ستائش و نیائش کے لئے لڑکوں اور لڑکیوں کے طائفے پرے باندھ کر اور سریلی آوازیں بلا سازوں کی گت کے ساتھ دلکش انداز میں بھجن اور گیت گاتے تھے جن میں ٹھاکروں کے لئے پرجوش عقیدت اور محبت کا اظہار کیا جاتا تھا۔ دیوتاؤں کو خوش رکھنے کے لئے ان کے سوانح پر مبنی ناٹک کھیلے جاتے تھے۔ چنانچہ یہ دیکھ کر چنداں حیرت نہیں ہوتی کہ جملہ فنونِ لطیفہ تعمیر، سنگ تراشی، مصوری، شاعری، موسیقی اور ناٹک مذہب ہی کے دامن میں پروان چڑھے تھے۔ معیشتی پہلو سے یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ ملک کی آمدنی اور محاصل کا کثیر حصہ مندروں اور پروہتوں ہی پر خرچ کیا جاتا تھا۔ چین کے قبضے سے پہلے تبت کی آمدنی کا ایک تہائی حصہ اس مکھن پر خرچ کیا جاتا تھا جس سے معبدوں کے چراغ روشن کئے جاتے تھے۔

ہوگی اور کسی آفاقی قانون یا مجرد وجودِ مطلق پر عقیدہ رکھنا مذہب نہیں ہوگا۔ چنانچہ بودھ، وحدت الوجودی اور ثنالیث.

عوام فاقوں کی زندگی گزارتے تھے اور پتھر اور لکڑی کی مورتیوں اور ان کے نگراں پروہتوں پر لاکھوں روپے بے دریغ لٹائے جاتے تھے۔ ملک کی زرخیز سیر حاصل اراضی معبدوں پر وقف کر دی جاتی تھی جس سے پروہت شاہانہ ٹھاٹ باٹ کی زندگی گزارتے تھے۔

پوجا کی رسوم کا مرکزی خیال یہ ہے کہ آدمی اپنے معبود کو خوش کرنے کے لیے اس کی بڑائی کرے اور اس کے سامنے اپنی عاجزی اور فروتنی کا اظہار کرتا رہے۔ اس کی سب سے معروف صورت رکوع (جھکنا) اور سجود ہے جو صابئین کے ہاں مروج تھی اور وہیں سے اکثر اقوام تک پہنچی۔ رکوع و سجود سے بندے کی مسکنت اور معبود کی عظمت و جلالت کا اظہار ہوتا ہے۔ یاد رہے کہ بادشاہوں کے سامنے بھی جو اپنے آپ کو معبودوں کے فرزند یا بھائی سمجھتے تھے۔ اسی طریقے سے کورنش بجالانے کا رواج تھا۔ اس کی انتہائی صورت ہندوؤں میں ہے جو بعض اوقات زمین پر ڈنڈے کی طرح لیٹ کر اپنے آپ کو گھسیٹتے ہوئے تیرتھ کی طرف جاتے ہیں۔ اکثر اقوام میں طواف بھی پوجا کا لازمہ رہا ہے۔ یہ رسم بھی صابئین سے یادگار تھی۔ ان کے خیال میں جس طرح سات سیارے خداوند خدا آفتاب کا طواف کرتے ہیں۔ اسی طرح بندوں کے لیے بھی مقدس معبدوں اور دیوتاؤں کے مجسموں کے گرد گھومنا ضروری ہے۔ ہندوؤں کے ہاں طواف کو پرکرما کہتے ہیں۔ اسلام سے پہلے کے عرب مرد عورتیں مادر زاد برہنہ ہو کر کعبے کا طواف کیا کرتے تھے۔

قربانی ایک ہمہ گیر مذہبی رسم ہے۔ یہ وہ مذہبی عمل ہے جس میں ذبیحہ یا بھینٹ کے واسطے سے قربانی کرنے والے کی مراد پوری ہوتی ہے یا اس کے گناہوں کا کفارہ ادا کیا جاتا ہے۔ قربانی وہ تحفہ یا نذرانہ تھا جو قدماء مافوق الطبع ہستیوں کو پیش کیا کرتے تھے تاکہ وہ ان کی خوشنودی یا رضا حاصل کر سکیں۔ زمانے کے گزرنے کے ساتھ جب دیوتا انسان سے دور تر ہوتے گئے۔ تو ان تک قربانی کا نذرانہ پہنچانے کے

لیے نائب ضروری ہو گئے۔

کے لئے رسوم، شعائر وضع کئے گئے۔ اگلا قدم یہ اٹھایا گیا کہ انسان نے عام نذرانے دینے کی بجائے ترک دنیا اور ترک لذات اور تجرد سے اپنی ذات کا نذرانہ دینا شروع[1] کیا۔

قربانی کا رواج سامیوں میں عام تھا۔ مولک اور بعل دیوتاؤں کے مذابح سال بھر خون سے تر بتر رہتے تھے۔ انسان کی قربانی افضل بھی جاتی تھی۔ اسے آفات و بلیات کے دفیعے کے لئے مؤثر اور بکار آمد سمجھتے تھے۔ رابرٹسن سمتھ[2] کے خیال میں قربانی کی رسم جملہ مذاہب میں بنیادی اہمیت رکھتی تھی۔ بات یہ ہے کہ قبل تاریخ سے خون اور اس کے حوالے سے سرخ رنگ حیات اور شباب کی علامت رہی ہے۔ لہٰذا اپنے دیوتاؤں کے حضور قربانی اس لئے کرتے تھے کہ سرخ خون کے باعث اُن کی زندگی طویل ہو اور ان کی توانائی بحال رہے۔ میکسیکو کے باشندے سورج دیوتا پر انسان قربان کرتے تھے۔ اُن کا عقیدہ یہ تھا کہ قربانی نہ کی گئی تو سُورج کی شعاعیں ماند پڑ جائیں گی اور وہ بجھ کر رہ جائے گا۔ یہودیوں نے پہلوٹھے کی قربانی کی رسم قدیم بابلیوں یا صابئین سے لی تھی۔ بعد میں مینڈھے کی قربانی ہونے لگی۔

اس کی معروف مثال جناب عبدالمطلب کے بیٹے جناب عبداللہ کی ہے۔ جن کے عوض ایک کاہنہ کے کہنے پر ایک سو اونٹ قربان کئے گئے تھے۔ یہودی اپنے کھیتوں کے پہلے خوشے اور اپنے پیڑوں کا پہلا پھل یہوواہ کو بھینٹ کرتے تھے۔ وہ خطا کی قربانیاں بھی دیتے تھے تاکہ یہوواہ ان کی خطائیں اور لغزشیں معاف کر دے۔ سوختنی قربانی بھی دی جاتی تھی اس کا طریقہ یہ تھا کہ کسی مقدس چٹان یا پتھر پر آگ جلا کر اس میں ذبیحہ کی انتڑیاں وغیرہ رکھ دیتے تھے — ذبیحے کے گوشت کے اچھے پارچے پروہتوں یا ربیوں کو دیئے جاتے تھے — عہد نامہ قدیم میں آیا ہے کہ یہوواہ کو یہ قربانی بڑی مرغوب تھی اور وہ اس کی خوشبو سونگھ کر خوش ہوا کرتا تھا۔ عام طور سے قربانی کے جانور کو مقدس سمجھا جاتا

---

[1] SACRIFICE, ITS NATURE AND FUNCTIONS

[2] RELIGION OF THE SEMITES, ROBERTSON SMITH

تھا چنانچہ ذبح کرنے سے پہلے مینڈھے یا بکرے کے سینگوں کو رنگتے تھے اور ان میں رنگ کے فیتے لٹکاتے تھے، ان کے جسم پر ریشمیں چادریں ڈالتے تھے، ان کی آنکھوں میں سرمہ لگاتے تھے، بالوں میں مہندی لگائی جاتی تھی۔ بعض اقوام میں سر کے بال منڈوا کر ان کی قربانی دی جاتی تھی۔ ہندو عورتیں آج بھی گیا کے مندر میں اپنے سر کے بال کٹوا کر بھینٹ دیتی ہیں۔ کسی دیوتا کے نام پر چند بالوں کی لٹ بھی رکھتے تھے جو کچھ مدت کے بعد بھینٹ کی جاتی تھی۔ یہ ظاہراً سر کی قربانی کا بدل بن گئی تھی۔ ہمارے دور افتادہ دیہات میں آج بھی بچوں کے سروں پر اسی مقصد کے لئے لٹیں رکھی جاتی ہیں۔ سب سے زیادہ ہولناک قربانی مولک دیوتا کے حضور کی جاتی تھی۔ پہلے مولک کے عظیم پیکر یا بت کے شکم میں آگ کا الاؤ روشن کرتے پھر ننھے بچوں کو اس کے آگے پھیلے ہوئے ہاتھوں کی ہتھیلیوں پر رکھ دیتے جن پر سے پھسل پھسل کر بچے مولک کے شکم میں بھڑکتے ہوئے شعلوں میں گر جاتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اس قسم کی قربانی سے بلائیں ٹل جاتی ہیں۔ جب رومیوں نے کارتھیج کا محاصرہ کیا اور اس پر ایک مدت گزر گئی تو کارتھیج کے شہری تنگ آ گئے اور انھوں نے امراء کے دو سو بچوں کی مولک پر سوختنی قربانی دی تھی۔ عرب لات کے بت پر انسانی قربانی کرتے تھے۔

آریائی اقوام میں بھی قربانی کی رسم موجود تھی جو ظاہراً سامیوں سے ماخوذ تھی۔ ایرانیوں کے ہاں قربانی کو یسنا اور ہندیوں میں اسے یجنا کہا جاتا تھا۔ ہندی آریاؤں میں قربانی کی تین بڑی رسمیں تھیں۔ نرمیدھ یگ (انسانی قربانی) اشومیدھ یگ (گھوڑے کی قربانی) گومیدھ یگ (گائے کی قربانی)۔ گھوڑے کی قربانی دینے سے پہلے ایک بکری ذبح کرتے تھے تاکہ وہ پہلے سے دیوتاؤں کے پاس جا کر انہیں گھوڑے کی قربانی کی خبر دے۔ سفید گھوڑے کا سینہ چاک کر کے اس کا دھڑکتا ہوا دل کھینچ کر باہر نکال لیتے تھے۔ اس گھوڑے کا گوشت بھی تبرکاً کھایا

جاتا ہے۔ اسی طرح گائے کی قربانی کا گوشت مہمانوں کو کھلاتے تھے۔ یجناولکیہ نے گائے کا گوشت کھانے کا ذکر کیا ہے یہ قربانیاں فی الحقیقت قدیم انسانوں کی اجتماعی ضیافت سے یادگار تھیں جن میں مقدس جانور یا ٹوٹم کا گوشت مل بیٹھ کر کھاتے تھے تاکہ اس کی طلسماتی توانائی ان میں بھی حلول کر جائے۔ کالی دیوی کے مندر میں انسانوں کو قربان کرنے کا رواج تھا یہ رسم ۱۹ ویں صدی عیسوی تک باقی تھی۔ آج کل کالی گھاٹ (کلکتہ) میں کالی کے مندر — میں بکریاں قربان کی جاتی ہیں اور اولاد کی خواہشمند عورتیں ان کا بہتا ہوا لہو چاٹتی ہیں جس سے کالی کے زرخیزی کی دیوی ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔ ٹھگ بھی کالی دیوی کے پجاری تھے اور اسی کے نام پر لوٹنے سے پہلے مسافروں کو گلا گھونٹ کر ہلاک کر دیا کرتے تھے۔ کانگڑہ کے قریب کالی دیوی کا مشہور معبد ہے۔ جہاں لوگ اپنی زبانیں کاٹ کر دیوی کو بھینٹ کرتے ہیں کہتے ہیں کہ دیوی کی برکت سے کٹی ہوئی زبانیں اسی وقت اپنی اصل حالت میں آجاتی ہیں۔ ہومر نے اپنی نظم الیڈ میں افی جینیا کی قربانی کا ذکر کیا ہے جب شاہ اگامیمنون کی قیادت میں یونانیوں کا بیڑا ٹرائے پر حملہ آور ہونے کے لئے جا رہا تھا تو ایک جگہ ہوا تھم گئی اور جہاز وہیں کھڑے کے کھڑے رہ گئے۔ یونانی سخت پریشان ہوئے پروہتوں نے کہا کہ بادشاہ سمندر کے دیوتا کے لئے اپنی لڑکی کی قربانی دے چنانچہ اگامیمنون نے اپنی بیٹی افی جینیا کو قربان کیا۔ تسخیر ٹرائے کے بعد پریام شاہ ٹرائے کی ایک بیٹی پولی زینا کو اکیلیس کی قبر پر ذبح کیا گیا اور دوسری بیٹی کساندرا کو اگامیمنون کی قبر پر قربان کیا گیا۔ یونانی اور رومی کسی جنگ کے شروع ہونے سے پہلے جنگ کے دیوتا کو کسی انسان، گھوڑے یا بیل کی قربانی دیا کرتے تھے فتح کے بعد قیدی بادشاہوں اور سرداروں کا جلوس نکالا کرتے جس کے خاتمے پر انہیں اپنے

دیوتاؤں کے مندروں میں ذبح کر دیا کرتے تھے۔ ایک نعمان کے بارے میں ذکر آیا ہے کہ وہ جنگی قیدیوں کو اپنے معبود کے بُت کے سامنے اپنے ہاتھ سے ذبح کیا کرتا تھا۔ دریائے نیل میں طغیانی لانے کے لئے مصری ایک جوان خوبصورت کنواری کو قیمتی لباس اور زیوروں سے آراستہ کر کے بیچ دریا غرق کر دیتے تھے تاکہ اس عروسِ نو کو پاکر نیل کا دیوتا خوش ہو جائے اور وقت پر طغیانی لائے۔ آج بھی مصر کے فلاحین مٹی کی بنائی ہوئی عورتیں جسے وہ عروس کہتے ہیں اس مقصد کے لئے ہر سال دریائے نیل میں غرق کرتے ہیں۔

خطا کی قربانیوں میں دو خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ یہودی سال میں ایک مرتبہ ایک بکرے یا بکری کی قربانی کیا کرتے تھے۔ طریقہ یہ تھا کہ سارے شہری مرد عورتیں بوڑھے بچے باری باری اس بکرے کو چھوتے گویا اپنی خطائیں اُسے منتقل کر رہے ہیں، پھر ایک عمودی چٹان پر سے دھکا دے کر نیچے گرا دیتے تھے۔ اکثر اقوام میں سال میں ایک مرتبہ کسی نوجوان کو قربانی کے لئے منتخب کر لیا جاتا تھا۔ اُسے دیوتا کا مثیل سمجھ کر سال بھر اس کی خوب خاطر مدارات کی جاتی، اُسے پُر تکلف کھانے کھلائے جاتے، قیمتی پوشاکیں پہننے کو دی جاتیں اور حسین لڑکیاں اُسے بہلانے پر مامور کی جاتیں۔ یہ نوجوان سارا سال عیش و عشرت میں غرق رہتا اور اسکے خاتمے پر اُسے ایک تقریب میں ذبح کر دیا جاتا تھا۔ لوگ سمجھتے کہ اس قربانی سے ان کی سال بھر کی لغزشوں اور کوتاہیوں کا کفارہ دے دیا گیا ہے۔ جے جی فریزر کے خیال میں مسیحا، شفیع اور منجّی (نجات دہندہ) کا تصور اسی رسم سے لیا گیا ہے۔ اسی بنا پر جناب عیسیٰ کو منجّی اور شفیع قرار دیا گیا اور کہا گیا کہ انھوں نے سُولی پر جان دے کر تمام نبی نوعِ انسان کے گناہوں کو بخشوا کر انھیں نجات دلا دی ہے۔ پُرانی ہندی قبائل میں ایک کچی بیاہی دوشیزہ قربان کی جاتی تھی۔ ایک تقریب میں اُس کا جلوس نکالتے اور بڑا پروہت ڈھولوں کی گھم دھم اور نفیریوں کی چیخوں کے شور میں

اُسے زمین پر لٹا کر ذبح کر دیتا تھا۔ یہی رسم جنوب ہند کے گونڈوں میں انیسویں صدی کے اوائل تک باقی رہی حتیٰ کہ انگریزوں نے اسے جرم قرار دے کر اس کا انسداد کر دیا۔ برہمن آج بھی چاول، گھی اور کھانڈ کے کھلونے اور مورتیاں بنا کر اپنے دیوتاؤں اور دیویوں کی بھینٹ کرتے ہیں۔ یہ مورتیاں انسانوں اور جانوروں کا بدل بھی جاتی ہیں۔ مجوسیوں کے آتش کدے میں گھی، برسم وغیرہ جلا کر بھینٹ کی جاتی ہے

مذہبی اخلاق یا دستورِ عمل شخصی املاک کے تحفظ اور قصاص کے اصول پر مبنی تھا زرعی انقلاب کے بعد جب انسان کھیتی باڑی کرنے لگا تو شخصی املاک کا تصور پیدا ہوا اور اراضی، گائے بیل بھیڑ بکری کی طرح عورتوں، غلاموں اور باندیوں کو بھی شخصی املاک میں شامل کر لیا گیا۔ قدیم ترین ضابطہ قوانین یا دستورِ عمل جو ہم تک پہنچا ہے اُسے شاہ حمورابی والیٔ بابل نے مرتب کیا تھا۔ یہ ضابطہ گلی الواح میں محفوظ ہے۔ اور دو سو پچاس شقوں پر مشتمل ہے جنہیں شخصی املاک، تجارت، محنت کشی، خانوادہ ایذا رسانی وغیرہ کی سرخیوں کے تحت مرتب کیا گیا ہے۔ اس کے قوانین املاک کے تحفظ اور قصاص کے اصول پر مرتب کیے گئے ہیں۔ آنکھ کے بدلے آنکھ اور دانت کے بدلے دانت اس کا سنگِ بنیاد ہے۔ زنا، اغوا، رہزنی، سرقہ اور مفرور غلام یا باندی کو پناہ دینے، شاہی املاک یا محل میں تصرف کرنے اور بادشاہ کے خلاف بغاوت کرنے کی سزا موت ہے۔ اس طرح حمورابی نے سلاطین، اُمراء، جاگیرداروں اور پروہتوں کی شخصی املاک کے تحفظ کا سامان کیا ہے اور عوام کو ان کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا ہے۔

مذہبی اخلاق کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اسے مرتب کرتے وقت معاشرے کے بدلتے ہوئے تقاضوں کا لحاظ نہیں کیا جاتا اور لوگوں کے سروں پر اوپر سے مسلط کر دیا جاتا ہے۔ شاہ حمورابی

نے اپنے ضابطے کے شروع میں ہی دعوے کیا ہے کہ یہ دستور عمل اسے شمس دیوتا نے دیا تھا مطلب یہ تھا کہ اس کی تعمیل ایک مذہبی فریضہ ہے۔ جو شخص اس سے روگردانی کریگا۔ وہ عاصی اور مرتد ٹھہرے گا۔ مذہبی اخلاق کے اوامر و نواہی ازلی و ابدی ہوتے ہیں۔ حالانکہ عملاً معاشی اور عمرانی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ اخلاقی قدریں بدلتی رہتی ہیں۔ شکار کے زمانے میں چوری، ڈاکے اور قتل کو مستحسن خیال کرتے تھے اور انہیں شیوہ جوانمردی مانتے تھے۔ زرعی انقلاب کے بعد انہیں سنگین جرائم قرار دے دیا گیا۔ اور ان کی سزا موت مقرر کی گئی۔ اخلاقی قدروں کے اضافی ہونے کی مثال جنسی اخلاق سے ملتی ہے۔ مادری نظام معاشرہ میں عورت کی عصمت اور بکارت کو معائب میں شمار کیا جاتا تھا اور لوگ باکرہ سے بیاہ کرنا پسند نہیں کرتے تھے۔ جیسا کہ آجکل کے قبائلیوں کے مشاہدے سے معلوم ہوتا ہے۔ زرعی انقلاب کے بعد جب عورت مرد کی ذاتی املاک بن گئی تو اس پر عصمت اور بکارت کی کڑی پابندیاں لگا دی گئیں مرد اپنی شخصی املاک اپنے ہی صلبی فرزندوں کے لئے چھوڑنا چاہتا تھا۔ اسلیئے عورت کی عصمت و بکارت ضروری قرار دے دی گئی۔ اس معاشرے میں کوئی مرد اپنی زوجہ کو کسی غیر مرد کے ساتھ ناگفتہ بہ حالت میں دیکھتا تو دونوں کو جان سے مار دینے کا مجاز تھا۔

مذہبی اخلاق کے بارے میں ایک بات اور بھی قابل غور ہے۔ اسکے ساتھ مخصوص قسم کی عصبیت وابستہ ہو جاتی ہے یعنی لوگ مذہبی عقیدے کی بنا پر اپنے ہم مذہبوں کو اپنا سمجھتے ہیں اور غیر مذہب والوں کو برا بھلا کہتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں نیک وہ ہے جو میرا مذہب رکھتا ہے خواہ وہ روزمرہ کی زندگی میں کتنا ہی بدکن ہو اور برا وہ ہے جو میرے مذہبی عقیدے پر ایمان نہیں رکھتا خواہ بذات خود وہ کتنا ہی راست باز اور نیک چلن ہو۔ اس طرح عمل کے بجائے عقیدہ حسن اخلاق کا معیار بن گیا ہے۔ نظری لحاظ سے مختلف مذاہب کے دانش ور انسان دوستی کے دعوے کرتے رہے ہیں اور اس کے حق میں

ڈال دیتے رہے ہیں لیکن عملاً وہ اپنے سے مختلف مذہبی عقیدہ رکھنے والوں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اس طرح اخلاقی قدروں کو مذہبی عقیدہ سے منسلک کرکے ان کے دائرہ عمل کو تنگ تر کر دیا گیا ہے جو شخص میرے مذہب کے دائرے کے اندر ہے وہ اچھا ہے اور جو اس دائرے سے باہر ہے۔ وہ برا ہے۔

مذہبی اخلاق کا ایک پہلو فردیت ہے یعنی اہلِ مذہب ذاتی نجات کے حصول کی خاطر اجتماعی مفاد کو پس پشت ڈال دیتے ہیں۔ ذاتی نجات کے حصول کے لئے بعض بہترین دل و دماغ رکھنے والے لوگ دنیا سے کنارہ کشی کرکے تجرد اور زاویہ نشینی کی زندگی گزارتے رہے اور اس دنیا میں عوامی بہبود کے لئے جدوجہد کرنے کے بجائے اپنی عاقبت کے سنوارنے کی فکر میں غلطاں رہے ہیں جس سے معاشرے کی ترقی پرور قوتوں کو ناقابلِ بیان صدمات پہنچتے رہے ہیں۔ قدماء کے خیال میں فرد معاشرے کے لئے ہوتا ہے۔ معاشرہ فرد کے لئے نہیں ہوتا ہے۔ اخلاقیات کے نقطۂ نظر سے انفرادی نجات کے حصول کے بجائے معاشرے کی بہبود کی کوشش زیادہ مستحسن ہے اور یہ مسلّم ہے کہ انا پرستی کے بجائے عمومی فلاح کا احساس اخلاقیات کو زیادہ محکم اساس فراہم کرتا ہے۔

آخر میں ہم علمِ کلام کا ذکر کریں گے علمِ کلام مذہب کی طرف سے معذرت خواہی کی ایک کوشش ہے جس کا منصب یہ ہے کہ مذہب کو عقلی اساس فراہم کی جائے۔ اس مقصد کے لئے متکلمین سائنس کے جدید ترین انکشافات اور مذہب میں مطابقت پیدا کرکے مذہب کی ازلی و ابدی صداقتوں کا اثبات کرتے رہتے ہیں۔ اس کی ضرورت یوں پیش آئی کہ سائنسدانوں نے طبیعی قوانین کا انکشاف کیا تو مذہب کے مابعد الطبیعی عناصر کو ٹھیس لگی۔ اہلِ نظر نے فطری مظاہر کو قانونِ سبب و مسبب کی روشنی میں دیکھنا شروع کیا۔ طوفانِ رعد، زلزلے، کوہِ آتش فشاں، شہابِ ثاقب، سلسلۂ شب و روز، غروبِ آفتاب

و ماہتاب، گردشِ سیارگان وغیرہ کی علمی توجیہہ کی جس سے مذہبی خرقِ عادت کا بھرم کھل گیا اور لوگوں کا اعتماد مذہب پر سے ڈگمگانے لگا۔ اہلِ مذہب بالعموم اور پروہت بالخصوص اس صورتِ حالات سے قدرتہً سخت پریشان ہوئے اور تحقیقی علوم کی مخالفت پر کمربستہ ہو گئے۔ انھوں نے علمی تحقیق کے راستے میں قدم قدم پر روڑے اٹکانا شروع کئے۔ اور سائنس دانوں اور فلاسفہ کو ہراساں کرنے کی مہم شروع کی لیکن یہ کوششیں ناکام ثابت ہوئیں اور بالآخر پروہتوں کو بھی سائنس کے انکشافات کی صداقت کو تسلیم کرنا پڑا۔ اب انہوں نے پینترا بدلا اور سائنس کی مخالفت کرنے کی بجائے انکے دریافت کئے ہوئے حقائق سے اپنے اپنے مذہب کی صداقت کی توثیق کا کام لینے لگے اور یہ دعویٰ کیا کہ سائنس کے انکشافات کا راز ان کی مذہبی کتابوں سے لیا گیا ہے۔ اس دعوے کے اثبات کے لئے مذہبی کتابوں کے لفظوں کی عجیب و غریب تاویلیں کیں اور ان میں سائنسی صداقتوں کو گھسیٹ کر مذہب اور سائنس میں مفاہمت کرنے کا جتن کرنے لگے سائنس اور مذہب کی مطابقت کی اسی کوشش کو علمِ کلام کا نام دیا گیا ہے جس کے وسیلے سے یہودی (فلو یہودیہ) عیسائی (طامس اکوئناس، ایلارڈ) مسلمان (غزالی، رازی) اور ہندو (رادھا کرشنن، آروبندو گھوش) متکلمین اپنے اپنے مذہب کی ازلی و ابدی صداقتوں پر استدلال کرتے رہے ہیں۔

علمِ کلام مذہب کی تنزل پذیری کی نشاندہی کرتا ہے جب عقائد کمزور اور جذبۂ مذہبیت سرد پڑ جاتا ہے تو اہلِ مذہب شکوک و شبہات کی خلش سے بچنے کے لئے تاویل آرائی سے رجوع لاتے ہیں سینٹے آنا نے کہا ہے۔

”مذہب وہ دانش نہیں رہا جس کا اظہار تخیل میں ہوا ہو بلکہ توہم بن گیا ہے جس پر دلائل کے پردے ڈال دیئے گئے ہیں۔“

آج کل مذہب دو چیزوں پر مشتمل ہو کر رہ گیا ہے۔ رسوم عبادت اور علمِ کلام۔ عوام کی اکثریت

پوجا پاٹھ اور عبادت کی رسمیں ادا کرنے پر اکتفا کرتی ہے۔ پڑھے لکھے لوگ تاویلات کے چکروں میں پڑے ہوئے ہیں مذہب کی روح یعنی عقیدہ اور جذبہ غائب ہو چکے ہیں۔ چھلکا باقی رہ گیا ہے مغز باقی نہیں، اخلاق کا رابطہ عمل سے منقطع ہو چکا ہے جو شخص ظاہری رسوم عبادت ادا کرتا ہے وہ اچھا ہے خواہ اسکے اعمال کتنے ہی بُرے ہوں اور جو آدمی ان ظاہری رسوم کو ترک کر دیتا ہے وہ بُرا ہے خواہ وہ کتنا ہی اچھا آدمی ہو۔ اہلِ مذہب ظاہرداری، ریاکاری اور تاویل آرائی سے کام لے رہے ہیں عقیدے، جذبے اور حسنِ عمل سے چنداں اعتنا نہیں کیا جاتا۔

مذہب کے اجزائے ترکیبی کے بعد ہم تقابلی مذہب کا ذکر کریں گے۔ جسے مذہب کے بارے میں سابقہ افکار بدل کے رکھ دیئے ہیں۔ تقابلی مذہب کا آغاز باقاعدہ طور پر یورپ اور امریکہ میں اٹھارویں صدی کے اواخر میں ہوا لیکن اس شعبۂ علم کی تاسیس کا سہرا ابن حزم ظاہری، البغدادی شہرستانی اور محسن فانی کے سر ہے۔ جنہوں نے قدیم و معاصر مذاہب کا موازنہ کر کے دلچسپ نتائج اخذ کئے تھے۔ ان علماء کا اندازِ بیان کہیں کہیں تلخ اور جارحانہ ہو گیا ہے۔ لیکن ان کی فکری و ذہنی دیانت پر شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ کبھی کبھی جوشِ بیان میں وہ ان فرقوں پر جو عقائد میں ان سے اختلاف رکھتے ہیں الحاد و زندقہ کے فتوے بھی صادر کر دیتے ہیں۔ محسن فانی کا طرزِ تحریر نسبتاً زیادہ معروضی ہے جو اس کے وسعتِ مشرب پر دلالت کرتا ہے ان علماء نے صابیت، کثرت پرستی، مجوسیت، بدھ مت، یہودیت اور عیسائیت اور اسلام کا تقابلی مطالعہ کیا ہے۔ ہمارے زمانے میں دوسرے علوم کے دوش بدوش تاریخ تمدن کو نمایاں فروغ حاصل ہوا۔ ماہرینِ آثارِ قدیمہ نے گراں قدر انکشافات کئے جن سے سُمیر، مصر، بابل فنیقیہ وغیرہ قدیم تمدنوں اور تہذیبوں کے ایسے گوشے بے نقاب کئے گئے جن پر صدیوں سے زمانے کی گرد پڑی ہوئی تھی۔ علاوہ ازیں علم الانسان، جادو، اور دیومالا کے مطالعے نے بھی فکر و نظر کی

نئی نئی راہیں کھول دیں۔ ان تحقیقات کی روشنی میں جن اہل علم نے تقابلی مذہب کو از سر نو مرتب کیا اور اسے سائنٹیفک صورت عطا کی ان میں درکھائیم، رابرٹسن سمتھ، فریزر، ٹائلر، ویسٹر مارک اور مالنوسکی کو امتیازی مقام حاصل ہے۔ ان علماء نے مذاہب قدیم کے عقاید و رسوم کا دقت نگاہ سے مطالعہ کیا اور ان کے اصل ماخذ کا کھوج لگانے کی کاوش کی۔ ان کی تحقیق سے جو نتائج فکر سامنے آئے ان کا ذکر کرتے ہوئے جیمز فریزر لکھتے ہیں۔

"نوع انسان کے عقائد اور اداروں کا تقابلی مطالعہ اہل علم ہی کے ذوق تجسس کی تسکین کا باعث نہیں ہوتا بلکہ اگر احتیاط برتی جائے تو ترقی کا باعث بھی ہو سکتا ہے کیونکہ وہ بعض ایسی بنیادوں کے کھوکھلے پن کو بھی واشگاف کر دیتا ہے جن پر موجودہ معاشرہ تعمیر کیا گیا ہے اور جو فی الحقیقت توہمات کی ریت پر اٹھائی گئی ہیں۔ ایسی بنیادوں کو اکھاڑنا جو صدیوں سے انسان کے لئے مصائب و آلام کے وقت پناہ گاہوں کا کام دیتی رہی ہیں کوئی خوشگوار کام معلوم نہیں ہوتا لیکن زود یا بدیر تقابلی مطالعہ ان شکستہ دیواروں پر جو ہزاروں مقدس یادوں کی گھنی بیلوں، گھاس پھوس اور پھولوں سے ڈھکی ہوئی ہیں رخنے ڈال دے گا۔ اسوقت تو ہم توپوں کو کھینچ تان کر ہی آگے لا رہے ہیں ان کے داغنے کا وقت ابھی نہیں آیا۔ قدیم بوسیدہ و شکستہ عمارتوں کو گرا کر ان کی جگہ مضبوط اور خوبصورت عمارتیں بنانا مستقبل ہی میں ممکن ہو سکے گا لیکن عدم تحقیق اور قدامت کا یہ پاس و لحاظ ہماری راہ میں رکاوٹ نہیں بن سکتا اور ہم بوسیدہ سانچوں کو خواہ وہ کیسے ہی خوبصورت کیوں نہ ہوں نظر انداز نہیں کر سکتے۔ ہم تو صرف حق و صداقت کی پیروی کر سکتے ہیں خواہ وہ ہمیں کہیں بھی لے جائے اور خواہ اسکا نتیجہ کچھ بھی ہو۔ صداقت وہ تابناک ستارہ ہے جو ہماری رہنمائی کر سکتا ہے۔"

جولین ہکسلے نے تقابلی مذہب کے حدود و بحث کا ذکر کرتے ہوئے لکھا تھا۔

---

[1] MAN GOD AND IMMORTALITY

"تقابلی مذہب نوعِ انسان کے عقائد و اعمال کا مطالعہ ہے جس طرح علم الابدان حیوانات کی جسمانی ساخت کا تقابلی مطالعہ ہے اسی طرح علم الانسان انسان کی ذہنی ساخت کا تجزیہ ہے آپس میں مختلف مذاہب کے اختلاف و تشابہ اور ان کے مآخذ کا ارتقائی جائزہ سے کہ ان کی اصل حقیقت کا کھوج لگایا جا سکتا ہے۔ اور ان لوگوں کو جو نئے نئے مذہبی نظریات پیش کرتے رہتے ہیں معلوم ہو جاتا ہے کہ حقائق کی اصل شکل و صورت کیا ہے اور انہوں نے کیا بنا رکھی ہے۔"[1]

تقابلی مذہب کے مباحث کا مسلک ارواح، جادو، دیومالا اور علم الانسان کے ساتھ گہرا رشتہ ہے۔ اسلئے ان علوم کی تحقیقات میں توارد کا ہو جانا قدرتی امر ہے۔ اتنا ضرور ہے کہ تقابلی مذہب کا دائرہ تحقیق ان علوم سے کہیں زیادہ وسیع ہے کہ اس میں وحشی قبائل کے علاوہ متمدن اقوام کے رسوم و شعائر اور دستورِ اخلاق و عمل معرضِ بحث میں آ جاتے ہیں۔ یہاں اس بات کا ذکر کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ تقابلی مذہب ایک نہایت وسیع زرخیز اور سیر حاصل موضوع ہے لہٰذا ان اوراق میں سمیٹنا محال نہیں تو مشکل ضرور ہے اس اشکال کے پیشِ نظر ہم نے تقابلی مذہب کا اجمالی مطالعہ کرنے پر کفایت کی ہے چنانچہ ہم آئندہ صفحات میں صابئیت اور مجوسیت کے ان اثرات ہی کا مختصر تجزیہ کر سکیں گے جو اسرائیلی مذاہب — یہودیت، عیسائیت اور اسلام — پر مرتسم ہوئے ہیں، اس کے ساتھ دراوڑی مت کی ان روایات کا ذکر بھی مناسب ہوگا جو ہندی آریائی کے مذہب میں آج بھی باقی و برقرار ہیں۔ دنیا کے اکثر مذاہب سورج کی پوجا اور لنگ پوجا سے نکلے ہیں ہم سورج کی پوجا کا ذکر صابئیت اور مجوسیت اور لنگ پوجا کی وضاحت دراوڑی مت کے حوالے سے کریں گے۔ ایک بات کا ذہن نشین کر لینا ضروری ہے کہ قدیم زمانے سے سورج کی پوجا لکھے پڑھے دانش ور طبقے میں مقبول رہی ہے جب کہ لنگ پوجا سے اکثر و بیشتر ان پڑھ عوام دلچسپی لیتے رہے ہیں

---

[1] RELIGION WITHOUT REVELATION

جیسا کہ مختصر ذکر آ چکا ہے صابیت بابل ہی کا مسلک تھا۔ صابئین سورج کو نیر اعظم اور خداوند خدا کہتے تھے اور بعل مردوخ کے نام سے اسے پوجتے تھے۔ بعد کو بابلیت میں شمش کو سورج دیوتا مانا جاتا تھا۔ صابئین بابل سورج اور اسکے گرد چکر لگانے والے ان سیاروں کی پرستش بڑے اہتمام سے کرتے تھے۔ ان سب کیلئے الگ الگ معبد تعمیر کئے گئے جہاں ان کے سجے سجائے بت رکھے گئے۔ ان کے نام پر ہفتے کے سات دن معین کئے گئے اور ہر ایک دن انہی سیاروں کے نام پر رکھا گیا۔ پروہتوں نے ان کی گردش کا صدیوں تک مشاہدہ کیا اور علم ہیئت ایجاد کی۔ انہوں نے سورج گرہن اور چاند گرہن کا راز بھی معلوم کر لیا تھا۔ اس طرح سائنس اور مذہب دونوں صابیت کے دامن میں پرورش پاتے رہے۔ صابئین اپنے دیوتاؤں کو خوش رکھنے کے لئے جانوروں کی قربانیاں چڑھاتے تھے اور اس قربانی کے واسطے سے ان سے مرادیں مانگتے تھے۔ ان کی قربانیوں کے طریقے بعد میں اسرائیل، کنعان، یونان اور روم میں رائج پا گئے۔ سوختنی قربانی اور خطا کی قربانی بھی بابلیوں سے یادگار تھی۔ مولک کے سامنے بچوں کی سوختنی قربانی کے ساتھ بیلوں، بکریوں اور سفید بھیڑوں کی قربانی بھی کرتے تھے۔ بچھڑے کی قربانی بھی دی گئی تھی۔ صابئین نے اپنے معبدوں کے لئے عظیم الشان معبد تعمیر کئے اور ان میں رصد گاہیں بنائی گئی تھیں جن پر سے تاروں کو دیکھ کر وہ اجرام فلکی کا مشاہدہ کیا کرتے تھے۔ ان کے معبد میں ایک قربان گاہ ہوتی تھی جس کے سامنے ایک کشادہ ایوان تعمیر کیا جاتا تھا۔ ایوان کے باہر صحن میں حوض وضو ہوتا تھا۔ معبد میں پجاریوں اور نمازیوں کی عبادت گاہیں اسی معبد کے نمونے پر تعمیر کی گئی تھیں۔ مسجدوں میں محراب کی جگہ بابلی دیوی عشتار کی مورتی رکھی جاتی تھی۔ مسجدوں کا حوض وضو بھی صابئین کے معبدوں سے یادگار ہے۔ صابیوں میں کہانت کی روایت موجود تھی۔ کہانت کا لغوی معنی ہے پیش گوئی کرنا اور غیب کی باتیں بتانا۔ انہیں عارف بھی کہتے تھے۔ کاہن (لغوی معنی غیب بین) وجد و حال کی حالت میں غیب کی باتیں بتاتا تھا۔ اسرائیل، یونان، روم اور عرب کے ہر معبد میں ایک

کاہنہ یا کاہن رہتا تھا جب کوئی شخص ان سے غیب کی بات پوچھتا تو کاہن بخور جلاتے جن کی خوشبو میں وہ مست و بیخود ہو جاتے اسکے ساتھ سازوں کی دلآویز سُریں بلند ہوتیں جنہیں سن کر وہ از خود رفتہ ہو جاتے اور وارفتگی کے اسی عالم میں مُقفّیٰ جملوں میں پیش گوئی کرتے تھے۔ عرب میں اسلام سے پہلے کاہن اسی طرح غیب بینی کیا کرتے تھے۔ بخاری میں ان کے نام گنائے گئے ہیں یہودیوں کے ہاں کہانت (عرافت) کی روایت نے رواج پایا تو کاہن کو عبرانی میں نبی کہنے لگے (نبا سے مشتق ہے بمعنی خبر دینے والا) یعنی جو غیب کی خبر دیتا ہے۔ عہد نامہ قدیم میں اس قسم کے کئی مجذوبوں اور نبیوں کا ذکر آیا ہے جو نبوّت کرتے تھے یعنی غیب کا حال بتلاتے تھے۔

یہودیوں نے رکوع و سجود کے طریقے بھی صابئین اور مجوسیوں سے سیکھے تھے بجز مینوں، یہودیوں عیسائیوں اور مسلمانوں میں نماز پڑھنے کے طریقے بھی صابئین سے لئے گئے ہیں۔ صابئین ایک مہینے کے روزے بھی رکھتے تھے۔ وہ مقدس چٹانوں کا طواف کرتے اور اپنے معبدوں کو غلاف سے ڈھک دیتے تھے مکہ اور حمص میں مقدس پتھروں کے لئے معبد تعمیر کئے گئے تھے جن کی پوجا ان کا طواف کر کے کی جاتی تھی۔ جناب سلیمان نے جس مقدس چٹان پر اپنا مشہور ہیکل تعمیر کروایا تھا۔ اسی جگہ آجکل قبۃ الصخرا یا چٹان کا گنبد موجود ہے جسے ہیکل سلیمان کی بربادی کے بعد مسلمانوں نے مقدس چٹان پر بنوایا تھا۔ اس چٹان کو القدس کہتے ہیں اور اسکے حوالے سے یروشلم کو بیت المقدس کہا جاتا ہے۔ ایک روایت کے مطابق آنحضرت اسی چٹان سے معراج پر روانہ ہوئے تھے ابتدا میں مسلمان اسکی طرف رخ کر کے نمازیں پڑھا کرتے تھے۔ نمازوں کے اوقات بھی صابئین بابل سے ماخوذ تھے۔ یہی صخرۂ مقدس یہودیوں کا قبلہ تھا۔ نمازوں کا تعلق سورج کی گردش سے تھا۔ طلوعِ آفتاب کے وقت اشراق کی نماز پڑھی جاتی تھی جو شکرانے کی نماز تھی کہ بارے سورج نکل آیا ہے اسکے بعد دو نمازیں زوال و اخیر جو افسوس کی نمازیں تھیں کہ سورج لحظہ بہ لحظہ وہ ڈوبتا جا رہا ہے

پھر غروب کی نماز تھی ۔ اس کے بعد وہ نمازیں رات کی تھیں جن میں سورج کے دوبارہ اندھیرے سے نمودار ہونے کے لئے دعائیں مانگتے تھے ۔ پھر پو پھٹنے کی نماز تھی جب سورج کے طلوع کے واضح آثار نمایاں ہو جاتے ہیں ۔ صابئین کے ہاں جنازے کی نماز بھی پڑھتے تھے جس میں سجدہ نہیں کیا جاتا تھا ۔ وہ ہر نماز سے پہلے وضو کرتے تھے ۔ اور ان میں غسل جنابت کا رواج بھی تھا ۔ مجوسیوں نے ۱ صابئین کی سات نمازوں سے اپنی پانچ نمازیں لی ہیں اور وہ بھی سورج کی گردش ہی کے اوقات پر متعین کی گئی ہیں تین بڑی نمازیں طلوع آفتاب ، ڈھلتے زوال اور غروب آفتاب کے وقت پڑھتے ہیں ۔ ہندی آریا بھی ایران کے دوران قیام میں صابئین کے مذہب سے متاثر ہوئے تھے ان کے ہاں بھی سات دنوں کے نام سات دیوتاؤں کے نام پر رکھے گئے ہیں اور وہ بھی طلوع و غروب آفتاب کے وقت سندھیا کرتے ہیں جو ان کی نمازیں ہیں ۔ طلوع آفتاب کے وقت برہمن خاص اہتمام سے منتر گائتری پڑھتے ہیں جو ان کا مقدس ترین منتر ہے ۔ اس میں سورج ہی کی تمجید و ستائش کی گئی ہے ۔ ہندو بھی ایک قمری ماہ کے روزے رکھتے ہیں جنہیں چاند کے نام پر چندریان کہا جاتا ہے ۔ صابئین کی ہیئت میں آسمان کے بارہ برجوں کا ذکر کیا گیا ہے یہودیوں کے بارہ قبائل ، یونانیوں کے بارہ دیوتاؤں اور بارہ اولیاء و آئمہ کی حدیث میں بارہ کے ہندسے کا تقدس کارفرما ہے ہفتے کے سات دن ، سرگم کے سات سُر ، اسمٰعیلیہ یا سبعیہ کے سات امام ، سات آسمان ، ہندوؤں کے سپتک رشی ، سات برکش ، سات جزیرے وغیرہ صابئین کے سات سیاروں کی یاد دلاتے ہیں ۔ سر سید احمد خان نے صابئین کے مذہب اور اسلام کے مشترکہ عقائد و رسوم کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے ۲ "صابیوں کے ہاں سات وقت کی نمازیں تھیں اور وہ ان کو اسی طرح ادا کرتے تھے جس

جس طرح مسلمان ادا کرتے ہیں ۔ مردے کی نماز بھی وہ پڑھا کرتے تھے ۔ مسلمانوں کی طرح وہ بھی ایک قمری مہینے کے روزے رکھتے تھے ۔۔۔ ان میں اعتکاف کا رواج بھی تھا اور

---

۱ ۔ مجوسی نماز کو گاہ کہتے ہیں پنج گاہ ، پانچ گاہ کی ترکیب اسی لفظ سے مشتق ہیں ۔ ۲ ۔ مضامین سرسید

غاروں اور پہاڑوں میں چند روز مراقبہ اور سکوت میں بسر کرتے تھے . . . . . اوقات نماز جو اسلام میں مقرر ہیں اور جن کی تعداد سات یا پانچ یا تین ہے مذہب صابئی اور مذہب یہود کی اوقات نماز سے بہت مشابہ ہیں ۔ اسلام میں نماز پڑھنے کا جو طریقہ ہے وہ صابئی مذہب اور یہود کے مذہب کے طریقے سے نہایت مماثل ہے ۔ نماز دلوں کی صفائی کے لئے تھی اور یہی اصل منشاء نماز کے مقرر کرنے کا تھا اور جسم اور پوشاک وغیرہ کی صفائی جسکے واسطے اسلام میں حکم ہے صابئیوں اور یہودیوں کی اسی قسم کی رسومات سے بہت مشابہت رکھتے ہیں . . . مذہبی امور میں صرف ایک بات اسلام میں نئی ہے جو کسی اور مذہب میں نہیں پائی جاتی یعنی نماز کے بلانے کے لئے یہودیوں کی قرنا بجانے اور عیسائیوں کے گھنٹے بجانے کے بدلے اذان مقرر کی گئی ہے . . . تمام قربانیاں جو مذہب اسلام میں جائز ہیں مذہب یہود کی قربانیوں کے مشابہ ہیں ۔ مذہب اسلام میں جو روزے ہیں وہ بھی مذہب یہود اور مذہب صابئی کے روزوں سے مشابہ ہیں بلکہ صابئی مذہب کی بہ نسبت یہودی مذہب کے روزوں سے زیادہ مشابہت رکھتے ہیں ۔ ہفتے کے ایک معینہ دن میں نماز اور دیگر رسوم مذہبی کے وقت مقررہ وقت پر لوگوں کو کار ہائے دنیوی سے منع کرنا یہودیوں کی اسی قسم سے مطابقت رکھتا ہے . . . ختنہ بھی وہی ہے جس کا یہود اور پیروان حضرت ابراہیم کے ہاں دستور تھا ۔ نکاح اور طلاق کا بھی قریب قریب ویسا ہی قاعدہ ہے جیسا کہ اور الہامی مذاہب میں تھا . . . بعض عورتوں سے نکاح کرنے کے جواز اور عدم جواز میں جو احکام مذہبی ہیں وہ اکثر باتوں میں یہودیوں کے

احکام کے مشابہ ہیں۔ جنب مرد یا عورت کو مسجد میں جانے یا قرآن مجید کو چھونے کا امتناع انکی دستوروں سے مشابہت رکھتا ہے جو مذہب یہود میں جاری ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ سؤر کے گوشت کے کھانے کی نسبت جو احکام مذہب اسلام میں ہیں وہ موسوی شریعت کے نہایت ہی مشابہ ہیں بلکہ علمائے اسلام نے وہ تمام مسائل موسوی شریعت سے مستنبط کئے ہیں۔ شراب خوری اور مسکرات کا امتناع بھی موسوی شریعت کے مشابہ ہے ان اسلام نے ہر حالت میں حرام کر دی ہے ۔ مسلمان فقہا نے ارتداد کی سزا قتل قرار دی ہے یہ بھی موسوی شریعت کے مماثل ہے ۔ ۔ ۔ مذہب صابئی کے عقائد سے اسلام بالکل مماثل تھا ۔

اس بات کی جانب توجہ دلانا مناسب ہوگا کہ صلوٰۃ ، ملک (فرشتہ) مصحف (الہامی کتاب) شیطان ، صدقہ زکوٰۃ ، عشر وغیرہ کے الفاظ عبرانی زبان ہی سے عربی میں آئے ہیں ۔ یہودیوں کا شولوم علیخم (تم پر سلامتی ہو) مسلمانوں میں سلام علیکم بن گیا ہے ۔ متعہ بھی یہودیوں کے ہاں رائج تھا ۔ ہر گروہ کے الفاظ میں ربی شمان اور راب جب سفر کرتے تو ہر شہر میں عورتوں سے عارضی نکاح کرتے تھے ۔ مسلمانوں میں امام مالک اور امام جعفر صادق متعہ کے قائل ہیں کیوں کہ عہد رسالت اور خلیفۂ اول کے زمانے میں متعہ کا عام رواج تھا۔ یہودیوں نے صدقہ ، زکوٰۃ اور عشر کنعانیوں کے وسیلے صابئین سے اخذ کئے تھے جن میں یہ محصولات پروہتوں کی مدد معاش کے لئے لگائے جاتے تھے ۔ جیسا کہ آئندہ اوراق میں ذکر آئے گا شیطان اور فرشتوں کے تصورات مجوسیوں سے یہودیوں نے لئے تھے اور پھر عیسائیت اور اسلام میں رائج ہو گئے ۔ اسلامی شریعت اور فقہ بھی شریعت موسوی کے مانند قصاص پر مبنی ہے اور اسکا اصول یہی ہے ۔ "آنکھ کے بدلے آنکھ دانت کے بدلے دانت" ختنہ بنی اسرائیل مصر سے لائے تھے مصر میں دھرتی دیوی کے پجاری اپنے آلات تناسل کاٹ کر دیوی کو بھینٹ کیا کرتے تھے ۔ بعد میں صرف حشفہ

؎ MUHAMMADANISM

کاٹ کر اسکا نذرانہ دیئے گئے جس سے ختنہ کی رسم کا آغاز ہوا ۔

ی اور مجوسیت کے اثرات اسرائیلی مذاہب کے رسوم و شعائر تک ہی محدود نہیں رہے بلکہ ان کے افکار
وح کی گہرائیوں تک متاثر کیا۔ تکوین کائنات، تخلیق آدم، عالمگیر سیلاب، شیطان، فرشتوں، جنت و دوزخ
شفیع اور مہدی کے تصورات کا ماخذ بھی صابئیت اور یہودیت ہی کو سمجھا جا سکتا ہے ۔

" تکوین کائنات اور تخلیق آدم کے متعلق سامی روایت یہ ہے کہ خداوند خدا ایل مردوخ نے چھ دنوں
ئنات کو بنایا اور ساتویں دن آرام کیا چنانچہ ساتواں دن آرام کا دن مقرر ہوا۔ کلدانی اس دن کو
ہوتا کہتے تھے جو یہودیوں میں سبت یا سنیچر کا دن قرار پایا۔ بعد میں عیسائیوں نے اتوار کو اور مسلمانوں نے
یا اپنا سبت بنا لیا۔ شہر نینوا کے کھنڈر سے سینکڑوں گلی الواح برآمد ہوئی ہیں جنہیں شاہ اشور بنی پال کا
خانہ کہا جاتا ہے ان میں تکوین و تخلیق کی کہانی سات الواح پر لکھی ہوئی ہے۔ ان میں بتلایا گیا ہے
مردوخ نے کائنات کے بنانے کے بعد اپنے خون سے گوندھ کر مٹی کا ایک پتلا بنایا اور پھونک مار کر اسے
یا۔ یہ آدم باغ میں ہنسی خوشی اپنے دن گزار رہا تھا کہ ایک عفریت اوئس نے اسے علوم و فنون سکھائے
غ میں سیب کا ایک درخت تھا جس کا پھل چکھنے کی ممانعت کی گئی تھی۔ آدم نے اپنی زوجہ کی ترغیب
ب کھا لیا۔ اور انہیں باغ سے نکال دیا گیا۔ یہ بابلی روایت خفیف رد و بدل کے ساتھ مجوسیت اور
ودیت کے مذاہب میں اخذ کر لی گئی۔ عہد نامہ قدیم میں تکوین و تخلیق کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا ہے

_ "سو آسمان اور زمین اور ان کے کل لشکر کا بنانا ختم ہوا اور خدا نے اپنے کام کو جسے
وہ کرتا تھا ساتویں دن ختم کیا۔ خدا نے ساتویں دن کو برکت دی اور اسے مقدس ٹھہرایا"

_ " اور خدا نے زمین کی مٹی سے انسان کو بنایا اور اسکے نتھنوں میں زندگی کا دم پھونکا
تو انسان جیتی جان ہوا "

"اور خداوند خدا نے مشرق کی طرف عدن میں ایک باغ لگایا اور انسان کو جسے اُسنے بنایا تھا وہاں رکھا۔"

"اور خداوند خدا نے کل دشتی جانور اور ہوا کے کل پرندے مٹی سے بنائے اور ان کو آدم کے پاس لایا کہ دیکھے وہ ان کے کیا نام رکھتا ہے۔ اور آدم نے جس جانور کو جو کہا وہی اُسکا نام ٹھہرا۔"

"اور خداوند خدا نے اس پسلی سے جو اس نے آدم سے نکالی تھی ایک عورت بنا کر اُسے آدم کے پاس لایا۔"

اسکے بعد لکھا ہے کہ کسطرح سانپ (یوحنا عارف کے مکاشفے میں اسے شیطان کہا گیا ہے جو سارے جہان کو گمراہ کرتا ہے) نے حوا کو ورغلا کر شجر ممنوعہ کھانے کی ترغیب دی، اور کہا کہ اسکے کھانے سے نیکی اور بدی کی پہچان ہو جائے گی، اور عقل آ جائے گی۔ آدم نے بھی حوا کے کہنے پر یہ پھل کھایا اور دونوں اپنے آپ کو ننگا محسوس کرنے لگے۔ خداوند خدا نے طیش میں آ کر انہیں جنت سے نکال باہر کیا۔

قرآن میں بھی یہ روایت کم و بیش اسی صورت میں موجود ہے کہ کسطرح اللہ نے آسمانوں اور زمینوں کو چھ دنوں میں بنایا اور پھر عرش پر برقرار ہوا۔ اُسنے مٹی سے آدم کا پتلا بنا کر اس میں دم پھونکا اور وہ زندہ ہو گیا۔ پھر آدم کو ایک سرسبز باغ میں رکھا اور کہا کہ جو جی چاہے کھاؤ لیکن اس درخت کے قریب نہ پھٹکنا۔ شیطان نے حوا کو ورغلایا اور آدم اس کے کہنے میں آ گیا۔ دونوں نے یہ پھل کھا لیا اور وہ اپنے آپ کو برہنہ محسوس کرنے لگے۔ اس سرکشی پر خدا نے انہیں جنت سے نکال دیا۔ شجر حیات کی روایت جس کا ذکر عہد نامۂ قدیم میں آیا ہے، بابل کے گل گامش اسکی تلاش میں نکلا تھا، وہ اُسے ڈھونڈنے میں کامیاب ہو گیا لیکن وہ ندی میں نہا رہا تھا کہ ایک سانپ نے اُسے چرا لیا اور اسکی ساری محنت رائیگاں گئی۔ آب حیات، امرت، امبروسیا، شجر حیات وغیرہ

کی صورت میں انسان کی موت پر قابو پانے کی دیرینہ خواہش کی ترجمانی کی گئی ہے ۔

عالمگیر سیلاب کی روایت سمیری الاصل ہے جو صابئیت کے توسط سے اسرائیلی مذاہب تک پہنچی ۔ اس کی رو سے دیوتاؤں نے بنی نوع انسان کی سرکشی سے ناراض ہو کر ایک عالمگیر سیلاب بھیجنے کا فیصلہ کیا ۔ انہوں نے ایک نیک آدمی اُتاپشتم پر رحم کھا کر اسے کشتی بنانے کی ترکیب بتائی جس میں بیٹھ کر اُتاپشتم نے اپنی جان بچائی اس کی کشتی کوہ نسیتیر کی چوٹی پر جا ٹھہری اور اُس نے دیوتاؤں کو سوختنی قربانی دی ۔ فلسطین میں اس شخص کا نام نوح بتلایا گیا ہے جس کی کشتی کوہ ارارات پر ٹھہری تھی ۔ سی ڈبلیو ایم نے نینوا کی الواح کے ترجمے میں لکھا ہے ۔

"میں نے اپنے عزیزوں اور مخلوق کے جوڑوں کو سوار کر لیا ۔
چوپائے درندے ، کاریگر سب سوار کر لیے ۔
پھر میں کشتی میں سوار ہوا اور میں نے اس کا دروازہ بند کر لیا ۔"

"میں نے ایک فاختہ اُڑائی جو واپس آ گئی ، پھر میں نے ایک ابابیل بھیجی وہ بھی لوٹ آئی ۔

پھر میں نے ایک کوا بھیجا ، وہ واپس نہ آیا ۔
کشتی کوہ نسیتیر کی چوٹی پر جا ٹھہری ۔

اب عہد نامۂ قدیم کا بیان ملاحظہ ہو ۔

"اور چالیس دن کے بعد یوں ہوا کہ نوح نے کشتی کی کھڑکی جو اُس نے بنائی تھی کھولی اور اُس نے ایک کوّے کو اُڑا دیا سو وہ نکلا اور جب تک زمین پر سے پانی سوکھ نہ گیا اِدھر اُدھر پھرتا رہا ۔ پھر اُس نے ایک کبوتری اپنے پاس سے اُڑا دی تاکہ دیکھے کہ زمین پر پانی گھٹا یا نہیں پر کبوتری نے پنجہ ٹیکنے کی جگہ نہ پائی اور اُسکے پاس کشتی کو لوٹ آئی

کیونکہ تمام روئے زمین پر پانی تھا۔ تب اُس نے ہاتھ بڑھا کر اُسے لے لیا اور اپنے پاس کشتی میں رکھا اور سات دن ٹھہر کر اُس نے اُس کبوتری کو کشتی سے اُڑا دیا اور وہ کبوتری شام کے وقت اسکے پاس لوٹ آئی اور دیکھا تو زیتون کی ایک تازہ پتی اُس کی چونچ میں تھی تب نوح نے معلوم کیا کہ پانی زمین پر سے کم ہو گیا تب وہ سات دن ٹھہرا۔ اس کے بعد پھر اس کبوتری کو اُڑا دیا پر وہ اسکے پاس کبھی نہ لوٹی اور چھ سو پہلے برس کے پہلے مہینے کی پہلی تاریخ کو یوں ہوا کہ زمین پر سے پانی سوکھ گیا اور نوح نے کشتی کی چھت کھول اور دیکھا کہ زمین کی سطح سوکھ گئی ہے۔ . . . تب نوح نے خداوند کے لئے ایک مذبح بنایا اور سب پاک چوپایوں اور پاک پرندوں سے تھوڑے سے لے کر اُس مذبح پر سوختنی قربانیاں چڑھائیں اور خداوند نے ان کی راحت انگیز خوشبو لی۔

جنت اور دوزخ کے تصورات بھی صابئیت ہی سے لئے گئے ہیں۔ جنت میں سعید روحیں مسرتِ دوامی کی زندگی بسر کریں گی اور دوزخ میں شقی اور مردود روحوں کو عذاب دیا جائے گا۔ تمام ارواح کو ایک پل پر سے گزرنا پڑے گا جسے قدیم پہلوی میں چنیود کہا گیا ہے اور جو بال سے باریک تر اور تلوار سے تیز تر ہوگی۔ شقی اس پر سے کٹ کٹ کر دوزخ کے شعلوں میں گر جائیں گی اور سعید روحیں دوڑتی ہوئی اُس سے گزر جائیں گی اور باغوں میں داخل ہوں گی جہاں حسین فربہ اندام اُبھری ہوئی چھاتیوں والی پریاں اُن کا خیر مقدم کریں گی۔ قدیم پہلوی زبان میں جنت کے لئے پیرادونا کا لفظ ہے جو عربی میں فردوس اور انگریزی میں پیراڈائز بن گیا ہے۔ یہودیوں کے باغِ عدن (قدیم پہلوی کا ہیدن، انگریزی کا ایڈن) کی روایت بھی صابئین سے ماخوذ ہے۔ یہودیوں کے خیال میں یہ باغِ عدن دجلہ و فرات کے درمیان

علاقے میں تھا۔ مجوسی عقیدے کے مطابق فردوس میں جانے سے پہلے ارواح ہمستگاں (مسلمانوں کا برزخ) میں قیام کریں گی۔ مجوسی بہشت کو روشن تر بھی کہتے ہیں۔ ان کے ہاں اس کے سات طبقے ہیں۔ جو مسلمانوں میں آٹھ بن گئے ہیں۔ دوزخ کے بھی سات طبقے ہیں۔ ان طبقوں کو کرشور (کشور) کہا جاتا ہے اوستا کے بہشت میں نیکی کا درخت ہے جو یہودیوں اور مسلمانوں کی روایات میں بھی موجود ہے۔ جنت میں طوبیٰ کے درخت کا ذکر آیا ہے جس کی شاخیں ہر جنتی کے گھر پہنچیں گی۔ مجوسیوں کے بہشت اور دوزخ کا نقشہ ارداویراف نامہ میں موجود ہے جس میں ارداویراف کی آسمان کی سیاحتوں کا ذکر کیا گیا ہے جن میں سروش ایزد یا جبریل کی رہنمائی میں ارداویراف جنت اور دوزخ کے مناظر دیکھتا ہے۔ وہ کہتا ہے۔

> "مجھے سروش نے بہشت اور دوزخ کی سیر کرائی . . . بہشت میں میں نے لوگ دیکھے جو باغوں کی سیر کرتے پھرتے تھے اور جوان عورتیں اور سادہ عذار لڑکے ان کی خدمت پر مامور تھے دوزخ میں دیکھتا کیا ہوں کہ ایک روح ہے جسے دو گرزوں سے مار رہے ہیں۔ سروش نے کہا یہ لونڈے باز تھے۔ ایک مرد دیکھا جسے زبردستی خون اور پیپ پلا رہے تھے۔ سروش نے مجھے بتایا یہ بدکار کی روح ہے۔ ایک عورت دیکھی جس کی چھاتیوں سے اسے لٹکا رکھا تھا۔ سروش نے کہا یہ غیر مرد سے عشق کرتی تھی۔ ایک عورت دیکھی کہ جس کی زبان کھینچ کر پشت کی طرف سے نکال دی گئی تھی سروش نے کہا یہ اپنے خاوند سے سخت کلامی کرتی تھی۔ مرد دیکھا جس کی زبان پتھر پر رکھ کر اسے دوسرے پتھر سے پیس رہے تھے معلوم ہوا کہ یہ دروغ گو تھا۔ ایک عورت دیکھی جس کی چھاتیاں چکی میں پیس رہے تھے۔ سروش نے بتایا یہ اسقاط حمل کرائی تھی۔ ایک مرد دیکھا جو مردار کھا رہا تھا۔ معلوم ہوا یہ حرام کی کمائی کھاتا تھا۔ ایک مرد دیکھا جسے

زردشتی خون پلا رہے تھے سروش نے کہا یہ مقدس آگ میں بال، ناخن وغیرہ گندی چیزیں پھینکتا تھا۔ ایک شخص دیکھا جسے سانپ کے کوڑے مار رہے تھے معلوم ہوا کہ لوگوں کی جائیداد زبردستی چھین لیتا تھا۔ اسکے بعد سروش نے مجھے بہشت بریں جسے مینوان مینو کہتے تھے لایا اور غیب سے ندا آئی کہ گفتار و کردار کے باعث تو اس مرتبے پر پہنچا۔"

ارداویراف نامہ پڑھ کر دانتے کی ڈیوائن کامیڈی یاد آجاتی ہے جس میں دانتے ورجل کی رہنمائی میں بہشت اور دوزخ کی سیر کرتا ہے۔ مجوسیوں کا بہشت البرز میں ہے ان کے جہنم کو زَند و دروند اور فارسی میں دوزخ کہتے ہیں۔ ان کے ہاں دوزخ کی سزا ابدی نہیں ہوگی۔ سزا کے بعد گنہگاروں کو بخش دیا جائے گا۔ قید بابل سے پہلے یہودیوں کا شیول ایک ایسی تاریک جگہ تھی جہاں مردوں کی ارواح جاتی تھیں۔ عذاب دوزخ اور نعیم جنت کے تصورات انھوں نے مجوسیوں سے لئے تھے وہ دوزخ کو جہنہ یا جہنم کہتے تھے۔ جہنم دراصل جی بن ہنوم کی تخفیف ہے اسکا معنی ہے ہنوم کی وادی۔ یہ وادی یروشلم کے قریب تھی جہاں کسی زمانے میں مولک کا معبد تھا۔ یہودیوں نے اسے مسمار کر دیا۔ اور اس جگہ کوڑا کرکٹ پھینکتے تھے۔ کوڑا کرکٹ سے ہمیشہ آگ کے شعلے اٹھتے رہتے تھے جس سے اسکا مفہوم دوزخ بن گیا۔

یہودیوں کے بہشت اور دوزخ کی تفصیل تالمود میں ملتی ہے اُن کے جہنم میں آگ اور برف دونوں سے عذاب دیا جاتا ہے۔[ل] عذاب کے فرشتے مجرم کو آگ میں دھکیلتے ہیں جو انہیں نگل لیتی ہے۔ آگ کی پانچ قسمیں ہیں۔ وہ پہاڑ کی طرح شعلہ زن ہے جس میں گندھک اور رال ہے۔ سبت کے دن اور عبادت کے دوران میں عذاب موقوف ہو جاتا ہے۔ تینوں نمازوں (صبح، دوپہر، شام) کے لئے بھی چھٹی دی جاتی ہے۔ تالمود کی طرح قرآن میں بھی عذاب دوزخ کی ہولناک تفصیل دی گئی ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ کفار کے لئے دوزخ کی آگ ہے نہ

[ل] TO BATHE IN FIERY FLOOD, OR TO RESIDE
IN THRILLING REGIONS OF THE RIBBED ICE
(SHAKESPEARE)

تو ان کو قضا آئے گی کہ مر ہی جائیں اور نہ دوزخ کا عذاب ہی ان سے ہلکا کیا جائے گا۔ جہنم کے سات دروازے ہیں ان کی ہر ٹولی کے حصے میں ایک دروازہ آئے گا۔ کفار کو آگ کا لباس پہنایا جائے گا۔ اور سروں پر کھولتا ہوا پانی ڈالا جائے گا جس سے جو کچھ شکم میں ہے۔ جل اٹھے گا۔ ان کے جسم کی جلد کا بھی یہی حال ہوگا۔ ان کی روک تھام کے لئے گرز ہوں گے۔ جب کبھی درد سے بے قرار ہو کر نکلنا چاہیں گے تو اسی میں لوٹا دیئے جائینگے جب دوزخ میں لوگ ڈالے جائیں گے تو وہ بڑی مہیب آواز سنیں گے۔ دوزخ جوش مارے گا معلوم ہوگا وہ پھٹ پڑے گا۔ کفار کو خون، پیپ اور زخموں کا دھوون پینے کے لئے دیا جائے گا اور تھوہر کھانے کے لئے۔ جنت کی تفصیلات میں ترغیب و تشویق کے سب سامان موجود ہیں

شیطان، فرشتوں، مسیحا اور مہدی کے عقائد بھی مجوسیوں سے ماخوذ ہیں۔ یاد رہے کہ زروانیت یا مجوسیت صابئیت ہی کی اصلاح یافتہ صورت تھی جسے زردشت نے دوئی کے تصور کی بنا پر از سر نو مرتب کیا تھا صابئین آفتاب دیوتا مردوخ بعل کو خداوند خدا کہتے تھے جس سے ایک نوع کی وحدانیت صورت پذیر ہونے لگی تھی وحدانیت میں شروع سے یہ تضاد مخفی رہا ہے کہ خدا جو سراپا خیر ہے شر کا خالق کیسے ہو سکتا ہے دوسرے الفاظ میں شر کا خیر سے ظہور پذیر ہونا اتنا ہی ناممکن ہے جتنا کہ مثلاً روشنی سے اندھیرے کا یا صداقت سے کذب کا صدور ناقابل تصور ہے۔ زردشت نے اس اشکال کو رفع کرنے کے لئے جسے یہودیوں نے کبھی محسوس نہیں کیا تھا شر کو اہرمن یا شیطان قرار دیا جب کہ اہورا مزدا یا یزداں خالق خیر تھا روایت کے مطابق اہورا مزدا اور اہرمن زرواں دیوتا (زمان۔ بعد میں یہ لفظ مقدر کے لئے استعمال کرنے لگے) کے توام بیٹے تھے۔ اہرمن شروع سے چالاک تھا وہ اہورا مزدا سے پہلے ماں کی کوکھ سے باہر نکلا اور

اور اسی سبب اپنے بھائی کی بہ نسبت زیادہ فعال اور طاقت ور ثابت ہوا چنانچہ ابتدائے آفرینش سے شر خیر پر غالب آگیا اور آج بھی غالب ہے مجوسیوں کے عقیدے کے مطابق قیامت سے کچھ مدت پیشتر شاہ بہرام ظاہر ہوگا جو شر کا ہمیشہ کے لئے قلع قمع کر دے گا اور خیر کی بالادستی قائم ہو جائے گی۔ بعد میں یہی خیال مسیحا اور مہدی کی روایات کا پیش رو بن گیا۔ چنانچہ سرسید احمد خان اور محمد اقبال نے ان تصورات کو مجوسی الاصل ہی کہا ہے۔

شاہ بابل بنو کد نصر نے یہودیوں کو شکست دی۔ اور انہیں قید کر کے بابل لے گیا جہاں وہ کم و بیش اسی برس حالت اسیری میں رہے۔ آخر کورش شاہ فارس نے انہیں اس قید سے رہائی دلا کر وطن واپس جانے کی اجازت دے دی۔ اسی بنا پر بنی اسرائیل کورش کو مسیحا کہتے آئے ہیں۔ بنی اسرائیل اسیری بابل ہی سے آدم وحوا، شیطان، فرشتوں، جنت دوزخ، چنیود (پل صراط) ہمستگان (برزخ) یزد (ضمیر) دنیا، (دین) کے تصورات اپنے ساتھ فلسطین لائے تھے جن کے سبب اُن کے مذہب میں دُور رس تبدیلیاں واقع ہونے لگیں۔ اس سے قبل وہ خیر اور شر کو اپنے قبائلی معبود یہوواہ ہی سے منسوب کیا کرتے تھے۔ شیطان کے خود ساتھ ان کے مذہب نے بھی دُوئی کا رنگ اختیار کر لیا اور انھوں نے اپنے اعمال بد کو شیطان سے منسوب کرنا شروع کیا البتہ مجوسیوں کے اہرمن اور بنی اسرائیل کے شیطان میں ایک فرق باقی رہا۔ اہرمن اہورا مزدا کا حریف غالب ہے جب کہ شیطان[1] خدا کے سامنے بے بس اور عاجز ہے۔ مقہور و مجبور ہے۔ مردود اور راندۂ درگاہ ہے۔ بنی اسرائیل فرشتوں کا تصور بھی بابل سے لائے۔ فرشتہ کا لغوی معنی ہے "بھیجا ہوا" جہاں کہیں بھی وحدانیت کا تصور موجود ہوگا اور شخصی خدا کو معبود مانا جائے گا وہاں فرشتوں کا وجود لازم ہوگا جو خدا اور بندوں کے درمیان وسیلے اور رابطے کا کام دیتے ہیں اور خدا کے پیغامات اسکے برگزیدہ بندوں تک پہنچاتے ہیں۔ بنی اسرائیل کے چار بڑے فرشتے جبریل، میکائیل، اسرافیل اور عزرائیل مجوسیوں کے ہاں بہمن، اردی بہشت

---

[1] شیطان کا لفظ حبشی زبان سے عبرانی میں داخل ہوا اسکا معنی ہے سرکش۔ شیطان کو ابلیس، بعلزبول

آذر خورداد اور آذر گشتاسپ کہلاتے تھے۔ بعض علماء مجوس کے خیال میں جبریل مجوسیوں کا فرشتہ روان بخش ہے۔ میکائیل فرشتہ بشیر ہے، اسرافیل ان کا اُدی بہشت اور عزرائیل مُرداد فرشتہ ہے۔ فردوسی نے اپنے شاہنامے میں ان کے نام شہریار، خورداد، اسفندارمذ اور امرداد لکھے ہیں۔ مجوسیت میں الہام کا فرشتہ سروش ہے جو ظاہراً صابئین سے ماخوذ ہے مینارۂ بابل کی پہلی منزل میں جہاں بعل دیوتا کا مجسمہ رکھا گیا تھا، وہیں ایک اژدھا کاہت بھی تھا جسے وہ سروش کہتے تھے اور جو بعل اور انسانوں کے مابین رابطہ قائم کرتا تھا۔ ان چار بڑے فرشتوں کے علاوہ فرشتہ دوموشو فردوس کا محافظ دربان ہے، جو اسلام میں رضوان کہلاتا ہے۔ ایک فرشتہ رشن ہے جو کسی گبر کی موت پر آتا ہے اور اسکے اعمال کا محاسبہ کرکے اسے فردوس یا دوزخ میں بھیجتا ہے۔ زمیاد فرشتہ فردوس کی حسین پریوں کی نگرانی پر مامور ہے۔

فکری پہلو سے صابئیت اور مجوسیت کی جو روایات اسرائیلی مذاہب میں بار پا گئیں آخر میں ہم ان کا ذکر کریں گے۔

۱۔ صابئین کا کہانت کا تصوّر۔ از خود رفتگی کی حالت میں غیب کی خبر دینا۔ الہام کی صورت میں مجوسیت میں بار پا گیا اور اسکی وساطت سے اسرائیلی مذاہب تک پہنچا۔ شکری آلوسی اپنی کتاب بلوغ الارب میں لکھتا ہے کہ کہانت غیب کا دعویٰ کرنے کو کہتے ہیں۔ اسے عرافت بھی کہا جاتا ہے۔ اور کاہن کو عراف بھی کہتے ہیں۔ کہانت آنے والے حادثات کے ساتھ مخصوص تھی اور عرافہ گذشتہ امور سے متعلق تھی۔

۲۔ ماورائی یا شخصی معبود کا تصوّر یہودیوں نے مجوسیوں سے اخذ کیا تھا۔ ان کا خدا ایک واضح شخصیت ہے جو انسان ہی کی طرح ذی شعور و ذی ارادہ ہے۔ وہ قادرِ مطلق ہے، مختارِ کل ہے۔ وہ اپنے نیک بندوں کو بہشت میں رکھتا ہے اور بدوں کو دوزخ میں عذاب دیتا ہے۔

۳۔ خدا کی ماورائیت کے ساتھ ہی مجوسیوں میں زمان کے حقیقی ہونے کا تصوّر وابستہ ہے۔ زمان کے

لوسی فر (لغوی معنی روشنی بردار) بت پرستوں کا دیوتا تھا جسے شیطان بنا دیا گیا) خناس (دبک جانے والا) بھی کہا گیا ہے۔

حقیقی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اسکی حرکت مستقیم ہے یعنی کائنات کا آغاز بھی ہوا اور انجام بھی ہوگا۔ ماٹن بی کے خیال میں زمان کے حقیقی ہونے کا تصور مجوسی مزاج مظہر WELTANSCHUUANG کی یورپ کو سب سے گراں مایہ دین ہے۔

۴۔ انسان فاعل مختار ہے مجوسیت میں انسان کو ذی قدر و ذی اختیار مانا گیا ہے کیوں کہ اُسے ذی اختیار نہیں مانا جائے گا تو قیامت کے روز انکے اعمال کا محاسبہ کرنا قرین انصاف نہیں ہوگا اسرائیلی مذاہب میں انسان کو فاعل مختار سمجھا جاتا ہے اور یہ مجوسیت کی عطا ہے۔

۵۔ مجوسیوں کا زندگی کے بارے میں نقطۂ نظر رجائی ہے۔ اس میں اس مادی دنیا کی مسرتوں اور لذتوں سے تمتع کرنا جائز ہے اور انسان کو افزائش کی تلقین کی گئی ہے۔ یہی رویہ اسرائیلی مذاہب والوں کا بھی ہے۔

مجوسیت، یہودیت، عیسائیت اور اسلام کے مشترکہ عناصر کا ذکر کرتے ہوئے اوسوالڈ سپنگلر نے اسرائیلی مذاہب کو مجوسی الاصل قرار دیا ہے انکے خیال میں الہامی مذاہب کی روح مجوسی ہے جو آخر میں پوری آب و تاب کے ساتھ اسلام میں ظاہر ہوئی تھی۔ وہ اپنی کتاب زوالِ مغرب میں کہتا ہے۔

> "پیغمبرانہ تعلیمات کا مرکزی نقطہ مجوسی الاصل ہے۔ خدا ایک ہے۔ اُسے یہوواہ کہا جائے یا اہورامزدا اور مردوخ بعل کا نام دیا جائے۔ وہی خیر کا اصول ہے دوسرے تمام دیوتا یا شر ہیں یا انکے مقابلے میں ہیچ ہیں اس تصور پہ مسیحا کی آمد کا پیوند لگایا گیا جس کی شکل یسعیاہ میں صاف دکھائی دیتی ہے اور جبر داخلی جبر کے تحت آنے والی صدیوں میں پھر کہیں اُبھرا۔ یہ مجوسیت کا مرکزی خیال ہے کیونکہ اسی میں خفی صورت میں خیر اور شر کے مابین عالمی تاریخی کشمکش کا تصور موجود ہے یعنی شر درمیانی دور میں کامیاب ہوگا اور خیر یوم قیامت کو فتح یاب ہوگا۔ تاریخ کی یہ اخلاقی ترجمانی ایرانیوں۔

کالدیوں (صابئین) اور یہودیوں میں مشترک ہے۔ اسی سے برگزیدہ اُمّت کا خیال پیدا ہوا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اسیریٔ بابل کے دوران میں ختنہ اور کالدی (صابی) سبت جیسے شعائر نے یہودیوں میں بار پایا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ابن الآدم کے مکاشفات شیطان، ملائکہ کبیرہ، ہفت بہشت اور یوم قیامت کے تصورات ایرانیوں کے آفاقی احساس کی پیداوار ہیں۔ یسعیاہ میں کورش کو مسیحا کہا گیا ہے"۔

محمد اقبال نے سپنگلر کے خیالات کی تلخیص اپنے خطبات میں ان الفاظ میں پیش کی ہے۔

سپنگلر کے خیال میں پیغمبرانہ تعلیم کا حاصل مجوسی ہے۔ خدا ایک ہے۔ اُسے یہواہ کہا جائے یا اہورا مزدا یا مردوخ بعل ــــ جو خیر کا اصول ہے اور باقی تمام دیوتا اسکے سامنے بے بس ہیں یا شر کے حامل ہیں۔ اس نظریے کے ساتھ مسیحا کا تصور وابستہ ہے جو یسعیاہ میں دکھائی دیتا ہے۔ اسی میں مجوسی مذہب کا اساسی تصور موجود ہے یعنی شر اور خیر کے درمیان آفاقی آویزش جس کے درمیانی دور میں شر غالب آئے گا۔ اور آخر میں قیامت کے قریب خیر کی فتح ہوگی۔ مجوسی کلچر سے سپنگلر کی مراد وہ کلچر ہے جسکے ساتھ یہودیت قدیم کالدی مذہب، ابتدائی دور کی عیسائیت، زردشت کا مذہب اور اسلام وابستہ ہیں"۔

مجوسیت اور اسلام میں مشترک عناصر کی بنا پر مجوسیوں کو اہل کتاب میں شمار کیا گیا ہے۔ ابن حزم ظاہری لکھتا ہے۔

"جو لوگ مجوس کو اہل کتاب کہتے ہیں ان میں علیؓ ابن ابی طالب، حذیفہؓ (صحابہ سے) سعید بن المسیب، قتادہ وابوثور (تابعین میں) اور جملہ اہل ظاہر ہیں"۔

قرآن میں صابئین اور مجوسیوں کا ذکر استحسان سے کیا گیا ہے اور ان میں نیک لوگوں کو بخشش کی بشارت دی گئی ہے

"بے شک جو لوگ ایمان لائے اور جو یہودی ہوئے یا نصرانی اور صابئین میں جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان لائے اور نیک کام کیے ان کے لئے رب کے پاس ان کا اجر ہو گا۔ انہیں نہ کوئی خوف ہو گا نہ غم:

صابئیت کے جو اثرات مجوسیت پر اور اسکے واسطے سے اسرائیلی مذاہب پر ہوئے ان کا مختصر جائزہ لینے کے بعد اب یہ دیکھنا ہے کہ صابئین اور مجوسیت کی سورج پوجا کے مسلک نے عیسائی کلیسا کو کس حد تک متاثر کیا تھا۔ ابتدائی دور کی عیسائیت کا مطالعہ ہمیں بتلاتا ہے کہ جناب عیسیٰ کی تبلیغ کا دائرہ اثر بہت محدود تھا کیونکہ انھیں عین عالم شباب میں سولی پہ گاڑ دیا گیا تھا۔ ان کی زندگی پر عجیب و غریب روایات کا دھندلکا چھایا ہوا ہے تاہم اتنا یقینی ہے کہ وہ ایک غریب یہودی گھرانے کے فرد تھے اور انہوں نے تبلیغ کا کام چھوٹی عمر ہی میں شروع کر دیا تھا۔ ان کی دعوت بنی اسرائیل کی اصلاح تک محدود تھی لیکن یہودیوں نے انہیں مسیحا ماننے سے انکار کر دیا۔ ان کی موت پر چند مچھیرے ہی ان پر ایمان لائے تھے۔ وہ خود فرماتے ہیں۔

"یہ نہ سمجھو کہ میں توریت یا نبیوں کی کتابوں کو منسوخ کرنے آیا ہوں۔ منسوخ کرنے نہیں بلکہ پورا کرنے آیا ہوں" (متی)

(یسوع نے کہا) میں اسرائیل کے گھرانے کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے سوا اور کسی کے پاس نہیں بھیجا گیا" (متی)

"غیر قوموں کی طرف نہ جانا اور سامریوں کے کسی شہر میں داخل نہ ہونا بلکہ اسرائیل کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے پاس جانا۔"

یہ کرشمہ تاریخ عالم کے عجوبات میں سے ہے کہ یہ محدود اصلاحی تحریک بعد میں ایک ہمہ گیر کلیسا (رومن کیتھولک) کی صورت اختیار کر گئی۔ اہل تحقیق کا اس بات پر اتفاق ہے کہ کیتھولک کلیسا کی بنیاد جناب عیسیٰ نے نہیں رکھی بلکہ ترسس کے ایک یہودی

نامی نے رکھی تھی جسے بعد میں سینٹ پال کہا گیا اور جو یونانی و رومی دیومالا کے علاوہ اشراقی فلسفے کا بھی عالم تھا۔
نے عمر میں وہ جناب عیسیٰ کا سخت مخالف تھا لیکن بقول خود ایک دن راستہ چلتے ہوئے اُسنے مکاشفے میں جناب
ی کو دیکھا اور اسی دن ان کا حلقہ بگوش ہو گیا اور ان کی تعلیمات کی اشاعت کا عزم کر لیا۔ جب یہودیوں نے
کی مخالفت کی تو اُس نے غیر اقوام میں جانے کا ارادہ کیا اور یہودیوں سے کہا۔

" تمہارا خون تمہاری ہی گردن پر ہے۔ میں پاک ہوں۔ اب میں غیر قوموں کے ہاں جاؤں
گا۔ (اعمال)

پرست اقوام میں اپنے مذہب کو پھیلانے کے لئے پولس نے ختنہ موقوف کر دیا اور انہیں خوش کرنے کے لئے یہودیوں
سبت (سنیچر) کے بجائے اتوار (سورج کا دن) کو سبت بنا لیا۔ پولس نے بُت پرستوں کی دیومالائی روایات کو بھی
ت میں شامل کر لیا جس سے غیر اقوام کے لوگ ایمان لانے لگے۔ عیسائیت کی ترکیب پولس کے زمانے میں رواج
نہیں ہوئی تھی بلکہ تیسری صدی عیسوی میں نیقیہ کی کونسل میں وضع ہوئی۔ بعض بُت پرست اقوام میں بعل، زیوس
فرا وغیرہ کے نام پر سورج کی پوجا کی جاتی تھی اسلئے پولس اور اسکے پیروؤں نے سورج پوجا کی رسوم عبادت، تہوار اور
سرے طور طریقے سورج کے پجاریوں سے اخذ کر لئے اس طرح جو مذہب صورت پذیر ہوا اُسے کیتھولک (ہمہ گیر) کا نام دیا گیا

گذشتہ اوراق میں ہم نے دیکھا کہ سورج پوجا کا مت صابئیت کا مرکزی نقطہ تھا۔ صابئین اپنے سورج
تا بعل مردوک کو خداوند خدا مانتے تھے۔ ان کی سورج پوجا کے رسوم و شعائر تمام معاصر اقوام کے مذاہب میں نفوذ
ر گئے۔ ایرانیوں کا متھرا بھی بعل مردوک ہی کا مثیل تھا۔ جب متھرا مت کی اشاعت روما میں ہوئی تو سورج
ا تمام متمدن اقوام میں پھیل گئی۔ یہ دیکھ کر چنداں حیرت نہیں ہوتی کہ پولس کو اپنا یا مت مقبول بنانے کے لئے
ب عیسیٰ کو سورج دیوتا ہی کے روپ میں پیش کرنا پڑا۔

ب عیسیٰ کے زمانے میں جملہ اقوام میں سورج دیوتا کے معبد موجود تھے اٹلی میں اپالو، روما میں ہرکولیز، مصر میں ہورس
کاتھیج میں بعل اور ایران میں متھرا کی پوجا بڑے ذوق و شوق سے کی جاتی تھی۔ روم کی کیتھولک کلیسا کی الہیات

پر صابئیت اور بدھیت کے اثرات کا ذکر کرتے ہوئے کارپنٹر نے کہا ہے کہ سورج دیوتاؤں میں کئی عناصر مشترک تھے جو جناب عیسیٰ کی ذات سے بھی منسوب کر دیئے گئے تھے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ سورج دیوتا جناب عیسیٰ کی طرح[1]

۱۔ کرسمس کے دن یا اسکے لگ بھگ کسی دن پیدا ہوئے۔

۲۔ سب سورج دیوتا کنواری ماں کے بطن سے پیدا ہوئے۔

۳۔ وہ کسی غار میں یا کسی زمین دوز مقام میں پیدا ہوئے۔ بعد میں عیسائیوں نے جناب عیسیٰ کی پیدائش غار کے بجائے چرنی میں دکھائی۔

۴۔ انہوں نے انسان کی خاطر مصائب برداشت کئے۔

۵۔ انھیں روشنی بردار، شفیع، نجات دہندہ اور بخشش گر کے القابات دیئے گئے۔

۶۔ ان پر تاریکی کی قوت نے غلبہ پالیا۔

۷۔ وہ زمین دوز مملکت کو چلے گئے۔

۸۔ وہ مُردوں میں سے دوبارہ زندہ ہو کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

۹۔ انھوں نے عبادت گاہیں تعمیر کیں اور اولیاء کے مت کی بنیاد رکھی اور اپنے پیروؤں کو بپتسمہ دے کر رواج دیا

۱۰۔ ان کے ہاں مقدس ضیافت کی روایت تھی جس میں خدا کے بدن کو تمثیلی انداز روٹی کی صورت میں کھاتے تھے اور اس کے لہو کو شراب کی صورت میں پیتے تھے تاکہ خدا کی برکت ان میں بھی حلول کر جائے۔ یہ ساری روایات پولس اور اسکے پیروؤں نے جناب عیسیٰ سے منسوب کر کے ان کی سادہ تعلیمات پر قدیم دیومالائی سورج پوجا اور اس سے وابستہ رسوم و شعائر کا پیوند لگا دیا اور اُسکا حلیہ ہی بدل کر رکھ دیا۔ چنانچہ ماڈرنسٹ کی کیمبرج کانفرنس ۱۹۲۱ء میں صاف کہا گیا کہ موجودہ کلیسا کے بانی جناب عیسیٰ نہیں تھے۔ متھرازم کی رسوم من و عن عیسائیت میں داخل کی گئیں۔ متھرازم چھ صدیوں تک ایران میں مقبول رہا اور [illegible] ق م کے لگ بھگ روم میں پھیل گیا۔ متھرا کی طرح جناب عیسیٰ

---

[1] عیسائیت کے مآخذ۔ خواجہ کمال الدین۔

دیں تصلیب اور صلیبی بنا دیا گیا ۔ متھرا کے بھی بارہ حواری تھے اور وہ بھی نوع انسان کی خدمت کرتا ہوا جاں بحق ہوا تھا
ور کر قبر سے جی اٹھا تھا ۔ اس کی ولادت، موت اور احیا کے تہوار بڑے جوش و خروش سے منائے جاتے تھے ۔ رومی کیتھولک
کلیسا نے متھرامت سے کرسمس اور ایسٹر کے تہوار مستعار لئے ۔ بپتسمہ لینے کی رسم بھی متھرامت سے ماخوذ ہے ۔ جناب عیسیٰ
یوم میلاد شروع شروع میں ۶ جنوری کو مناتے تھے لیکن ۳۵۲ ب م میں پوپ لائبیریس نے اسے ۲۵
مبر میں بدل دیا جو متھرا کا یوم ولادت تھا ۲۵ دسمبر یا اس سے آگے پیچھے کی تاریخیں تمام سورج دیوتاؤں کی ولادت کی
ریخیں تھیں کیونکہ انہی ایام میں سورج اپنے زوال کو پہنچ کر دوبارہ شمال کی جانب اپنا سفر شروع کرتا ہے جس کی خوشی میں
یوم میلاد منایا کرتے تھے ۔ کلیسائے ایران والے آج بھی ۶ جنوری کو جناب عیسیٰ کا یوم میلاد مناتے ہیں ۔ [illegible] تمام قدیم
دیوتاؤں میں سورج دیوتا کے مرنے (غروب) اور دوبارہ زندہ ہونے (طلوع) کا قصہ عیسائیوں نے مستعار لیا گیا
ہے جو طلوع آفتاب کے وقت شکرانے کی اور غروب آفتاب کے وقت غم و افسوس کی نماز پڑھا کرتے تھے ۔ بعل
ردوخ کی زندگی کے بارے میں اشور کی گلی الواح سے جو تفصیلات ملی ہیں ان میں اور جناب عیسیٰ کے سوانح میں ـــ
یا کہ کلیسائے روم نے پیش کئے ہیں ـــ بے حد مماثلت دکھائی دیتی ہے ۔ [1]

بعل کو گرفتار کر لیا گیا ۔

۔ بعل زخمی ہو گیا ۔

۔ بعل کو پہاڑی پہ لے گئے ۔

۔ بعل کے ساتھ ایک دیوی بھی گئی (عیسائیوں کی میری میگدلین)

جناب عیسیٰ کی طرح بعل کا لبادہ بھی اتار لیا گیا ۔

میری میگدلین کی طرح ایک عورت نے بعل کے زخموں کو دھویا ۔

۔ بعل مر گیا ۔

---

[1] عیسائیت کے مآخذ ۔ خواجہ کمال الدین ۔

۸ ۔ بیل دوبارہ جی اٹھا ۔

۹ ۔ بیل کی بڑی ضیافت مارچ میں دی جاتی تھی ۔

۱۰ ۔ ایسٹر روشنی اور بہار کی دیوی تھی جسکے اعزاز میں ایسٹر کا تہوار منایا جاتا تھا ۔

عیسائیوں کو متھرا مت سے خطرہ تھا اسلئے انہوں نے متھرا مت سے متعلق بے شمار کتابیں آگ میں پھینک کر جلا دیں ، ان کے معبد مثلاً گپھائیں مسمار کر دیئے اُن کے پیروؤں کا قتلِ عام کیا اور اسطرح متھرامت کے آثار ملیا میٹ کر دیئے لیکن رومن کیتھولک کلیسا میں متھرامت اور بیل پوجا کی رسوم و روایات باقی رہیں اور آج بھی باقی ہیں آج بھی کلیسا کا رخ مشرق کی جانب رکھا جاتا ہے تاکہ سورج کی پہلی شعاعیں اس کی قربان گاہ پر پڑیں رومن کیتھولک راہب اور راہبائیں سر کے بال منڈوا دیتی ہیں تاکہ سروں پر سورج کی تھالی بن جائے ۔ لڑکوں کے پرے آج بھی آوازیں ملا کر مقدس گیت گاتے ہیں ۔ عیسائی راہب بھی متھرا کے پجاریوں کی طرح خاص قسم کے لبادے اوڑھتے ہیں عشائے ربانی بپتسمہ ، کرسمس ، ایسٹر کے آثار آج بھی باقی ہیں ۔ اس طرح صابئین کی سورج پوجا کا مت ، متھرامت کی صورت میں کلیسائے روم میں نفوذ کر گیا اور اُن کی یہ سورج پوجا رومن کیتھولک کلیسا کی صورت میں باقی و برقرار ہے ۔

سُورج پوجا کی طرح دھرتی مت کو بھی عالمگیر خیال کیا جاتا تھا ۔ قدما آسمان یا سورج کو باپ اور دھرتی کو ماں سمجھتے تھے اور کہتے تھے کہ ان دونوں کے ملاپ سے فصلیں اُگتی اور پنپتی ہیں ۔ مادری نظام معاشرہ میں زرخیزی کا مت رواج پذیر تھا ۔ ہل چلانے اور جنسی ملاپ کے عمل کو ایک جیسا اثر آور خیال کرتے تھے اسی طرح دھرتی کی زرخیزی کو بحال رکھنے کے لئے دھرتی دیویوں کے تہواروں پر جنسی ملاپ کی کھلی آزادی دی جاتی تھی ۔ دھرتی دیویوں کے معبدوں میں ہزاروں دیوداسیاں رہتی تھیں جن سے یاتری اور پجاری فیض یاب ہوتے تھے ۔ خیال یہ تھا کہ اسطرح دھرتی کی زرخیزی کو تقویت ہوتی ہے اور فصلیں اور پھل والے درخت خوب پھلتے پھولتے ہیں ۔ اسی سوچ نے لنگ اور یونی کو زرخیزی کی علامتیں بنا دیا تھا ۔ پتھر کے کھنڈروں سے لنگ اور یونی کے آپس میں ملے مجسمے

دستیاب ہوئے ہیں جیسے کہ آج کل ہندوستان اور کشمیر کے مندروں میں دیکھنے میں آتے ہیں۔ لنگ یونی کُنڈ کی پوجا کی جاتی ہے۔ ان کے مجسمے مندروں میں نصب ہیں جہاں پجاری ان پر تیل یا گنگا جل گرا کر ان کی پوجا کرتے ہیں اور ان پر پھول پتے چڑھاتے ہیں۔ پانی لنگ کے جوش کو تسکین دینے کے لئے گرایا جاتا ہے۔ شوالے اور گوپورم لنگ ہی کی صورت کے بنائے جاتے ہیں۔ سومنات کی پوجا بھی لنگ ہی کی صورت میں کی جاتی تھی جسے مقناطیس کی کشش سے ہوا میں لٹکا دیا گیا تھا۔ اس کے معبد میں پانچ سو دیوداسیاں رہتی تھیں جو صبح و شام کا ناچ کر دیوتا کا جی بہلاتی تھیں۔ لنگ شیو دیوتا کی علامت ہے لنگ کی شبیہ کو ارگھہ (لفظی معنی برتن) یہاں یونی مراد ہے میں نصب کر دیا جاتا ہے

لنگ یونی کنڈی کی پوجا دراوڑوں سے یادگار ہے اور شیو دیوتا کا تعلق بھی دراوڑی دیومالا ہی سے ہے۔ شیو لنگ کے پجاری جنوبی ہند میں لنگایت کہلاتے ہیں اور پتھر کا ایک ننھا سا لنگ سونے چاندی میں منڈھوا کر گلے میں پہنتے ہیں۔ وہ اپنے ماتھے پر تین افقی لکیروں کا قشقہ کھینچتے ہیں جو اعضائے تناسل کی علامت ہے۔ شیو راتری کے تہوار پر خاص اہتمام سے لنگ کو گنگا جل میں غسل دیا جاتا ہے اور اس پر دودھ، تیل، پھول پتے بھینٹ چڑھائے جاتے ہیں شیو کے مقدس بیل نندی کی پوجا بھی زرخیزی کی علامت سمجھ کر کی جاتی ہے۔ ابتدا میں شیو دیوتا بارآوری اور لنگ مت سے تعلق رکھتا تھا۔ بعد میں اُسے ویدک دیوتا رودر اور اگنی کا مثیل بنا دیا گیا۔ شیو نے شکتی کو پیدا کیا جو مجسم ہو کر اس کی زوجہ بن گئی۔ برہمنوں نے مہا متیا یا دھرتی ماتا کی پوجا کا جواز شکتی پوجا کی صورت میں پیش کیا بلند تر سطح پر شکتی کو ازلی تخلیقی اصول قرار دیا گیا یعنی پرکرتی جو پرش کے ساتھ اختلاط کر کے کائنات کی تخلیق کا سبب بنی تھی۔ مہا متیا یا کالی دیوی آج بھی اپنی اصل دراوڑی شکل ہی میں موجود ہے تنتر مت والے لنگ یونی کی پوجا ذوق و شوق سے کرتے ہیں بھیرو چکر میں ایک برہنہ مرد اور عورت کو کھڑا کر کے انھیں شیو اور شکتی کی علامتیں سمجھ کر پوجتے ہیں اور پھر جنسی ملاپ کی کھلی چھٹی دے دی جاتی ہے" آریاؤں نے شکست دے کر دراوڑوں کو جنوبی ہند کی طرف بھگا دیا۔ ان کے شہر برباد کر دیئے، ان کی عورتوں کو داسیاں (باندیاں) بنا لیا گیا۔ لنگ پوجا اور دھرتی دیوی کی صورت میں آج بھی ہندو مت میں دراوڑی روایات

زندہ ہیں اور جس صورت میں آج ہم ہندومت کو دیکھتے ہیں وہ دراوڑوں ہی کے مت کی بدلی ہوئی صورت ہے۔ لنگ پوجا کے ساتھ ناگ پوجا بھی دراوڑی روایت ہے۔ ناگ صبح تاریخ سے حیات نو، جنسی ہیجان اور زرخیزی کی علامت رہا ہے۔ فرائڈ اور ژنگ نے اسے لنگ کی علامت قرار دیا ہے۔ قدیم اہل یونان روما اور میکسیکو میں کنواری لڑکیاں مقدس سانپوں کو دودھ پلانے پر مامور تھیں جنوبی ہند میں آج بھی ناگ پوجا کا رواج باقی ہے ساون میں ناگ پنچمی کا تہوار مناتے ہیں جس میں ناگ کے مجسموں کی پوجا کی جاتی ہے۔ ناگ کی منڈھیں بنا کر اس کی پوجا کرتے ہیں۔ وشنو دیوتا کے بارے میں روایت ہے کہ وہ ناگ کے پھن پر لیٹ کر آرام کرتا ہے ہندوؤں کے عقیدے کے مطابق کرۂ ارض ناگ کے پھن پر قائم ہے شیش ناگ یا ناگ راجہ کی پوجا ہندوستان میں ہر کہیں کی جاتی ہے۔ ناگ کو اسلئے بھی مقدس مانتے رہے ہیں کہ اسکے ساتھ پُراسرار دہشت وابستہ رہی ہے۔

فلسفہ

فلسفے کے رواج و قبول کے ساتھ ارواح کے مت کے اثرات بتدریج کم ہوتے رہے حتیٰ کہ مادیت پسندی اور سائنس سے بالکل ناپید ہو گئے۔ یاد رہے کہ سائنس اور مادیت پسندی میں شروع ہی سے چولی دامن کا ساتھ رہا ہے کیوں کہ ان کی رو سے عالم کو حقیقی مانا گیا ہے۔ سائنس میں مشاہدے اور تجربے سے کام لے کر ان کی روشنی میں نظریات مرتب کیے جاتے ہیں۔ مادیت پسندی میں حسیات اور مدرکات کے وسیلے سے تجریدات و معقولات اخذ کیے جاتے ہیں۔ مثالیت پسندوں نے حقیقتِ کبریٰ کو وجودِ مطلق، شعورِ مطلق یا عین العیان کہا جو ان کی فکری کاوشوں کا مقصود و منتہا ہے خدا کا نام بھی دیا ہے۔ مثالیت پسندوں کے وجودِ مطلق یا خدا اور اہلِ مذہب کے خدا میں البتہ ایک فرق ہے اور وہ یہ ہے کہ مثالیت پسندوں کا وجودِ مطلق یا خدا واجب الوجود ہے، غیر شخصی ہے۔ جب کہ اہلِ مذہب کا خدا ایک ذی ارادہ شخصیت ہے جو انسانوں کی طرح کے جذبات و احساسات رکھتا ہے اور کائنات میں ہر وقت ہر قسم کا تصرف کرنے پر قادر ہے۔ مزید برآں مثالیت پسند بھی اہلِ مذہب کی طرح روح کے وجود اور اس کی بقا کے قائل ہیں اور انسان کو فاعلِ مختار مانتے ہیں۔ آئندہ اوراق میں اس اجمال کی تفصیل پیش کی جائے گی اور ضمناً اس بات کی وضاحت بھی کی جائے گی کہ مذہب کی طرح مثالیت پسندی میں بھی روحوں کا مت خفی طور پر باقی ہے جس کے وسیلے سے انسان کائنات سے اپنا فکری اور جذباتی رابطہ قائم کرنے کی کوشش کرتا رہا ہے۔

گزشتہ ابواب میں ہم نے دیکھا کہ جادو، دیو مالا اور مذہب کے بنیادی تصورات روحوں کے مت سے ماخوذ ہیں۔ جادو اس مفروضے پر مبنی ہے کہ انسانی زندگی پر چند نیک یا بد روحوں کی کارفرمائی ہے جادوگر نیک روحوں کی مدد سے اپنے کام سنوارتے ہیں اور خبیث روحوں کو قابو میں لا کر ان سے اپنے دشمنوں کو ایذا پہنچاتے ہیں۔ زمانے کے گزرنے کے ساتھ مظاہرِ کائنات سورج، چاند، دھرتی وغیرہ کی پوجا شروع کر دی

کے اظہار کے لئے کی جاتی تھی کیوں کہ وہ حیات، روشنی، زرخیزی اور افزائش کے پاسبان تھے بھوت تاریکی گرمی، رعد، زلزلے، آتش فشاں پہاڑ وغیرہ کے خوفناک دیوتاؤں دیویوں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے قربانیاں دی جاتی تھیں تاکہ وہ ان کے درپئے آزار نہ ہوں۔ مذہب روحوں کے مُت ہی کی منظم صورت ہے جسمیں انسان نے زندگی کے مصائب و حوادث، موت اور امراض کی دہشت اور اس بے کراں کائنات میں اپنی بے چارگی اور بے بسی کے تلخ احساس سے پناہ تلاش کرنے کی کوشش کی ہے اور اس مقصد کے لئے اُسنے ایک ایک سے زیادہ فوق الطبع ہستیوں کا سہارا لیا ہے۔ پہلے ہم مذہب اور مثالیت پسندی کے رشتے کی بات کریں گے۔

مذہب اور مثالیت پسندی کے ربط باہم کے بارے میں جرمن فلسفی فوئرباخ نے بحث کی ہے اور یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ دونوں ایک ہی فکری رویئے کے مختلف پہلو ہیں وہ کہتا ہے کہ مثالیت پسندی نے شروع سے مذہب کے دامن میں پرورش پائی تھی اسلئے مذہب کے ساتھ ہمیشہ اسکا گہرا ربط ضبط قائم رہا۔ فوئرباخ کا خیال درست ہے کیوں کہ مذہب اور مثالیت پسندی کے مُہمّات مسائل میں فکری یگانگت موجود رہی ہے۔

طالیس ملطی اور اُسکے پیروؤں کا نقطۂ نظر علمی و تحقیقی تھا اور وہ ذاتی مشاہدے کو اہم سمجھتے تھے جس سے فلسفے میں مادیت پسندی کا رجحان پیدا ہوا۔ اس کے برعکس مثالیت پسندی پر دائونیسس مت کے گہرے اثرات ہوئے۔ یہ مت تھریس سے نکل کر یونان میں پھیلا تھا دائونیسس شراب کے نشے اور مستی و بے خودی کا دیوتا تھا۔ اسکے پیروؤں کا عقیدہ یہ تھا کہ شراب پینے سے انسان کے دل و دماغ میں از خود رفتگی کی جو کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ دائونیسس ان کے بطون میں حلول کر جاتا ہے دائونیسس کے مت کی اشاعت میں ایک نیم افسانوی شخصیت عارفیس نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا جس سے اسکا نام عارفی مت پڑ گیا عارفیوس ایک باکمال گویّا تھا جو روایت کے مطابق اپنی زوجہ کی تلاش میں زیرزمین دروز مملکت کو بھی گیا تھا اور جسے چند عورتوں نے جو نشے میں وحشت بنی چیر پھاڑ کر موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ خاص تہواروں

پر عارفی مت والے عورتیں مرد نشے کی حالت میں دیوانہ وار گاتے ناچتے ہوئے جلوس نکالتے تھے اور ہ اس عالم میں جو بھی حیوان ان کے راستے میں آجاتا اس پر جھپٹ پڑتے اور تکا بوٹی کر کے کھاجاتے تھے۔ مشہور فلسفی اور ریاضیات کا امام فیثاغورث بھی عارفی مت کا ایک مصلح تھا جس کی تعلیمات کی اشاعت سے عارفی مت کے رسوم و شعائر مثالیت میں بھی رواج پاگئے۔ مثالیت پسندی کا مشہور ترجمان افلاطون بھی فیثاغورث کی افکار سے متاثر ہوا تھا۔

باطنیت[1] کی روایات اور ترکیب بھی نیشاغورس سے یادگار ہے کیونکہ وہ اپنے منتخب طلبہ اور طالبات کو خفیہ تعلیم دیا کرتا تھا۔ اس کی باطنی تعلیم کا حاصل یہ تھا کہ ہم سب اس دنیا میں اجنبی ہیں اور بدن روح کا زنداں ہے۔ فلسفیانہ تفکر و تعمق سے روح کو مادی علائق کے زنداں سے نجات دلائی جا سکتی ہے۔ روح کو مادی دنیا سے نجات دلانا ہی فلسفے کا حقیقی منصب اور انسانی زندگی کا اصل مقصد ہے۔ فیثاغورس اور اسکے پیرو تناسخ ارواح پر محکم عقیدہ رکھتے تھے اور کہتے تھے کہ اس دنیا میں ہم سے جو اعمال سرزد ہوتے ہیں انہی کی رعایت سے رت کے بعد ہمیں نیا قالب ملتا ہے اور صحیح معنوں میں فلسفی ـــ لغوی معنی دانش دوست۔ یہ ترکیب فیثاغورس ہی کی تخریج کی ہوئی ہے ـــ کہلانے کا مستحق وہ شخص ہے جو جنم چکر سے رہائی پانے کے قابل ہو جاتا ہے۔ اسکے علاوہ فیثاغورس نے اعداد کا تصور پیش کیا اور کہا کہ یہ عالم جفت اور طاق اعداد سے بنا ہے۔ یہ اعداد قائم بالذات ہیں اور ہر شے کی اساس بھی یہی ہیں۔ بعد میں افلاطون نے فیثاغورس کے اعداد اور سقراط کے تجریدات کی طرح اپنے امثال[2] کو بھی ازلی و ابدی قرار دیا تھا۔

افلاطون کے فلسفے میں اشراق، سریت، مذہب، باطنیت اور عقلیت پسندی کے عناصر اکٹھے ہو گئے۔ اسکا فلسفہ ایک خوبصورت قالین کی طرح ہے جس کی بنوٹ میں مختلف رنگوں کے دھاگے دکھائی دیتے ہیں۔ لیکن اسکے باوجود اسکا اپنا خاص نقش بھی موجود ہے۔ افلاطون، فیثاغورس، پارمی نائدیس، ہیرکلیتس

---

[1] ESOTERICISM

[2] CONCEPTS

اور سقراط سے بالخصوص فیض یاب ہوا ہے۔ پارمی نائڈیس وحدت الوجود کا شارح تھا۔ اوائل عمر میں وہ فیثاغورث کا پیرو رہ چکا تھا۔ اسکے فلسفے کو ایلیاطی وجودیت کا نام دیا گیا ہے کیوں کہ وہ ایلیا کی ریاست کا شہری تھا۔ اسکے مکتب فکر سے تعلق رکھنے والوں میں زینو اور زینو فینس خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ مؤرخین فلسفہ کے خیال میں ایلیاطی وجودیت پہلا حقیقی فلسفہ ہے اور ایک مستقل نظام فکر کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسکے فلسفے کا بنیادی خیال یہ ہے کہ صرف وجود ہے نا وجود کا کوئی وجود نہیں ہو سکتا کیوں کہ ہم اس پر فکر نہیں کر سکتے۔ پارمی نائڈیس کا وجود واحد ساکن ہے۔ دنیا میں جو کچھ بھی حرکت و تغیر دکھائی دیتا ہے وہ ہماری نظر کا فریب ہے۔ پارمی نائڈیس نے سب سے پہلے حس اور عقل استدلالی میں تفریق کی اور کہا کہ کثرت کی دنیا حواس کی دنیا ہے جو غیر حقیقی ہے۔ حقیقی دنیا صرف عقل استدلالی ہی پر منکشف ہو سکتی ہے عالم ظواہر یا حواس کے عالم اور عالم حقیقی یا عقل استدلالی کے عالم کی یہ تفریق مثالیت پسندی کا سنگ بنیاد بن گئی۔ مثالیت پسندی کا اصل اصول یہی ہے کہ صداقت عقل استدلالی میں ہے حواس میں نہیں ہے۔ مادیت پسند کہتے ہیں کہ حواس کا عالم یا عالم ظواہر ہی حقیقی ہے جب کہ مثالیت پسندوں کا ادعا ہے کہ حواس کا عالم محض ظواہر پر مشتمل ہے جسے حقیقت سے دور کا واسطہ بھی نہیں ہو سکتا۔

افلاطون نے اپنے عالم مثال کو پارمی نائڈیس کے وجود کے ساتھ وابستہ کر دیا اور کہا کہ عالم مثال ہی حقیقی عالم ہے جس میں کوئی ردو بدل نہیں ہو سکتا۔ اسکا یہ خیال بھی پارمی نائڈیس سے ماخوذ ہے کہ عالم کی حقیقت معقولات و تجریدات میں ہے محسوسات و مدرکات میں نہیں ہے۔ افلاطون عالم ظواہر کو فریب نگاہ کہتا ہے جو امثال کے سایوں پر مشتمل ہے۔ افلاطون کی مثالیت پسندی تخیلاتی ہے کیوں کہ اسکے خیال میں عالم حقیقی کا عقلیاتی وقوف ممکن ہے اور علم کا ماخذ حسیات نہیں ہیں بلکہ عقل استدلالی ہے اسکے امثال لاتعداد ہیں اور منتشر نہیں بلکہ مدون صورت میں موجود ہیں اور ان کی ترتیب و ترکیب منطقی ہے۔ ان میں سب سے اعلیٰ خیر ہے سقراط نے یہ خیال لیا کہ کائنات ایک اخلاقی نظام ہے جس میں خیر، حسن اور صداقت کی ازلی و ابدی قدریں کار فرما ہیں یہ قدریں معروضی حیثیت میں موجود ہیں۔ خیر کی مثل اعلیٰ ہی خدا ہے

لیکن یہ خدا مذہب کے خدا کی طرح کوئی ذی ارادہ شخصیت نہیں ہے، محض ایک منطقی اصطلاح ہے۔ افلاطون نے، عالم کے غریب نظر ہونے، حیات اور موت اور روح کی بقا اور تناسخ ارواح کے تصورات فیثاغورس کے عارفی مت سے لئے ہیں۔ ہیرقلیتس نے سکون و وجود سے انکار کیا تھا اور کہا تھا کہ دنیا میں ہر کہیں حرکت ہے، ہر شے تغیر پذیر ہے۔ افلاطون نے یہ خیال عالم حواس میں منتقل کر دیا اور کہا کہ اس میں ہر کہیں حرکت و تغیر کی کارفرمائی ہے جب کہ عالم امثال ازلی اور غیر فانی ہے۔

افلاطون کا فلسفہ جو حقیقت و ظواہر یا غیر مرئی حقیقی اور مرئی غیر حقیقی کے فرق پر مبنی تھا بعد میں مذہب کی تصدیق و توثیق میں برتا گیا۔ اہل مذہب بھی عالم ظواہر کو عارضی اور عالم عقبیٰ کو حقیقی مانتے رہے ہیں اور اس عالم کو ارواح کا زندان سمجھتے رہے ہیں جس سے چھٹکارا پا کر روحیں کسی دوسرے عالم کو منتقل ہو جاتی ہیں۔ افلاطون نے اپنے اس خیال کو کہ عالم ظواہر عالم امثال کا سایہ ہے، غار کی مشہور تمثیل سے واضح کیا ہے۔ وہ کہتا ہے فرض کیجئے ایک غار ہے جس میں چند قیدی زنجیروں سے جکڑے ہوئے بیٹھے ہیں کہ وہ اپنے پیچھے مڑ کر دیکھ نہیں سکتے۔ ان کی پچھلی طرف آگ کا الاؤ روشن ہے جس کے باعث عقب سے گزرتے ہوئے لوگوں کے سائے ان قیدیوں کو سامنے کی دیوار پر دکھائی دیتے ہیں۔ قیدی کچھ نہیں جانتے کہ ان سایوں کی اصلیت کیا ہے۔ وہ تو اپنی آنکھوں کے سامنے صرف سائے ہی دیکھ سکتے ہیں۔ اسی طرح ہم بھی اس دنیا میں صرف امثال کے سائے دیکھتے ہیں۔ مثلاً ہم حسن ازل کے بارے میں کچھ نہیں جان سکتے البتہ اس دنیا کے خوبصورت چہروں سے قدرتی مناظر، پھولوں، پودوں، بادلوں وغیرہ کے حسن میں حسن ازل کا پرتو دیکھ سکتے ہیں۔ حسن ازل کا یہ تصور بعد میں مسرت پسندوں اور صوفیوں نے اپنا لیا اور اس کی بے پناہ کشش کو عشق حقیقی کا نام دیا۔ افلاطون کہتا ہے کہ اسکے نظام امثال کو صرف جدلیات کے علم ہی سے جانا جا سکتا ہے اور اسکے بقول یہ علم بہت ہی کم لوگوں کو ارزانی ہوتا ہے۔ افلاطون کی مثالیت پسندی کے اہم اصول جن سے بعد کے مثالیت پسندوں اور اہل مذہب نے فیضان حاصل کیا درج ذیل ہیں۔

۱۔ عالم دو ہیں: ظاہری اور حقیقی۔ عالم مثال حقیقی ہے کیونکہ اس تک عقلِ استدلالی کی رسائی ہو سکتی ہے۔ عالم مثال ساکن ہے حرکت و تغیر صرف عالم ظواہر میں ہے۔

۲۔ خیرِ مطلق یا مثلِ اعلیٰ جسے وہ خدا کا نام بھی دیتا ہے فکرِ محض ہے۔

۳۔ کائنات بامعنی ہے یعنی اس میں ایک واضح مقصد اور غایت کارفرما ہے۔

۴۔ موت کے بعد روح باقی رہتی ہے اور اپنے اعمال کے مطابق نیا چولا بدلتی ہے۔

۵۔ حسنِ ازل کی کشش ارواح کو اپنے مبدائے حقیقی کی یاد دلاتی رہتی ہے۔

۶۔ کائنات ایک عقلیاتی کل ہے جس کی حقیقت کا ادراک صرف عقلِ استدلالی ہی کر سکتی ہے۔

افلاطون کے ان افکار سے بعد میں عیسائی متکلمین اور مسلمان صوفیوں نے معذرت خواہی[1] کا کام لیا کیونکہ یہ مذہب و تصوف کے موافق تھے۔ اسی بنا پر آگسٹائن ولی نے افلاطون کو "فلاسفہ کا مسیحا" کہا تھا۔ اور غزالی نے افلاطون کو الٰہیون[2] میں شمار کیا تھا۔

ارسطو بھی اپنے استاد کی طرح مثالیت پسند ہے البتہ اُس نے افلاطون کی بعض فکری کوتاہیوں پر گرفت کی ہے مثلاً افلاطون نے اس بات کے متعلق توجیہ نہیں کی کہ اَمثال یا تجریدات جو عالم مادی سے ماورا ہیں عالم مادی کی تخلیق کیسے کرتے ہیں۔ اس اشکال کو افلاطون نے یہ کہہ کر رفع کیا ہے کہ ایک افسانوی معمار مادے پر امثال کی چھاپ لگاتا رہتا ہے۔ ارسطو نے اس تردد کو دُور کرتے ہوئے کہا کہ ہیئت[3] — افلاطون کا مثل یا عین — مادے سے علیحدہ نہیں بلکہ اس کے بطون ہی میں موجود ہوتی ہے۔ کائنات ازلی و ابدی ہے اور امثال اور مادہ ازل سے موجود ہیں۔ ہر مادی شے بالقوہ[4] سے بالفعل[5] ہوتی رہتی ہے اور یہی عمل دنیا میں حرکت و تغیر کا اصل سبب ہے۔ فاعل کسی ہیئت کو خلق نہیں کرتا۔ ایسا کرے تو وہ عدم سے خلق کرے گا جو محال قطعی رسطو نے خدا کو علت العلل کہا ہے جو کائنات کی علت غائی بھی ہے جس کی طرف کائنات اپنی تکمیل کے

---

[1] APOLOGETICS [2] THEISTS [3] FORM [4] POTENTIAL [5] ACT

لئے حرکت کر رہا ہے۔ اُس نے خدا کو فکر کی فکر اور محرکِ غیر متحرک بھی کہا ہے۔ ارسطو کا خدا بھی افلاطون کے خدا کی طرح غیر شخصی ہے۔ ارسطو کے فلسفے میں افلاطون کے نظامِ فکر کی طرح یہ خیال بڑی اہمیت رکھتا ہے کہ کائنات میں مقصدیت موجود ہے۔

عیسائیت کی اشاعت کے ساتھ قدر رفتہ انگریزی اور اس کے ملحقہ ممالک میں عقلی و فکری عمل دب کر رہ گیا۔ قسطنطنیہ کے جسٹینین نے آزاد خیالی کا قلع قمع کر دیا اور گبن کے الفاظ میں عیسائیت کی فتح کے ساتھ تو مغرب پر تاریک صدیوں کے گھپ اندھیارے چھا گئے۔ یورپ کے اس دورِ جاہلیت میں عربوں نے علم کی شمع روشن کی اور نہ صرف فلاسفۂ یونان کی کتابوں کو تہ خانوں سے نکال کر ان کے ترجمے کرائے بلکہ سائنس میں بھی گراں قدر اضافے کیے۔ عرب سائنس دانوں نے کیمیا، طبیعیات، علم الانسان، علم ہیئت، طب، جغرافیہ اور علم الحیل میں دادِ تحقیق دی۔ ان کی بدقسمتی سے متوکل عباسی کے دورِ حکومت میں رجعت پسند مُلّا برسرِ اقتدار آ گئے۔ انھوں نے سائنسی علوم کا گلا گھونٹ دیا اور سائنس دانوں اور فلاسفہ کو جبر و تشدد کا نشانہ بنایا۔ ان حالات میں قدرتاً عرب سائنس دان اپنے تجربات سے اخذ کیے ہوئے نظریات کا اظہار نہ کر سکے اور سائنس کو سخت دھچکا لگا۔ ابنِ خلدون اور ابنِ رُشد کے انقلابی افکار بھی دنیائے اسلام میں فروغ نہ پا سکے اور مغرب کو منتقل ہو گئے۔ ابنِ خلدون کی باریک بین نگاہوں نے یورپ میں اُبھرتی ہوئی نشاۃِ ثانیہ کو بھانپ لیا تھا۔ وہ اپنے مُقدمے میں لکھتا ہے کہ تاریک دماغ فقہا کی تعدّی کے باعث دنیائے اسلام میں علمی تحقیق کا بازار سرد پڑ گیا ہے جب کہ مغرب میں تحصیلِ علوم کا جوش و خروش بڑھتا جا رہا ہے۔

سائنس کی تاریخ میں ۱۷ویں صدی خاص طور سے قابلِ لحاظ ہے کہ اس صدی میں سائنس کو جو فروغ نصیب ہوا وہ گذشتہ دو ہزار برسوں میں بھی نہ ہوا تھا۔ اہلِ مغرب کے ذہن و دماغ پر سے صدیوں کی جمی ہوئی پھپھوندی چھٹ گئی اور اہلِ علم نے از سرِ نو مذہبی، عمرانی اور علمی مسائل پر آزادانہ غور و فکر کرنا شروع کیا۔ ۱۶۰۸ء میں ایک ولندیزی لپرشے نے دوربین ایجاد کی جس سے گلیلیو نے تحقیقی کام لیا۔ گلیلیو نے تھرما میٹر اور اس کے ایک شاگرد ٹوری چیلی نے بیرو میٹر ایجاد کیا۔ اور گیورک نے ہوائی پمپ کی ایجاد پیش کی۔ گلیلیو نے گھڑی کی اصلاح کی اور گلبرٹ نے مقناطیس پر اپنا مشہور

خار تھا۔ ہاروے نے گردشِ خون کا راز معلوم کیا۔ لیون ہاک نے پروٹوزوا اور بیکٹیریا دریافت کئے۔ دے کارٹ اور لائب نز نے جیومیٹری میں اضافہ کیا جس سے ریاضیاتِ اعلیٰ کی بنیاد استوار ہوئی۔ فرانسس بیکن نے قیاسی منطق کے خلاف قلم ٹھایا اور فلسفے کو علم کلام کی گرفت سے آزاد کرایا جس سے سائنسی نقطۂ نظر کی تقویت ہوئی اور مقصد و غایت کو جو افلاطون و ارسطو کے زمانے سے علمی تفکر کا اصلِ اصول بنے ہوئے تھے سائنس سے یکسر خارج کر دیئے گئے۔ کوپرنیکس اور گلیلیو نے جس ہیئت کی بنیاد رکھی وہ قدیم بطلیموسی ہیئت سے قطعی مختلف تھی۔ بطلیموس نے کرۂ ارض کو کائنات کا مرکز قرار دیا تھا۔ کوپرنیکس نے علمی شواہد سے ثابت کیا کہ کرۂ ارض آفتاب کا ایک معمولی سیارچہ ہے اور آفتاب بذاتِ خود معمولی ستارہ ہے۔ گلیلیو نے دوربین سے مشتری کے چاند دریافت کئے تو پادریوں نے اسکی سخت مخالفت کی اور کہا کہ ری مذہبی کتابوں میں ان چاندوں کا ذکر کہیں نہیں ملتا۔ اسلئے یہ جھوٹ ہے۔ گلیلیو نے ان سے کہا کہ آؤ میں تمہیں دوربین میں یہ چاند دکھاؤں لیکن انہوں نے انکار کر دیا اور اپنی ہٹ پر قائم رہے۔ ان انکشافات کے باعث ہر کہیں سائنس کا خیر مقدم کیا گیا اور علوم پر مذہب کا اجارہ ٹوٹ پھوٹ گیا۔ ۱۷ویں صدی کے آغاز میں بقول برٹرنڈ رسل[1] جادوگرنیوں آگ کے شعلوں میں جھونک دیا جاتا تھا لیکن اسکے اواخر میں سحر اور جادو خواب و خیال ہو کر رہ گئے۔ اس صدی کے اوائل میں لوگ شہابِ ثاقب سے شگون لیا کرتے تھے لیکن نیوٹن اور ہالے کی تحقیقات سے معلوم ہوا کہ یہ بھی کششِ ثقل کے قانون کے تحت نمودار ہوتے ہیں۔ اس طرح ایک ہی صدی میں انسان کا ذہن و دماغ ازمنۂ وسطیٰ کے دھندلکوں سے نکل کر سائنس کی روشنی سے منور ہو گیا۔

دے کارٹ کو جدید فلسفے کا بانی کہا گیا ہے وہ فلسفی ہونے کے علاوہ سائنس دان اور عالم ریاضیات بھی تھا۔ اسکا فکری رویہ جدید طبیعیات اور ہیئت سے تشکیل پذیر ہوا تھا اُس نے اپنی فلسفیانہ جستجو کا آغاز شک سے کیا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ صرف ایک ہی حقیقت ایسی ہے جو شک و شبہ سے بالاتر ہے اور وہ یہ ہے کہ "میں سوچتا ہوں لیے میں ہوں"۔ اسی اصول کو اسکے فلسفے اور نظریۂ علم کی کلید کہا جا سکتا ہے۔ اس سے ایک تو ذہن کا وجود مادے

---

[1] A HISTORY OF WESTERN PHILOSOPHY

کے وجود سے زیادہ یقینی ثابت ہوتا ہے، دوسری بات یہ ہے کہ مادے کو ذہن کے حوالے ہی سے جانا جا سکتا ہے اور خارجی اشیاء کا علم ذہن سے حاصل ہوتا ہے نہ کہ حواس سے۔ دے کارت کی یہ موضوعیت جدید فلسفے میں رُوح کی گہرائیوں تک نفوذ کر گئی اور مثالیت پسندوں نے خاص طور سے اپنے منطقی استدلال کا عنوان بنا لیا۔ دے کارت کی موضوعیت نے جدید مغربی فکر میں فردیت اور انا پرستی کے رُجحان کو پروان چڑھایا۔ جو جرمنوں کی مثالیت پسندی میں سرایت کر گیا۔ دے کارت کے اصل اصول "میں سوچتا ہوں اسلئے میں ہوں" کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ ہر شخص کے لئے اسکا اپنا ذہن ہی علم کا معیار ہے اور علم کا کوئی معروضی معیار ہو ہی نہیں سکتا جرمن رُومانی فلاسفہ سے لے کر ژاں پال سارتر تک کی موضوعیت اور فردیت اسی اصول کی صدائے بازگشت ہے۔ دے کارت کے ہاں مادہ ذہنی ہے جس کا ادراک کیا جا سکے یعنی مادہ مدرکات سے الگ اپنا کوئی معروضی وجود نہیں رکھتا یہی ادعا جملہ مثالیت پسندوں کا بھی ہے۔

جدید دور کی مثالیت پسندی عضویاتی طور پر رومانیت سے وابستہ ہے جس کا باوا آدم روسو تھا۔ رُوسو نے عقل تفکر اور سائنس کی مخالفت کی تھی۔ وہ فطرت کی جانب لوٹ جانے کی دعوت دیا کرتا تھا چنانچہ اُسے فرانسیسی قاموسیوں کی خرد پسندی اور دانش دوستی کے خلاف قلمی جہاد کا آغاز کیا قاموسی دانش اور سائنس کی روشنی میں جملہ علمی، معاشرتی اور اقتصادی عقدے حل کرنے پر اصرار کرتے تھے اور بڑے جوش و خروش سے اس اُمید کا اظہار کیا کرتے تھے کہ انسان سائنس کی مدد سے قدیم توہمات سے پیچھا چھڑا کر ایک نیا ترقی پرور معاشرہ قائم کرنے میں کامیاب ہو جائے گا جس میں روشن خیالی اور حقیقت پسندی کا دور دورہ ہوگا۔ وہ مذہب اور جہالت کو شاہیت سمیت انسانی ترقی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ سمجھتے تھے اور عقل و خرد پہ کامل اعتماد رکھتے تھے۔ فرانس میں قاموسیوں اور انگلستان میں گبن اور ہیوم نے علانیہ روایتی مذہب کے خلاف قلم اُٹھایا اور خدا، رُوح اور حیات بعد موت سے انکار کیا۔ وہ سائنس کی روشنی میں ایک نیا مذہب وضع کرنا چاہتے تھے

کے وُجود سے زیادہ یقینی ثابت ہوتا ہے، دوسری بات یہ ہے کہ مادے کو ذہن کے حوالے ہی سے جانا جا سکتا ہے اور خارجی اشیا کا علم ذہن سے حاصل ہوتا ہے نہ کہ حواس سے۔ دے کارت کی یہ موضوعیت جدید فلسفے میں رُوح کی گہرائیوں تک نفوذ کر گئی اور مثالیت پسندوں نے خاص طور سے اسے اپنے منطقی استدلال کا عنوان بنا لیا۔ دے کارت کی موضوعیت نے جدید مغربی فکر میں فردیت اور انا پرستی کے رُجحان کو پروان چڑھایا۔ جو جرمنوں کی مثالیت پسندی میں سرایت کر گیا۔ دے کارت کے اصل اصول "میں سوچتا ہوں اس لئے میں ہوں" کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ ہر شخص کے لئے اسکا اپنا ذہن ہی علم کا معیار ہے اور علم کا کوئی معروضی معیار ہو ہی نہیں سکتا۔ جرمن رومانی فلاسفہ سے لے کر ژاں پال سارتر تک کی موضوعیت اور فردیت اِسی اصول کی صدائے بازگشت ہے۔ دے کارت کے ہاں مادہ ذہنی ہے جس کا ادراک کیا جا سکے یعنی مادہ مُدرکات سے الگ اپنا کوئی معروضی وجود نہیں رکھتا یہی ادعا جُملہ مثالیت پسندوں کا بھی ہے۔

جدید دور کی مثالیت پسندی عضویاتی طور پر رومانیت سے وابستہ ہے جس کا باوا آدم روسو تھا۔ رُوسو نے عقل تفکّر اور سائنس کی مخالفت کی تھی۔ وہ فطرت کی جانب لوٹ جانے کی دعوت دیا کرتا تھا چنانچہ اُسنے فرانسیسی قاموسیوں کی خِرد پسندی اور روشن دوستی کے خلاف قلمی جہاد کا آغاز کیا قاموسی دانش اور سائنس کی روشنی میں جُملہ علمی، معاشرتی اور اقتصادی عقدے حل کرنے پر اصرار کرتے تھے اور بڑے جوش و خروش سے اس اُمید کا اظہار کیا کرتے تھے کہ انسان سائنس کی مدد سے قدیم توہمات سے پیچھا چھڑا کر ایک نیا ترقی پرور معاشرہ قائم کرنے میں کامیاب ہو جائے گا جس میں روشن خیالی اور حقیقت پسندی کا دور دورہ ہو گا۔ وہ مذہب اور جہالت کو بحیثیت انسانی ترقی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ سمجھتے تھے اور عقل و خرد پہ کامل اعتماد رکھتے تھے۔ فرانس میں قاموسیوں اور انگلستان میں گبن اور ہیوم نے علانیہ روایتی مذہب کے خلاف قلم اُٹھایا اور خدا، رُوح اور حیات بعد موت سے انکار کیا۔ وہ سائنس کی روشنی میں ایک نیا مذہب وضع کرنا چاہتے تھے

جو الہام اور وحی سے مُعتبر ہو۔ روسو نے ان خیالات کی مخالفت کی۔ روسو ہی سے خِرد دُشمنی کی روایت کا آغاز ہوتا ہے جس کی ترجمانی بعد میں فختے، نیٹشے، شوپن ہائر، برگساں وغیرہ نے کی تھی۔

اہلِ مذہب اور مثالیت پسند قدم قدم پر سائنس اور مادیت پسندی کی مخالفت کرتے رہے۔ نشاۃ الثانیہ کی صدیوں میں کلیسا نے سائنس کی اشاعت کو روکنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ تحریکِ اصلاحِ کلیسا بھی نشاۃ الثانیہ ہی کی ایک فرع تھی جس نے پاپائے روم کے ذہنی استبداد کا جُوا اتار پھینکا۔ سائنس کی ترویج اور اصلاحِ کلیسا کی تحریکوں کو کچلنے کے لئے احتساب کا محکمہ قائم کیا گیا اور یسوعیوں نے بجبر و اکراہ تحقیقِ علوم کے استیصال کی کوشش کی لیکن سائنس کے رواج و قبول کو روکنا ان کے بس کی بات نہیں تھی چنانچہ جیسا کہ ذکر آ چکا ہے ۱۷ویں صدی میں اہم انکشافات اور ایجادات کئے گئے۔ ۱۸ویں صدی کی تحریکِ خرد افروزی سائنس کے فروغ کا منطقی نتیجہ تھی۔ قاموسی خرد مندوں کی تحریریں بڑی مقبول ہوئیں خرد افروزی کے ہمہ گیر اثرات کو زائل کرنے کا بیڑا جرمن فلسفی عمانوئیل کانٹ نے اٹھایا جو روسو کا بڑا مداح تھا اور جسے جرمن مثالیت کا باپ کہا گیا ہے جرمن رومانیوں کو روسو کے رُوحانی بچے کہتے ہیں۔

رُومانیت کے دو بڑے اجزائے ترکیبی ہیں (۱) خرد دشمنی (۲) انا پرستی اور فردیت۔ رُومانیت ادب و شعر میں جذبات و احساسات کے بے محابا اظہار پر زور دیتی ہے اور کلاسیکیوں کی اصُولی بندشوں کی قائل نہیں ہے۔ اس کے شارحین میں گوئٹے، شلر، لسنگ، ہرڈر، بائرن، ورڈز ورتھ اور شیلی قابلِ ذکر ہیں۔ فلسفے میں اس کی ترجمانی موضوعیت، انا پرستی اور خرد دشمنی کی صورت میں کی گئی تھی۔ تحریکِ رُومانیت کا فکری پس منظر یہ ہے کہ قدمائے یونان انسان کو مرکزِ کائنات سمجھتے تھے کیونکہ بطلیموسی ہیئت کی رو سے سورج کرۂ ارض کے گرد گھومتا ہے۔ جب کوپرنیکس نے ثابت کر دیا کہ کرۂ ارض کائنات کا مرکز نہیں بلکہ نظامِ شمسی کا ایک حقیر سیارہ ہے تو انسان کی انا کو سخت ٹھیس لگی۔ اس ذہنی صدمے کے اندمال کے لئے رُومانی فلسفہ گھڑا گیا اور کہا گیا کہ کائنات میں وجودِ مطلق یا شعورِ مطلق واحد حقیقت ہے جو انسان کے ذہن و شعور سے معنوی مماثلت رکھتا ہے اس طرح گویا شعور کے حوالے سے دوبارہ انسان کو کائنات کا مرکز بنا دیا گیا۔ جرمن مثالیت پسندوں نے اس دلیل کو اتنا آگے پہنچا دیا اور بقول

وولف ڈیویڈ ان پریوں کی یہ کہانی گھڑی کہ ذہن ہی مادی دنیا کا خالق بھی ہے ۔ کانٹ سے پہلے بشپ بارکلے نے مذہبی نقطہ نظر کو تقویت دینے کے لئے کہا تھا کہ کائنات میں صرف مدرکات موجود ہیں مادے کا کوئی وجود نہیں ہے ۔ بارکلے کی طرح کانٹ نے بھی ثنائیت کے حوالے سے مذہبی اعتقادات کی بحالی کی کوشش کی ۔ کانٹ نے قدمائے یونان کی طرح ظاہری عالم اور حقیقی عالم کی تفریق کی ۔ اس کے خیال میں زمان و مکان کا عالم جس سے سائنس کا رابطہ ہے ۔ عالم ظاہر ہے ۔ حقیقی عالم تک رسائی پانا عقل و خرد یا سائنس کے بس کی بات نہیں ہے عقل و خرد حقیقی عالم کے بارے میں سوچنا چاہتی تو وہ تضادات کی شکار ہو جاتی ہے چنانچہ عالم حقیقی کا صرف مذہب ہی پر کشف ہو سکتا ہے ہم ذات خداوندی ، قدر و اختیار اور بقائے روح کی توثیق عقلی استدلال سے نہیں کر سکتے ۔ اس مقصد کے لئے اخلاقی وجدان کو بروئے کار لانا ہوگا ۔ اہل مذہب کی طرح اُس نے بھی سائنس کی جبریت کو یہ کہہ کر رد کر دیا کہ کسی بھی اخلاقی عامل[1] کے لئے ذی اختیار ہونا ضروری ہے ۔

کانٹ کا نظریہ بنیادی طور پر مثالیاتی ہے لیکن وہ مثالیت پسند کہلانا پسند نہیں کرتا تھا اور اپنے فلسفے کو تنقید کا فلسفہ کہا کرتا تھا ۔ اُسے لا ادری[2] بھی کہا گیا ہے کیوں کہ اس کے خیال میں عقل کی رسائی حقیقت نفس الامری تک نہیں ہو سکتی ۔ اس کے خیال میں ہمارے ذہن کی ساخت ہی ایسی ہے کہ ہم حقیقت کا ادراک کرنے سے قاصر ہیں ۔ کانٹ نے دیکارت کی موضوعیت کو قبول کر لیا اور کہا کہ زمان و مکان کا کوئی معروضی وجود نہیں ہو سکتا یہ تصور ہمارے ذہن نے خلق کیا ہے اور اس کے وجود کا انحصار ذہن ہی پر ہے ۔ کانٹ کی رومانی مثالیت پسندی اور مذہب میں اساسی اصول مشترک ہیں ۔

۱ ۔ کانٹ نے ذات باری اور روح کے وجود و بقا اور قدر و اختیار کے حق میں دلائل دیئے ہیں ۔

۲ ۔ دونوں میں اخلاقی وجدان کو ادراک حقیقت کے لئے ضروری خیال کیا جاتا ہے ۔

۳ ۔ کانٹ کی لا ادریت وہی ہے جو اہل مغرب کی خرد دشمنی سے پیدا ہوتی ہے اس نے یہ کہہ کر مذہب کو تقویت دی کہ حقیقت نفس الامری کا انکشاف عقل و خرد پر نہیں ہو سکتا ۔

۴ ۔ اس نے اہل مذہب کی طرح عالم ظاہر اور عالم حقیقی میں فرق کیا اور کہا کہ حقیقی عالم تک رسائی حاصل کرنے کے لئے

---

[1] MORAL AGENT

[2] AGNOSTIC

سائنس کا طریق تحقیق ناکام رہتا ہے جب کہ مذہبی وجدان اسے پالیتا ہے ۔

۵ ۔ دونوں کا الہیاتی نظریہ تشبیہی ہے ۔ مذہب میں خدا کو انسانی شکل و صورت اور احساس و جذبہ پر قیاس کیا گیا ہے کانٹ کی مثالیت پسندی میں کائنات کو انسان پر قیاس کیا گیا ہے یعنی وہ کہتا ہے کہ کائنات بھی انسان کی طرح ذہن و شعور سے متصف ہے اور کائناتی ذہن اور انسانی ذہن دونوں واحد النوع ہیں ۔

ہمارے خیال میں کانٹ کا جو نظریہ "تنقید عقل محض" میں پیش کیا گیا ہے اسے موضوعی مثالیت کہنا قرین صحت ہوگا ۔ قدمائے یونان کی مثالیت پسندی اور جرمنی کے رومانی فلاسفہ کی مثالیت پسندی میں فرق ہے ۔ یونان کے مثالیت پسند فلاسفہ افلاطون ، ارسطو وغیرہ عقلی استدلال پر محکم عقیدہ رکھتے تھے ۔ افلاطون اور پارمی نائیڈیس کا ادعا تھا کہ صرف عقل استدلالی ہی حقیقی عالم تک رسائی حاصل کر سکتی ہے ۔ اس کے برعکس کانٹ عقل استدلالی کو چنداں قابل اعتماد نہیں سمجھتا کیوں کہ وہ ادراک حقیقت سے قاصر ہے ۔ اس طرح کانٹ کے واسطے سے رومانوی فلسفے میں خرد دشمنی کی روایت نے راہ پائی ۔ کانٹ کی مثالیاتی روایت کی ترجمانی فشٹے ، شیلنگ اور ہیگل نے کی لیکن ایک اہم بات میں انہوں نے کانٹ سے انحراف بھی کیا ہے ۔ انہوں نے کانٹ کی لاادریت کو رد کر دیا اور کہا کہ عقل انسانی حقیقت نفس الامری کو جاننے پر قادر ہے وہ کہتے ہیں کہ حقیقت کامل و اکمل وحدت ہے جس کا ادراک صرف عقلی استدلال ہی کر سکتی ہے ۔ انہوں نے بھی روح مطلق ، وجود مطلق یا عین مطلق کو خدا کہا ہے ۔ فشٹے کا وجود مطلق اخلاقی ہے شیلنگ کا جمالیاتی ہے ۔ اور ہیگل کا عقلیاتی ہے ۔ اس اختلاف کے باوصف فلسفیانہ وحدت الوجود ان میں قدر مشترک کا درجہ رکھتی ہے ۔

فشٹے نے وجود مطلق کو ذات مطلق کہا ہے جو روحانی الاصل ہے ، غیر شخصی فعلیت ہے اور کائنات میں ہر کہیں طاری و ساری ہے تمام اذہان کا منبع و ماخذ بھی وہی ہے ۔ فشٹے کہتا ہے کہ حقیقی وجود انا کا ہے ۔ عالم مادی جو ہمیں بظاہر دکھائی دیتا ہے اسے انائے مطلق ہی نے خلق کیا ہے تا کہ اس سے پیکار آزما ہو کر وہ اپنی ورزش و تکمیل کر سکے ۔ فشٹے کے اس نظریے میں مثالیت پسندی اپنی انتہا کو پہنچ گئی ہے یعنی وہ کہتا ہے کہ کائنات کی اصل ذہنی ہے ، روحانی ہے ۔ فشٹے نے کائنات

میں ذہن اور مادے کی دوئی سے انکار کیا اور کائنات سے مادے کو یکسر خارج کر دیا۔ کائنات فی الاصل ذہن ہے یا انا ہے خدا ہے۔ فشتے کا یہ فلسفہ مثالیاتی انداز میں مذہب کی توثیق کرتا ہے اور صوفیانہ وحدت الوجود کی یاد دلاتا ہے۔ فشتے بھی اہل مذہب کی طرح انسانی قدر و اختیار اور روح کی بقا کا قائل ہے البتہ اسکے خیال میں وہی انا یا روح باقی رہے گی جو نیچر کے خلاف نبرد آزما ہو کر توانا ہو جائے گی پیہم کشمکش ہی روح کو غیر فانی بنا سکتی ہے ہمارے ہاں اقبال نے فشتے کے اسی فلسفے کو فلسفۂ خودی کے نام سے اسلام کا جامہ پہنایا ہے ۔

شیلنگ بھی فلسفیانہ رومانیت کا شارح ہے اسکا وجود مطلق جمالیاتی ہے اور کائنات ایک فن پارہ ہے جو ایک فنکار کی تخلیق ہے یہی نقطۂ نظر گوئٹے، شلر، ورڈزورتھ وغیرہ رومانیوں کا تھا۔ شیلنگ کے فلسفے کو وحدت الوجود بھی کہا جا سکتا ہے کیونکہ اس کے خیال میں نیچر مرئی روح ہے جبکہ روح غیر مرئی نیچر ہے۔ اسی خیال سے ورڈزورتھ، النگ، میرڈور وغیرہ رومانیوں نے فیض حاصل کیا انہوں نے نیچر کو ذی حیات اور ذی روح کہا اور پھر اس سے ذہنی و قلبی رابطہ قائم کرنے کی دعوت دی۔ آخری عمر میں شیلنگ پکا صوفی بن گیا اور کہنے لگا کہ روح بالآخر روحِ مطلق میں فنا ہو جاتی ہے ۔

ہیگل اوائل عمر میں تصوف کی جانب مائل تھا۔ وہ رُوسو اور کانٹ سے خاص طور سے متاثر ہوا تھا۔ اُس نے تصوف سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ وجودِ مطلق کے علاوہ جو شے بھی ہے وہ غیر حقیقی ہے وہ کہتا ہے کہ سوائے کُل کے کوئی شے حقیقی نہیں ہو سکتی۔ اسکے فلسفے میں کائنات ذہن کا ارتقاء ہے نیچر کی طرف۔ جو اعمال انسانی ذہن میں وارد ہوتے ہیں وہی نیچر میں بھی واقع ہوتے ہیں۔ نیچر میں یہ عمل لاشعوری طور پر ہوتا ہے جیسے کہ شاخ کا پھول بن جانا۔ انسان میں یہ عمل شعوری ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ وہ ارتقاء کے مراحل سے گزر رہا ہے۔ ہیگل کی کائنات ایک "کُل" ہے جو فکری عمل ہے اور فکری عمل ہی کی طرح ارتقاء پذیر ہے۔ یہ کامل مثالیت ہے۔ اس "کُل" میں جدلیاتی عمل جاری ہے یعنی مثبت، منفی اور اتحاد کا عمل جس میں تضادیں محفوظ رہتی ہیں۔ یہ عمل افکار میں جاری ہے لہٰذا کائنات بھی اصلاً فکری ہے اور فکر ہی کے قوانین کے تحت ارتقاء پذیر ہے۔ "کُل" نیچر اور انسان دونوں پر محیط ہے بعد میں ہیگل کے پیرو دو گروہوں میں بٹ گئے۔ دائیں گروہ، جیسے ایڈکن وغیرہ نے اسی فلسفے

کی تشریح یوں کی کہ مادہ ذہن کی تخلیق ہے اور اپنے وجود کے لئے ذہن ہی کا محتاج ہے۔ ہیگل اور اسکے پیرو عقلیت پسند ہیں یعنی ان کا عقیدہ ہے کہ عقلی استدلال مشاہدے اور حسی تجربے کے بغیر بذات خود صداقت کا انکشاف کر سکتی ہے۔ مثالیت پسندوں کے اس پہلو سے بھی مذہب کی تائید و توثیق کا کام لیا گیا ہے کیوں کہ مذہب کی سند انتہی بھی انسانی تجربے سے ماورا ہوتی ہیں ہیگل کے مقلدین ہربارٹ، ولیم جیمز، فورباخ وغیرہ کہتے ہیں کہ عقلیاتی استدلال کے لئے کچھ نہ کچھ موضوع تو ضرور ہونا چاہئے جس پر وہ کام کر سکے۔ مجرّد عقلی استدلال انسانی تجربے سے ماورا ہو کر یہ موضوع فراہم نہیں کر سکتی۔ علم کے دو پہلو ہیں ہیئت اور موضوع۔ عقلیت پسند صرف ہیئت سے اعتنا کرتے ہیں۔ لیکن ہیئت بغیر موضوع کے کھوکھلی ہے، جیسے موضوع بغیر ہیئت کے انتشار محض ہے علم نہ کھوکھلا ہے اور نہ انتشار ہے۔ مشاہدہ اور تجربہ موضوع فراہم کرتے ہیں۔ عقلی استدلال اس میں نظم و ضبط قائم کرتا ہے۔ تجربہ اور عقلی استدلال دونوں مل کر موضوع کو منظم کرتے ہیں۔ علم اسی تنظیم کا نام ہے۔ یونان قدیم میں سوفسطائیوں نے حسیات کے حق میں بات کی تھی اور کہا تھا کہ انسان حسی تجربے کے واسطے ہی سے علم حاصل کر سکتا ہے جدید دور میں بیکن، لاک، ہربارٹ، آگسٹس کومٹ، ولیم جیمز وغیرہ نے اس فکری رویے کے حق میں دلائل دیئے۔ اور تجربیت، نتائجیت، مادیت اور حقیقت پسندی کی تحریکوں کی آبیاری کی جس سے بالواسطہ سائنس کے نقطۂ نظر کو تقویت پہنچی۔

ہیگل کے فلسفے میں کائنات ارتقائی عمل ہے جس میں خدا عقل محرک کی حیثیت رکھتا ہے اور کائنات کے ارتقائی عمل میں شریک ہے۔ اس پر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ ہیگل کا خدا اگر شروع ہی سے کامل و اکمل تھا تو ارتقا کے عمل میں کیسے شریک ہوا اور اگر وہ کائنات کے ارتقا کے ساتھ ساتھ صورت پذیر ہو رہا ہے۔ تو اُسے کامل کیسے کہا جا سکتا ہے۔

ہیگل اور اسکے متبعین کائنات کو ایک عظیم ذات تصور کرتے ہیں جس کی ماہیت ذہنی ہے۔ وہ اس کائنات کو بامعنی کہتے ہیں یعنی اس میں ایسے معانی ہیں جو معروضی صورت میں موجود ہیں۔ اگر ان معروضی معانی کو تسلیم کر لیا جائے تو ظاہر ہے کسی نہ کسی نوعیت کی ذہنی حیات کو ماننا پڑے گا۔ اہل مذہب بھی کائنات میں معروضی قدروں کو مانتے ہیں اور ان کے حوالے سے خدا

کے وجود کا اثبات کرتے ہیں ۔ بعد کے جرمن فلاسفر اوئکن اور انگریز فلسفی جیمز وارڈ نے جرمن روحانی مثالیت کی ترجمانی کرتے ہوئے مذہب کی جانب ایک قدم اور آگے بڑھایا ۔ ہیگل اور اس کے متبعین کے وجودِ مطلق یا روحِ کل کو مذہب کا خدا تسلیم نہیں کیا جا سکتا کیونکہ وہ کوئی ذی ارادہ قادرِ مطلق شخصیت نہیں ہے ۔ مزید برآں یہ وجودِ مطلق کائنات سے ماوراء نہیں ہے بلکہ اس میں طاری و ساری ہے ۔ اس اعتبار سے مذہب کے شخصی خدا کی نفی ہوتی ہے کیونکہ اسے کائنات میں طاری و ساری تسلیم کر لیا جائے تو خدا کائنات کا خالق نہیں رہے گا نہ وہ اس میں تغیر و تبدل کرنے پر قدرت رکھے گا ۔ مذہب کے خدا کے لئے دو شرائط کا ہونا لازم ہے ایک یہ کہ وہ ایک ذی ارادہ شخصیت ہو اور دوسری یہ کہ وہ کائنات سے ماوراء ہو ۔ اوئکن اور جیمز وارڈ نے اس دقت کو یہ کہہ کر رفع کرنا چاہا کہ خدا کائنات میں طاری و ساری بھی ہے اور اس سے ماوراء بھی ہے ۔ خدا کو ماوراء کہہ کر وہ خدا کو خالق منوانا چاہتے ہیں اور اسے طاری و ساری اس لئے کہتے ہیں کہ وہ کائنات یا انسان کے عملِ ارتقاء میں پوری طرح شریک ہے ۔ خدا کائنات سے ماوراء ہو کر اس میں طاری و ساری نہیں ہو سکتا ۔ یہ محالاتِ عقلی میں سے ہے منطق میں اسے اجتماعِ النقیضین کہا جاتا ہے ۔

جرمن روحانی فلاسفہ اور ان کے متبعین کے افکار و انظار سے اہلِ مذہب نے اپنے اپنے عقاید کی توثیق کا کام لیا ہے اور ایک نیا علم کلام مرتب کر دکھایا ہے یہودیوں میں مارٹن بوبر، ہندوؤں میں اروبندو گھوش اور مسلمانوں میں اقبال جدید دور کے متکلمین ہیں ۔

جرمن مثالیت اور مذہب میں مندرجہ ذیل عناصر مشترک ہیں ۔

(۱) کائنات کی ماہیت ذہنی یا روحانی ہے ۔

(۲) خدا یا آفاقی ذہن کائنات کا اصل اصول ہے ۔

(۳) انسان ذی قدر و با اختیار ہے ۔

(۴) روح خدا یا روحِ کل سے عضویاتی طور پر وابستہ ہے ۔

(۵) موت کے بعد روح باقی رہے گی ۔

(۶) کائنات با معنی اور با مقصد ہے۔

(۷) اخلاقی قدریں معروضی ہیں۔

(۸) انسان میں خیر و شر کی تمیز وہبی ہے اکتسابی نہیں۔

(۹) انسان کے بطون میں ضمیر کی آواز ہے جو اسے بُرے کاموں سے منع کرتی رہتی ہے۔

(۱۰) زندگی کے بارے میں مذہب اور مثالیت پسندی دونوں کا نقطۂ نظر رجائی ہے یعنی دونوں میں انسان کو امید دلائی گئی ہے کہ وہ مر کر مٹ نہیں جائے گا بلکہ زندہ رہے گا۔ اسی عقیدے میں مذہب اور مثالیت پسندی کی کشش کا راز مضمر رہا ہے۔

اب سائنس اور مادیت پسندی کے رشتے کی بات ہوگی۔

شعور کی نشو و نما کے ساتھ قدیم انسان کی دہشت حیرت میں بدل گئی تو اس نے فلسفے اور سائنس کی جانب قدم بڑھایا اور اس کے ذہن و دماغ پر صدیوں سے چھائے ہوئے توہمات کے گھور اندھیارے چھٹنے لگے۔ انسان کے ذہنی و فکری ارتقاء کے لحاظ سے چھٹی صدی عیسوی قبل از مسیح بڑی انقلاب آفریں ہے اس صدی میں جہاں چین، ایران، ہندوستان اور اسرائیل میں کنفیوشس، زردشت، گوتم بدھ، اور یسعیاہ ثانی جیسے مصلحین پیدا ہوئے وہاں بحیرۂ روم کے ایشیائی کنارے کی ایک ریاست ملطیہ میں فلسفے اور سائنس کی داغ بیل ڈالی گئی۔ طالیس کو سائنس اور فلسفہ دونوں کا بانی کہا جاتا ہے ہیروڈوٹس کے بقول طالیس فنیقی الاصل ایشیائی تھا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ طالیس سے پہلے لوگ تفکر و تدبر سے عاری اور مشاہدے اور تجربے سے بے بہرہ تھے۔ چین، مصر قدیم، سمیر، بابل اور فنیقیہ میں داناؤں اور خردمندوں کی کمی نہیں تھی۔ ان کے جو مقولے ہم تک پہنچے ہیں وہ ان کی گہری دانش و بصیرت پر دلالت کرتے ہیں لیکن ایک مدون علم کی حیثیت سے ان کے ہاں منطق، جدلیات اور مابعد الطبیعیات کا کوئی وجود نہ تھا۔ اسی طرح جر ثقیل، مساحت، طب، علم الحیل وغیرہ کے اصول وضع کئے گئے تھے کلیں بنائی گئی تھیں۔ اور مختلف تجربات کیے جا رہے تھے۔ پروہت عوام کے ذہن و دماغ پر اپنی گرفت کو بحال رکھنے کے لئے اپنے دیوتاؤں کے مجسموں میں ایسی کلیں نصب کیا کرتے تھے جن کے باعث خاص خاص تہواروں پر مجسمے اپنے سر ہلاتے تھے یا سورج کی پہلی شعاعوں کے پڑنے پر سورج دیوتا کی مورتی کے منہ سے سریلی آوازیں

نکلتی تھیں۔ عمل و تجربی سائنس کا آغاز معبدوں ہی سے ہوا تھا۔ ان طریقوں سے عوام کو باور کرایا جاتا تھا کہ دیوتا اور دیویاں ذی حیات و ذی شعور ہستیاں ہیں جو پروہتوں کا کہا مانتی ہیں۔ بابل کے پروہت اپنے آپ کو اپنے دیوتاؤں کے معمولات سے باخبر رکھنے کے لئے راتوں کو اپنے مندروں کے میناروں پر چڑھ کر آسمان کا مشاہدہ کیا کرتے تھے۔ ان کے مشاہدات کو باقاعدگی سے مندروں میں محفوظ کر لیا جاتا تھا چنانچہ چھٹی صدی عیسوی قبل از مسیح سے کئی سو برس پہلے بابل کے پروہت سورج گرہن اور چاند گرہن کی صحیح پیش گوئیاں کرنے لگے تھے۔ جب گرہن کا وقت قریب آتا تو معبدوں میں اعلان کیا جاتا کہ ان کے مہربان حیات بخش دیوتا کی جان خطرے میں ہے اور تاریکی کے عفریت اس پر غلبہ پانے والے ہیں لوگ خوفزدہ ہو کر ان کے پاس ہجوم کر آتے اور قیمتی نذرانے دے کر گڑگڑاتے کہ کسی طرح سورج دیوتا کو بچایا جائے گرہن چھٹ جاتا تو ہر طرف خوشی کے شادیانے بجائے جاتے اس طرح سائنس کے اہم انکشافات پر صدیوں تک توہمات کے دبیز پردے پڑے رہے۔

طالیس ملیطی کی پیدائش سے کم و بیش دو ہزار برس پہلے عراق میں بابل اور اشور اور مصر میں ممفس اور تھیبس کے شہر تہذیب و تمدن کے گہوارے بن چکے تھے جہاں جادو ٹونے منتر، کہانت، علم نجوم اور فال گیری جیسے توہمات کے پردوں میں ریاضی، ہیئت، مساحت اور طب جیسے تحقیقی علوم کی بنیادیں پڑ چکی تھیں۔ معاصر اقوام کے طلبہ دور دراز کے شہروں سے سفر کر کے بابل اور مصر آیا کرتے تھے۔ طالیس نے بھی بابل اور مصر ہی سے فیض پایا۔ اور علوم تحقیقی میں اس قدر استعداد پیدا کر لی کہ اس کا شمار مشاہیر داناؤں میں ہونے لگا۔ علم ہیئت اور ریاضیات کے علاوہ اس نے مساحت کی تحصیل بھی کی۔ طالیس کے مرتب کئے ہوئے اصولوں پر جو بابل اور مصر سے اخذ کئے گئے تھے بعد میں اقلیدس نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب تصنیف کی تھی۔ مصر اور بابل سے فیض یابی کا سلسلہ بعد میں بھی صدیوں تک جاری رہا۔ فیثا غورس، افلاطون، زینو اور اپیکورس کے بارے میں مسلّم ہے کہ انہوں نے مصر اور بابل کے دانش وروں سے استفادہ کیا تھا۔ مصر و بابل کے علاوہ کنعان یا فنیقیہ بھی علوم و فنون کا مرکز بن گیا تھا۔ یونانیوں کو فنیقیوں ہی نے الفبا سکھائی تھی۔ قدمائے یونان فنیقیوں کو استاد سمجھتے تھے۔ یہ اعزاز بھی ایک فنیقی ہی کو نصیب ہوا کہ مذہب اور دیومالا کے توہمات سے ہٹ کر ریاضیاتی مساواتوں کے بل پر اس نے سورج گرہن کی پیش گوئی کی جو سچی ثابت ہوئی۔ اس طرح طالیس نے علم ہیئت

کو علم نجوم کے خرافات سے پاک کر کے اسے اپنے پاؤں پر کھڑا کیا اور نظری سائنس کی بنیاد رکھی ۔ دوسری طرف طالیس نے تاریخ عالم میں پہلی بار یہ سوال اٹھایا کہ کائنات کیسے معرض وجود میں آئی ہے اور اس کی تکوین کا اصل اصول کیا ہے ۔ طالیس کے زمانے تک پروہتوں کا دعویٰ یہ تھا کہ کائنات ایک بہت بڑے انڈے سے نکلی ہے یا جادو کے ایک کلمے سے تشکیل پذیر ہوئی ہے ۔ طالیس نے اس سوال کا عقلی جواب دینے کا تجسس کیا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ کائنات پانی سے بنی ہے اور پانی ہی اس کی تکوین کا اصل اصول ہے ۔ آج طالیس کے اس نظریے کو خندہ آور سمجھا جانے لگا لیکن فلسفے اور سائنس کی تاریخ میں یہ بات نہایت اہم ہے کہ طالیس نے تکوین کائنات کے طبیعی اسباب معلوم کرنے کی کاوش کی تھی ۔ اس پہلو سے وہ نیوٹن ، گلیلیو ، کیپلر اور آئن سٹائن کا پیش رو سمجھا جا سکتا ہے جنہوں نے جدید سائنس کو مذہب اور باطنیت کی غلامی سے نجات دلائی ۔ طالیس کی ذات سے طبیعی سائنس کا آغاز ہوا جس سے مظاہر کائنات میں آزادانہ غور و فکر کر کے ان کے تحقیقی و عقلی اسباب دریافت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے ۔

طالیس کے دو ہم وطن فلاسفر انکسی منیڈر اور انکسی مینیس نے اس سے اتفاق کیا کہ کائنات کی اصل مادہ ہے ۔ انکسا مینس نے کہا کہ کائنات میں جو کچھ بھی تبدیلیاں ہوتی ہیں وہ حرکت کے طفیل ہوتی ہیں جو ازلی و ابدی ہے ۔ انکسی منیڈر کے خیال میں کائنات پانی سے نہیں بنی بلکہ ایک لا محدود مادے سے بنی ہے جو حرکت کے سبب ٹکڑوں میں بٹ گئی اور مظاہر عالم وجود میں آ گئے ۔ اس نے بقائے اصلح اور ماحول سے موافقت کا ذکر کر کے ڈارون کی پیش قیاسی کی ہے ۔ اس کے خیال میں انسان حیوان کی ارتقا یافتہ صورت ہے ۔ ہیرقلیتس کا دعویٰ تھا کہ کائنات پانی یا ہوا سے نہیں بلکہ آگ سے بنی ہے جس کے کچھ حصے روشن ہوتے رہتے ہیں اور کچھ بجھتے رہتے ہیں ۔ اس کے خیال میں کائنات میں کسی شے کو سکون نہیں ہے ہر شے ہر وقت حرکت میں رہتی ہے ۔ ایمپی ڈکلیس کا نظریہ یہ تھا کہ کائنات عناصر اربعہ یعنی ہوا ، پانی ، آگ اور مٹی سے بنی ہے جنہیں وہ اصول اولیٰ کہا کرتا تھا ۔ وہ کائنات کو ازلی و ابدی مانتا تھا ۔ عناصر اولیہ کے نظریے میں اس نے طالیس ، انکسا مینس ، ہیرقلیتس اور ذیمقراطیس کے نظریات کو ملا دیا ہے ۔ وہ مادے کو غیر مخلوق مانتا تھا اور سمجھتا تھا کہ عناصر اولیہ کی ترکیب و انتشار سے اشیا معرض وجود میں آتی ہیں اور فنا ہوتی رہتی ہیں ۔ وہ زمان کی گردش کو غیر حقیقی سمجھتا ہے یعنی زمان [illegible] کا بھی قائل تھا ۔ اور سمجھتا تھا کہ [illegible]

بدل بدل کر درختوں اور حیوانات میں چلی جاتی ہیں ۔ اس نے یہ قیاس آرائی بھی کی کہ چاند سورج کی منعکس روشنی سے دمکتا ہے اور چاند کے سورج اور کرۂ ارض کے درمیان حائل ہونے سے گرہن لگتا ہے ۔

طالیس اور اس کے ہم نواؤں کی مادیت پسندی دیمقراطیس کے افکار میں نقطۂ عروج کو پہنچ گئی ۔ اس نے لیوکپس کے ساتھ مل کر ایٹموں کا نظریہ پیش کیا جو قدمائے یونان کے نظریات کی بہ نسبت جدید سائنس کے قریب تر ہے ۔ اس میں سقراط افلاطون اور ارسطو کے برعکس عالم طبیعی کی تشریح بغیر کسی علت غائی یا مقصد سے رجوع لائے کی گئی ہے ۔ دیمقراطیس کے خیال میں روح اور عقل ایک دوسرے سے جدا نہیں ہیں ۔ روح بھی دوسری اشیاء کی طرح ایٹموں سے مرکب ہے اور فکر و خیال ایک طبیعی عمل ہے روح کے انکار کے ساتھ اس نے حیات بعد موت کو بھی رد کر دیا ۔ اسکے خیال میں کائنات سر بسر مادی ہے اور اس میں کسی ماورائی ذہن یا شعور کا کوئی وجود نہیں ہے تمام فطری مظاہر پر اندھے میکانکی قوانین حاوی ہیں ۔ انسان بھی پودوں اور پتھروں کی طرح ایٹموں سے مرکب ہے جنہیں وہ سانس کے ساتھ باہر نکالتا ہے اور پھر اندر کھینچ لیتا ہے وہ اس عمل کے خاتمے پر مر جاتا ہے اور ایٹم منتشر ہو جاتے ہیں ۔ دیمقراطیس مذہب سے بیزار ہے اور دیوتاؤں کا منکر ہے وہ کہتا ہے کہ مذہبی عقائد نے انسان کو خوف زدہ کر رکھا ہے کائنات میں کسی قسم کا کوئی مقصد نہیں ہے ۔ اس میں صرف ایٹم ہیں جو میکانکی قوانین کے تحت ترکیب پاتے ہیں یا بکھر جاتے ہیں ۔ دیمقراطیس یونان قدیم کے مادی یا طبیعی فلسفے کا آخری ترجمان ہے جس کا نقطۂ نظر سائنٹیفک تھا ۔ اور جو ذوقِ تجسس سے سرشار تھا ۔ زندگی کے بارے میں اس کا انداز نظر رجائی ہے ۔ اسکے خیال میں زندگی کا واحد مقصد مسرت کا حصول ہے جو میانہ روی اور تہذیب نفس سے ارزانی ہوتی ہے ۔ وہ جذباتی ہیجان اور جوش و خروش کا مخالف ہے ۔ اسلئے عورت کو حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے کیونکہ عورت مرد کے جذبات کو بھڑکا دیتی ہے جس سے اس کا نفس اس کی عقل پر غلبہ پا لیتا ہے بعد میں اس کے خیالات سے اپیکیورس اور لکریشس متاثر ہوئے تھے ۔ سیاسیات میں وہ جمہوریت اور انسانی مساوات کا قائل تھا ۔ اس کا قول ہے ۔

" ہر دانش مند اور نیک شخص کے لئے ساری دنیا اسکا اور وطن ہے "

اس دور کے مادیت پسندوں کے جو اصول بعد کے مادیت پسندوں کی فکر و نظر کی اساس بن گئے درج ذیل ہیں۔

۱۔ مادہ وہ ہے جو مکان میں پھیلا ہوا ہے۔

۲۔ مادہ ازلی اور غیر فانی ہے۔

۳۔ مادے میں حرکت کی صلاحیت موجود ہے۔

۴۔ تمام حرکت مقررہ قوانین کے تحت جاری ہے۔

۵۔ شعور اور ذہن بھی دوسری اشیاء کی طرح ایٹموں سے مرکب ہے۔

۔ نیچر میں کوئی واقعہ بغیر سبب کے نہیں ہوتا۔ ہر سبب کا لازماً ایک سبب ہوتا ہے

۔ عالمی ذہن کا کوئی وجود نہیں ہے نہ عالم پر کسی ذی روح کی یزدانی قوت متصرف ہے۔

۔ روح ذہن ہی کا دوسرا نام ہے۔

۔ انسان موت کے بعد مٹی میں مل کر مٹی ہو جاتا ہے حیات بعد موت محض واہمہ ہے۔

۔ عالم مادی میں کوئی مقصد و غایت نہیں ہے۔

اس عالم میں ہر کہیں جبریت کا تسلط ہے کیونکہ ہر شے فطری قوانین میں جکڑی ہوئی ہے۔

ور کے مادیت پسندوں کا نقطہ نظر آفاقی تھا۔ انھوں نے تکوین کائنات اور مظاہر فطرت کے عقدوں کو تحقیقی انداز میں سلجھانے شش کی تھی۔ سوفسطائیوں اور سقراط کے ساتھ فکری کاوش کائنات سے ہٹ کر انسان اور اس کے مسائل تک محدود ہو گئی اور ن کا مطالعہ کائنات کے حوالے سے کرنے کے بجائے کائنات کا مطالعہ انسان کے حوالے سے کیا جانے لگا۔ ایلیاٹی فلاسفہ زینوفینس انڈلیس اور زینو کا رشتہ فکر مادیت پسندی دونوں کے ساتھ استوار رہا۔ وہ کائنات کو خدا سے واحد الاصل مانتے تھے۔ پارمی یدس نے زینوفینس کے افکار کی ترجمانی کرتے ہوئے کہا کہ کائنات کا اصل اصول وجود ہے جو واحد حقیقت ہے۔ کوئی شے عدم وجود میں نہیں آ سکتی لہٰذا وجود کے سوا کسی شے کا وجود ہونا ممکن ہے حقیقی وجود ایک ہے جسے ہم عقل استدلال سے جان سکتے ہیں

ہ حواس کا عالم ظواہر کا عالم ہے جو محض دکھاوا ہے، غیر حقیقی ہے، وہم باطل ہے۔ عالم حقیقی اور عالم ظواہر کی یہ تفریق مثالیت
بنیاد ثابت ہوئی۔ ایلیاطیوں کی وحدت الوجود کے اثرات مثالیت پسندی کے علاوہ تصوف اور دہریت پر بھی ہوئے
ری نے کہا تھا کہ خدا عالم سے ماورا کوئی خارجی قوت ہے۔ اس پر ارسطو نے بجا طور پر یہ اعتراض کیا تھا کہ یہ تعلیم توحید کی نہیں
ہے۔ ایلیاطیوں کی احدیت یا وحدت الوجود اصلاً مادیت پسندی ہے کیوں کہ وہ کائنات ہی کو وجود واحد کہتے ہیں۔
دہریت پسندوں، مثالیت پسندوں اور باطنیہ نے وجود واحد کو خدا کا نام دے کر اسے مذہب کا جامہ پہنا دیا تھا۔ حقیقت
وئی بھی احدیت پسند با مذہب نہیں ہو سکتا۔ احدیت میں ایک ذی ارادہ با اختیار شخصی خدا کا انکار لازم آتا ہے۔ احدیت
انیت میں بُعد المشرقین ہے۔ پارمی نائڈیس کو عقلی استدلال پر کامل اعتماد تھا۔ وہ کہتا ہے کہ جس شے پر غور و فکر نہیں کیا
اس کا کوئی وجود نہیں ہو سکتا۔ عقلیت پسندی کی اس روایت نے بھی بعد کے فلاسفہ کے افکار و انظار پر گہرے اثرات
ے۔

سقراط، افلاطون اور ارسطو کے ساتھ یونانی فلسفے میں مثالیت پسندی کا رجحان غالب آ گیا جس کا ذکر ہم مثالیت کے ضمن
یں گے۔ ان کے افکار کی مقبولیت کے باعث مادیت پسندی کی روایت دب کر رہ گئی۔ ارسطو کے بعد یونانی معاشرہ تنزل
ہو گیا۔ اس سیاسی تنزل کا اثر فکر و نظر پر بھی صاف دکھائی دیتا ہے ۱۴۶ ق م میں یونان کو روما الکبریٰ کا ایک صوبہ بنا
۔ رومی عملی قسم کے لوگ تھے۔ انہوں نے فلسفے اور دوسرے علوم کی تدریس کا کام یونانی غلاموں کے سپرد کر دیا کیوں کہ ان
بہترین دل و دماغ نظم مملکت اور تسخیر ممالک کے لئے وقف ہو کر رہ گئے تھے۔ روم کے دور تسلط میں دو مکاتب فکر صورت
ہوئے لذتیت اور رواقیت جن کے بانی اپیکیورس اور زینو معاصر تھے۔

یکی کا تعلق دیمقراطیس کی روایت سے تھا اور وہ پکا مادیت پسند تھا۔ دیمقراطیس کی طرح اس کا عقیدہ یہ تھا کہ عالم ذی
روں سے مرکب ہے جو فطری قوانین کے تحت ترکیب پاتے یا منتشر ہو جاتے ہیں۔ روح مادی ہے اور اس کے ایٹم تمام جسم میں سرایت
ے ہوئے ہیں۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ اگر روح مادی نہ ہوتی تو ہم خوشی یا غم کیسے محسوس کر سکتے تھے۔ روح کے ایٹم بھی ایسے ہی ہیں

جیسے کہ حرارت یا سانس کے ہوتے ہیں۔ البتہ وہ دیماقریطس کی جبریت کا منکر ہے اور انسانی قدر و اختیار کا قائل ہے وہ کہتا ہے کہ انسانی زندگی گریز پا ہے اسلئے جہاں تک ممکن ہو اسے ہنسی خوشی گزارنا ہی سچا فلسفیانہ رویہ ہے۔ اسکے خیال میں انسان حیات کے واسطے ہی سے علم حاصل کر سکتا ہے اور حس یا مشاہدہ ہی صداقت کا معیار فراہم کرتے ہیں۔ اسکا اخلاقیاتی اصول یہ ہے کہ خیر وہ ہے جو مسرت بخش ہو اور شر وہ ہے جو اذیت کا باعث ہو۔ جیسا کہ عام خیال ہے اپیکورس جسمانی لذات پر زور نہیں دیتا۔ اس کے خیال میں ذوقی لذائذ مادی لذائذ پر فوقیت رکھتے ہیں اور ایک عاقل ہی سچی مسرت سے بہرہ یاب ہو سکتا ہے۔ اخلاق یا خیر مقصود بالذات نہیں ہے بلکہ مسرت کے حصول کا ذریعہ ہے سیاسی سرگرمیاں ذہنی پریشانی کا باعث ہوتی ہیں۔ اسلئے ایک مرد دانا سیاسی امور میں دلچسپی نہیں لیتا اور گوشہ عافیت میں بیٹھ کر سکون اور آسودگی کی زندگی گزارتا ہے۔ کسی ذی عقل فرد کی زندگی کا اصل مقصد یہ ہے۔ کہ وہ مسرت کے حصول کی کوشش کرتا رہے اور درد و اذیت سے بچتا رہے۔ اپیکورس کے بارے میں رواقیوں کی یہ فقرہ بعض درست نہیں ہے کہ وہ کھانے پینے، جنسی ملاپ کرنے اور لیٹ کر خراٹے بھرنے کی دعوت دیتا ہے۔ اس کے خیال میں دوستی جو خلوص اور دلسوزی پر مبنی ہو انسان کو لطیف ترین مسرت بخشتی ہے اپیکورس اس لحاظ سے خوش نصیب تھا کہ اسے کئی مخلص اور بے لوث دوستوں کی رفاقت میسر تھی۔ جب وہ فوت ہوا تو اسنے اپنا اثاثہ اپنے مرحوم دوستوں کے بچوں کے لئے ورثے میں چھوڑا تھا۔ اپنے معترضین کی طنز کے برعکس اسنے جنسی عیش کوشی کی کبھی تلقین نہیں کی اور جنسی ملاپ میں مداہنت سے منع کیا اور کہا اس سے مسرت نہیں بلکہ اکتاہٹ حاصل ہوتی ہے۔

اپیکورس نے مسرت پر بحث کرتے ہوئے کہا ہے کہ انسان کو دو چیزیں سچی خوشی سے محروم رکھتی ہیں مذہب اور موت کا خوف۔ اس کے بقول مذہب نے حیات بعد موت کا جو تصور پیش کیا ہے اس نے انسانی مسرت کے سرچشمے میں زہر گھول دیا ہے۔ اس کا سوچا سمجھا ہوا عقیدہ یہ تھا کہ جسم کی موت کے ساتھ روح بھی فنا ہو جاتی ہے۔ اسلئے عالم عقبیٰ کی وحشت بے معنی اور بے بنیاد ہے۔ اسی طرح موت کا خوف بھی قرین دانش نہیں ہے کیونکہ "جب تم ہو گے موت نہیں ہو گی اور جب موت ہو گی تم نہیں ہو گے"۔

اپیکورس کی تحریریں دست برد زمانہ کا شکار ہو گئیں۔ زیادہ تر مخالفین کی کتابوں میں اس کے مقولے ملتے ہیں۔

نے وحدت الوجود کا پیوند لگایا اور کہا کہ خدا روحِ عالم ہے۔ وہ خدا کو عقلِ مطلق بھی کہتے ہیں لیکن روح کی طرح عقل کو بھی مادی مانتے ہیں۔ ان کا خدا مذہب کے خدا کی طرح کوئی ذی ارادہ شخصیت نہیں ہے۔ بلکہ کائنات ہی خدا ہے وہ ہمہ گیر دوستی کا پرچار کرتے ہیں اور ایپکیورس کے برعکس سیاسیات میں گہری دلچسپی لینے کے قائل ہیں کیوں کہ ان کے خیال میں سیاسی جدوجہد ہی سے عوام کے مفادات کا تحفظ کیا جا سکتا ہے۔ اس طرح ان کی اخلاقیات انا پسندی پر نہیں بلکہ عوامی فلاح پر مبنی ہے ان کا انسان دوستی کا اخلاقیاتی نصب العین افلاطون اور ارسطو کے اخلاقی نصب العین سے بلند و برتر ہے۔ کیوں کہ افلاطون اور ارسطو نے مملکت کی فلاح کے لیے غلامی کو ضروری قرار دیا تھا۔ رواقی مکمل انسانی مساوات کے قائل تھے اور کہتے تھے کہ سب بنی نوعِ انسان خواہ وہ یونانی ہوں یا غیر یونانی، عورتیں ہوں یا مرد، امیر ہوں یا غریب، دانش مند ہوں یا ان پڑھ، آقا ہوں یا غلام، تندرست ہوں یا علیل مساوی حقوق رکھتے ہیں۔ ایپکٹیٹس اپنے آپ کو ساری دنیا کا شہری[1] سمجھا کرتا تھا۔ عالمی شہریت کا تصور رواقیوں کی سب سے گراں قدر عطا ہے بعد میں رواقیوں کے کئی اصولوں کو کلیسائے روم کی تعلیمات میں شامل کر لیا گیا۔

روما الکبریٰ کے دورِ تنزل میں عیسائیت کی اشاعت ہوئی جس کی تگ و تاز میں قیصر قسطنطین نے جوش و خروش سے حصہ لیا۔ قیصر جسٹینین نے ایتھنز کی فلسفے کی درسگاہیں بند کر دیں اور یورپ پر دورِ جاہلیت کے گھور اندھیارے چھا گئے۔ برٹرنڈرسل کے الفاظ میں فلسفہ جو مذہب سے نکلا تھا۔ دوبارہ مذہب ہی میں غرق ہو گیا۔ ان تاریک صدیوں میں فلسفے کو مذہب کی لونڈی بنا دیا گیا اور اس کا مستقل مقام ختم ہو گیا۔ فلسفے کی جگہ علم کلام یا مدرسیت نے لے لی یعنی فلسفے کے اصولوں سے مذہبی عقائد کی توثیق کا کام لینے لگے۔ ٹامس اکوئناس اور ایبلارڈ کا شمار بڑے بڑے عیسائی متکلمین میں ہوتا ہے جنہوں نے افلاطون و ارسطو، ابن سینا وغیرہ کے افکار سے عیسائی مذہب کی تصدیق کا کام لیا۔ از منۂ وسطیٰ کی عقلی و فکری یخ بستگی کا طلسم اس وقت ٹوٹا جب اطالیہ اور فرانس کی درسگاہوں میں ابن رشد کا فلسفہ شامل درس کر لیا گیا اور اہل نظر نے اس کا حقیقت دوگونہ" کا نظریہ قبول کر لیا جس سے فلسفے کی مستقل بالذات حیثیت کو دوبارہ تسلیم کر لیا گیا۔ اس کے ساتھ یونانی علوم کا احیا ہوا اور لوگ مذہب

---

[1] KOSMOPOLITE

سے بحث کو فطری مظاہر میں محدود فیصلہ کرنے لگے جس سے سائنس کی ترقی کے لئے زمین ہموار ہو گئی۔ جو لوگ ان سے متاثر ہو کر رد بیکن نے مشاہدے اور تجربے کی اہمیت واضح کی۔ فرانسس بیکن نے ارسطو کی منطق قیاسی کو رد کر دیا اور فلسفے کو علم کلام کی گرفت سے آزاد کر لیا۔ تازہ افکار کی اشاعت سے سائنٹیفک طرز تحقیق کو رواج و قبول ہوا۔ اس دور کی آزادی فکر کا ایک پہلو خاص طور سے قابل لحاظ ہے اور وہ یہ ہے کہ افلاطون اور ارسطو کی مثالیت پسندی کا طلسم ٹوٹ گیا۔ ٹامس ہابس (۱۵۹۸ء — ۱۶۷۹ء) نے سب سے پہلے مادیت پسندی کے نئے رجحان کی ترجمانی کی اور سائنس کی روشنی میں فکر کو از سرِ نو مرتب کیا گیا۔ ہابس مذہب، باطنیت، روحانیت، الٰہیات اور علم کلام کا مخالف ہے۔ اور وہ ذہن کو بھی مادی کہتا ہے کیونکہ اس کے مطابق ذہن مغز سر کا فعل ہے چونکہ مغز سر مادی ہے اسلئے ذہن بھی مادی ہے۔ اسکے خیال میں حس[1] حرکت[2] ہے اور فکر[3] مرتی ہوئی حسیات کا ایک سلسلہ ہے۔ ہابس کہتا ہے کہ خدا کے وجود پر سائنٹیفک تحقیق کی جا سکتی ہے نہ اسے فلسفے تجسس کا موضوع بنایا جا سکتا ہے۔ لہٰذا فلسفہ تجربے کے مشاہدے تک محدود ہے۔ تجربے سے ماورا جو کچھ بھی ہے اسکا تعلق مذہب سے ہے سائنس سے نہیں ہے۔ کائنات کی ہر شے مادی ہے اور حرکت کر رہی ہے۔ مذہب کے بارے میں اس کا رویہ وہی ہے جو لوکریشس کا تھا یعنی مذہب ذہنی قوتوں کی دہشت کی پیداوار ہے۔ وہ کہتا ہے۔

" غیر مرئی قوت کا خوف انفرادی صورت میں توہم ہے اور اجتماعی صورت میں مذہب ہے۔ "

ہابس بھی دوسرے مادیت پسندوں کی طرح جبرِ مطلق کا قائل ہے۔ وہ کہتا ہے کہ انسان ذی قدر و اختیار نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ جس بات کا ارادہ کرتا ہے اس پر عمل کرنے میں تو آزاد ہے لیکن ارادہ کرنے پر مجبور محض ہے اس نے افلاطون کے اس خیال کو رد کر دیا کہ تعقل انسان میں خلقی طور پر موجود ہے کیونکہ تعقل پیدائشی نہیں ہوتی بلکہ مشاہدے اور تجربے سے صورت پذیر ہوتی ہے۔ اس طرح گویا ہابس نے یونان کے مثالیت پسندوں اور عیسائی متکلمین سے فلسفے کا رشتہ منقطع کر دیا۔

دے کارت (۱۵۹۶ء — ۱۶۵۰ء) کو جدید فلسفے کا بانی کہا گیا ہے۔ وہ سائنس داں تھا اور ریاضی کا عالم بھی تھا۔ اُسے جدید طبیعیات اور ہیئت سے گہرے اثرات قبول کئے تھے۔ جدید دور کے مثالیت پسند اور مادیت پسند دونوں اس کی روایت

---

[1] SENSATION [2] MOTION [3] THOUGHT

بڑے فکر جوڑنے کے مدعی ہیں۔ دے کارت نے فلسفے کے ساتھ علم کلام سے بھی اپنا رابطہ قائم رکھا کیونکہ اسے یسوعیوں کے مدرسے میں تعلیم پائی تھی۔ دے کارت نے مادے اور ذہن کی دوئی کا تصور پیش کیا۔ اس کے فلسفے کو میکانکی بھی کہا جاتا ہے کیونکہ اس کے دعوے کے مطابق اس کائنات کی اشیاء کو خدا نے بنایا اور ان میں حرکت پیدا کی چنانچہ اشیاء مقررہ میکانکی قوانین کے تحت حرکت کر رہی ہیں۔ بعد میں والٹیر نے خدا کو گھڑی ساز کہا تھا جس نے کائنات کی گھڑی بنائی اور اسے چابی دے کر چھوڑ دیا۔ چنانچہ وہ برابر حرکت کر رہی ہے دے کارت کا نقطۂ نظر اس لیے سائنٹیفک ہے کہ اس نے فلسفے سے مقصد و غایت اور ذہن کو نیچر سے خارج کر دیا۔ وہ کہتا ہے کہ کائنات انہی مقررہ قوانین کے تحت حرکت کر رہی ہے اس لئے ان قوانین کو سمجھ کر ہم کائنات کی قوتوں پر قابو پا سکتے ہیں۔ اس لحاظ سے اس نے سائنس کو ترقی دی۔ وہ انسان کو بھی حیوان کی طرح ایک خود کار کل سمجھتا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ انسان ذی شعور ہے دے کارت نے اپنے فلسفے کا آغاز اس قول سے کیا تھا جس میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں ہو سکتی "میں سوچتا ہوں اس لئے میں ہوں" اس نے خدا اور نیچر دونوں کو مستقل بالذات حیثیت دے دی ہے جس نے فلسفے میں کئی مسائل کھڑے کر دیئے۔ مثلاً یہ کہنا دشوار ہو گیا کہ خدا جو خالص روح ہے مادے کی حرکت کا باعث کیسے ہوا تھا۔ اس نے ذہن کو مادہ سے زیادہ یقینی بنا دیا اور جدید فلسفۂ مثالیت میں موضوعیت کا وہ رجحان پیدا ہوا جو جرمنوں کے سوا فلسفے کی ایک مستحکم روایت بن گئی۔ متکلمین اور مثالیت پسندوں نے کہا کہ بقول دے کارت ذہن کا عالم مادے کے عالم سے قطعی مختلف ہے چنانچہ مادے کا عالم سائنس کا ہے اور ذہن یا روح کا عالم مذہب کا خالصہ ہے۔

سپینوزا (۱۶۳۲ – ۱۶۷۷ء) یونان قدیم کے فلسفی پارمی نائیڈیس کی وجودی روایت سے تعلق رکھتا ہے اور وہ ابن میمون کے فلسفے سے ہسپانیہ کے عرب فلاسفہ سے متاثر ہوا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ وجود واحد ہی حقیقی ہے۔ خواہ اسے کائنات کہا جائے یا خدا کا نام دیا جائے۔ کثرت جو ہمیں دکھائی دیتی ہے غیر حقیقی ہے۔ دوسرے وحدت الوجودیوں کی طرح وہ مذہب کے شخصی خدا، انسانی قدر و اختیار اور روح کے وجود اور بقا کا منکر ہے۔ اس پہلو سے اس کی وحدت الوجود خالص مادیت پسندی ہے۔ کائنات کو خدا کہنے سے کچھ بھی فرق نہیں پڑتا کیونکہ کائنات کو خدا کہا جائے تو وہ ایک ذی ارادہ شخصیت نہیں بن جاتی۔ وحدت الوجود میں تناسخ کا انکار بھی لازم آتا ہے کیونکہ روح کا وجود تسلیم کر لیا جائے تو اس کی بقا پر بھی ایمان لانا پڑے گا جس کے موجودہ فلاسفہ منکر ہیں۔ ۱۰ اس

طرح اہل مذہب کی طرح خدا کی ذی ارادہ شخصیت کو تسلیم کر لیا جائے تو انسان کے قدر و اختیار کو بھی ماننا پڑے گا کیونکہ انسان ذی اختیار نہیں ہوگا تو خدا عالم الغیب بھی اس کے اعمال کا محاسبہ نہیں کر سکے گا۔ وحدت الوجود کے دوسرے شارحین شنکر، ابن العربی وغیرہ بھی جبر کے قائل ہیں اور یہ منطقی طور پر مادیت پسندوں ہی کی تائید کرتے ہیں۔ جبر کو مان لینے سے مذہب کے خوارق عادات کا انکار لازم آتا ہے۔ مادیت پسند جبر کے قائل اس لئے ہیں کہ ان کے خیال میں کائنات پر سلسلۂ سبب و مُسبب جیسے قوانین حاوی ہیں جن میں کسی قسم کا تصرف و تبدل نہیں کیا جا سکتا چنانچہ وحدت الوجود اور مادیت پسندی میں صرف نام کا فرق ہے جس طرح وحدت الوجود کے خدا اور کائنات میں محض نام کا فرق ہے۔ دونوں ایک ہی شے کے مختلف نام ہیں۔ اسی بنا پر شوپنہاؤر نے وحدت الوجود کو "شائستہ قسم کا الحاد" کہا ہے۔

پائرے بیل (۱۶۴۷ - ۱۷۰۶) کے ساتھ ہم تحریک خرد افروزی کے دور میں آ جاتے ہیں۔ اس نے اپنی مشہور ڈکشنری میں جس سے بعد میں قاموسی فلاسفہ نے استفادہ کیا۔ واشگاف انداز میں کہا کہ مذہب سائنس کی ترقی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ بن گیا ہے لہٰذا اسے صرف الہامی باتوں تک محدود کر دینا مناسب ہوگا۔ وہ کہتا ہے کہ مذہبی اعتقادات کو من و عن قبول کر لینے کے بجائے انہیں تحقیق کی کسوٹی پر پرکھنا ضروری ہے۔ اس نے ایک طرف الہام اور عقل استدلالی اور دوسری طرف مذہب اور سائنس میں خط امتیاز کھینچ دیا۔

تاریخ فلسفہ میں بالعموم اور مادیت پسندی کی روایت بالخصوص میں اٹھارویں صدی کی تحریک خرد افروزی ایک نشان امتیاز کا درجہ رکھتی ہے۔ اس کا آغاز ہالینڈ اور انگلستان کے چند دانش وروں نے کیا لیکن فرانس میں اس نے جڑیں پکڑ لیں۔ خرد افروزی سائنس کے رواج و قبول کا قدرتی نتیجہ تھی۔ اہل نظر نے مذہب کا تحقیقی جائزہ لیا تو اسے زر کم عیار پایا۔ انگلستان میں گبن اور ہیوم اس کے ترجمان تھے۔ اسے تشکک کا دور بھی کہا جاتا ہے۔ فرانس کے قاموسی فلاسفہ نے رواجی مذہب کو رد کر دیا اور سائنس کی روشنی میں ایک نیا مذہب مرتب کرنا چاہا۔ ان میں والٹیر، دیدیرو، لامتری، ہولباخ، کندورسے، ہیلوےشیس، کبانے، بوفون خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ انھوں نے علم کی روشنی پھیلانے کے لئے کئی جلدوں میں قاموس العلوم مرتب کی

جس سے ان کے گروہ کو قاموسی کہنے لگے۔ والٹیر اور دیدرو نے بڑی بے رحمی سے پادریوں کی دین فروشی اور ریاکاری کے پردے چاک کئے۔ قاموسی ہر نوع کی رجعت پسندی، تاریکی، تنگی، باطنیت، روحانیت، سریت، توہمات، مفروضات، دیو مالائی قصوں اور معجزات کے خلاف تھے جو ان کے خیال میں روشن خیالی کی اشاعت میں مزاحم ہوتے ہیں۔ وہ ہر کہیں سائنس دانش و خرد، تہذیب و تمدن اور فنونِ لطیفہ کو پھیلانے کے آرزومند تھے۔ انہیں انسان کی ترقی پر بے پناہ اعتماد تھا۔ اور وہ سائنسی انکشافات کی روشنی میں ایک نیا معاشرہ بنانا چاہتے تھے۔ اپنے افکار کی اشاعت کے لئے انھوں نے پینتیس جلدوں میں قاموس العلوم لکھی۔ اس کی پہلی سترہ جلدیں اکیلے دیدرو نے لکھی تھیں۔ والٹیر پہلا مورخ ہے جس نے تاریخ عالم پر قلم اٹھایا اور مشرقی ممالک چین، ہند وغیرہ کے تمدنی کمالات کی طرف توجہ دلائی۔ مالبرنے ریاضی، کنڈیاک نے نفسیات، ہولباخ نے چین پر مقالے لکھے لامتری اور ہلویشیس، ہیزیر، روبانی اور مورلی نے مادیت پسندی کی مکمل حمایت کی اور عیسائی مذہب کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ قاموسی جمہوریت پسند تھے اور انسان کو سلاطین کے جبر و تشدد اور مذہب کے تحکم سے آزاد کرانا چاہتے تھے۔ کنڈورسے اور ترگو کا دعویٰ تھا کہ سائنٹیفک طریقے سے حاصل کیا ہوا علم ہی صداقت تک پہنچنے میں ہمارا مددگار ثابت ہو سکتا ہے۔ دے کارت نے حیوانات کو خود کار کلیں کہا تھا۔ قاموسیوں نے کہا کہ انسان بھی حیوانات کی قسم کی ایک کل ہے۔ اگرچہ دوسری کلوں سے زیادہ پیچیدہ ہے۔ ان کے خیال میں کائنات چند اٹل قوانین کے تحت حرکت کر رہی ہے۔ اور اس پر کسی آفاقی ذہن یا شعور کی کارفرمائی نہیں ہے۔ دوسرے مادیت پسندوں کی طرح قاموسی بھی جبر مطلق کے قائل تھے اور کہتے تھے کہ کائنات میں قوانین کے وجود کو تسلیم کر لینے سے جبریت لازم آجاتی ہے۔ مادیت پسندی کے فلسفے کے لئے ہولباخ نے ایک نئی مابعد الطبیعیات مرتب کی۔ اس کا قول ہے کہ تفکر مغز سر کا فعل ہے جیسے ہضم معدے کا فعل ہے۔ لامتری، دیدیرو اور بوفن نے ڈارون کے نظریۂ ارتقا کی پیش بینی کی۔ قاموسی کہا کرتے تھے کہ مذہب ایک بھاری آہنی طوق ہے جو انسانیت کے گلے میں پڑا لٹک رہا ہے۔ اور اسے ترقی کی راہ میں آگے قدم بڑھانے میں مانع ہے اس طوق کو گلے سے اتار پھینکنا ضروری ہے۔ قاموسیوں نے مادیت پسندی، عقلیت، سائنٹیفک طرزِ تحقیق، جمہوریت اور اشتراکیت کے حق میں دلائل دیئے۔ ان کے چند

افکار کا قدرے تفصیلی جائزہ مناسب ہوگا۔

میزلیر اپنی کتاب "عہد نامہ" میں لکھتا ہے کہ مذہب شریعت ریاست اور کلیسا کی اس سازش کا ایک حصہ رہا ہے جس سے عوام کو ڈرا دھمکا کر مطلق العنان بادشاہوں کی اطاعت پر آمادہ کیا جاتا تھا۔ پروہتوں نے خدا کو ایک خوفناک متلوّن مزاج حاکم کی صورت میں پیش کیا ہے تاکہ اس کے نام پر وہ اپنے مفادات کا تحفظ کر سکیں۔ میزلیر کہتا ہے کہ اخلاق کی بنیاد ذہانت اور عقل و خرد پر رکھنا اور اس طرح اخلاق کو مذہبی توہمات سے پاک کرنا ضروری ہے۔ اس کے الفاظ میں "پروہتوں اور پادریوں نے عرصہ دراز سے عوام کی نگاہیں آسمان کی جانب موڑ رکھی ہیں۔ اب ان نگاہوں کو زمین پر واپس لوٹ آنا چاہیئے"۔ اس کے خیال میں ذہنِ انسانی خندہ آور قصے کہانیوں، طفلانہ رسوم عبادات، گمبھیر اسرار اور ناقابلِ فہم الہیات سے اکتا چکا ہے اور اسے قابلِ فہم سیدھی سادی صداقتوں اور مفید معلومات کی طرف توجہ دلانے کی ضرورت ہے۔ وہ کہتا ہے کہ انسانوں کو سوچنے، بولنے اور لکھنے کی آزادی دی جائے۔ تعلیم کو دنیوی اور غیر مذہبی بنا دیا جائے، درس و تدریس پر سے پابندیاں اٹھالی جائیں تاکہ انسان اپنی مطلوبہ منزل کی جانب قدم بڑھا سکے۔ وہ کہتا ہے کہ موجودہ معاشرتی نظام شر پر مبنی ہے۔ اس میں کروڑوں عوام فاقہ، جہالت اور رسوا کن افلاس کے شکار ہیں جب کہ گنتی کے چند امراء اور جاگیردار ہوسناکی اور عیش کی زندگی گزار رہے ہیں۔ اس تمام شر کی جڑ شخصی املاک ہے۔ شخصی املاک چوری ہے۔ اس چوری کے تحفظ کا کام تعلیم و تدریس، مذہب اور قانون سے لیا جا رہا ہے۔ ایسے انقلاب کی ضرورت ہے جس سے اکثریت کے خلاف چند لوگوں کی اس سازش کا خاتمہ کیا جا سکے۔ میزلیر پوچھتا ہے۔

> "کیا ژاک کلیمنٹ جس نے ہنری سوم کو موت کے گھاٹ اتارا تھا اور ریوے لاک جس نے ہنری چہارم کو قتل کیا تھا، فرانسیسی نہیں تھے؟ کیا آج ہم میں ایسے لوگ موجود ہیں جو بنی نوع کے دشمن دیو صفت امراء کو تہِ تیغ کر کے عوام کو ان کے جبر و تشدد سے نجات دلا سکیں؟ ذاتی املاک ساری قوم کے تصرف میں دے دی جائے۔ ہر شخص سے مناسب محنت مشقت لی جائے اور پیداوار کو برابر برابر تقسیم کر دیا جائے۔ مردوں عورتوں کو میل جول کی آزادی

دی جائے اور بچوں کو عوامی اداروں میں پروان چڑھایا جائے ۔ اس سے گھریلو جھگڑوں، طبقاتی کشمکش اور افلاس کا خاتمہ ہو جائے گا۔"

دی مابلی نے لکھا ہے "معاشرے کی تمام برائیوں کی جڑ ذاتی املاک ہے۔"

وہ کہتا ہے کہ جب تک معاشی غلامی برقرار و بحال ہے سیاسی آزادی بے معنی ہو گی ۔ اس کے خیال میں اشتمالی معاشرے ہی میں انسان نیکی اور مسرت سے بہرہ اندوز ہو سکتا ہے ۔ اشتمال المذہب یعنی کی بہترین اور جامع تشریح موریلی کی تصنیف "قانونِ فطرت" میں کی گئی ہے ۔ موریلی کہتا ہے کہ انسان بالطبع نیک ہے ۔ معاشرتی جبلتیں اسے نیک کاموں کی طرف مائل کرتی ہیں ۔ قوانین نے ذاتی املاک کے ادارے کو قائم کیا اور اس کا تحفظ کر کے انسانی اخلاق و کردار کو تباہ کر دیا ۔ ذاتی املاک کے باعث آدمی میں خود نمائی، تکبر، جاہ طلبی، خباثت، جبر و استحصال اور ریاکاری کے عوامل پیدا کیے ۔ حصولِ املاک کے جنون نے اخلاقی برائیاں پیدا کیں ۔ سوفسطائی کہتے تھے کہ انسان بالطبع اشتمالیت سے نفور ہے ۔ حقیقت یہ ہے کہ اشتمالیت سے انحراف کر کے انسان جو بالطبع نیک تھا شریر اور خبیث بن گیا ہے ۔ اگر انسان لالچ، خود پسندی، نفرت اور رقابت سے مبرا ہوتا جنہیں ذاتی املاک نے جنم دیا ہے ۔ تو وہ نہایت امن اور سکون سے بھائیوں کی طرح مل جل کر رہ سکتا تھا ۔ معاشرے کو نئے سرے سے تعمیر کرتے وقت ضروری ہے کہ اخلاقیات اور سیاسیات کے بارے میں آزادانہ بحث کی جائے ۔ دانش وروں کو موقع دیا جائے کہ وہ ان غلط تصورات پر جرح و تنقید کر سکیں جن کے باعث ذاتی املاک کا قیام عمل میں آیا تھا ۔ ذاتی املاک کو صرف ان اشیا تک محدود کر دیا جائے جو کسی فرد کی ذاتی ضروریات ہیں ۔ ہر قسم کی پیداوار کو ذخیروں میں جمع کر کے اسے شہریوں میں ان کی ضروریات کے مطابق تقسیم کیا جائے ہر صحت مند شخص سے کام لیا جائے اور بے کار طبقات کا استیصال کر دیا جائے ۔ موریلی کی کتاب "قانونِ فطرت" ہی سے وہ اصول لیا گیا ہے جو بعد میں اشتمالی انقلاب کا نعرہ بن گیا ۔

"ہر ایک سے اس کی قابلیت کے مطابق ، ہر ایک کو اس کی ضروریات کے مطابق ۔"

ہنری لنسگوئٹے نے اپنی کتاب "سیاسی قوانین" میں لکھا کہ ذاتی املاک کو طاقت اور دھوکے سے حاصل کیا جاتا ہے اور پھر قانون

ے جواز اور تحفظ کا آلہ کار بنایا جاتا ہے ۔ وہ لکھتا ہے ۔

" مروجہ قوانین کا مقصد ذاتی املاک کا تحفظ ہے ۔ ان کی مدد سے امراء کی جائیداد کو مفلسوں اور
قزاقوں سے بچایا جاتا ہے بظاہر یہ بات ناقابل یقین ہے لیکن حقیقت یہی ہے کہ قوانین بعض پہلوؤں سے
عوام کے خلاف سازش کا نتیجہ ہیں ۔

وہ کہتا ہے کہ سرمایہ داروں اور محنت کشوں میں کشمکش شروع ہے کیونکہ محنت کش اپنی محنت اور قوت بازو
پنے آقاؤں کے ہاتھ بیچنے پر مجبور ہیں گوڈون نے اس بات کا تصور دیا ہے کہ معاشی نظام کو ریاست کے نظم و ضبط سے آزاد کر دیا گیا
تو معاشرہ خود بخود خوشحال ہو جائے گا ۔ وہ کہتا ہے کہ اس کے برعکس دولت چند ہاتھوں میں اکٹھا ہو جائے گی قیمتیں چڑھ جائیں گی ۔ اور
اجرتیں ان کا ساتھ نہیں دے سکیں گی ۔ اگرچہ غلامی کو قانوناً ممنوع قرار دے دیا گیا ہے پھر بھی امراء کے ہاتھوں اشیاء کی قیمتیں مقرر ہونے
سے مزدور غلام ہو کے رہ گئے ہیں ۔ ماقبل دور کے غلاموں کو کم از کم کھانے اور رہائش کی فکر تو نہیں ہوتی تھی جبکہ آزادانہ معاشی
نظام میں جب کوئی آقا یہ محسوس کرے کہ اسے مزدوروں کی خدمات سے خاطر خواہ مالی فائدہ نہیں پہنچ رہا تو وہ انہیں کام سے نکال
سکتا ہے ۔ اس پیچ اور ظلم کا ازالہ صرف انسانی انقلاب ہی سے ممکن ہو سکتا ہے ۔

ہلویشیس نے اپنی کتاب " ذہانت کے بارے میں " میں لکھا کہ فلسفے کا کام یہ ہے کہ اخلاق کو مذہبی
عقاید سے پاک کر کے مدون کیا جائے اور اسے ترقی دی جائے وہ کہتا ہے کہ افراد و اقوام کی زبوں حالی کے دو اسباب ہیں ۔

۱ ۔ ناقص قوانین

۲ ۔ پیداوار کی نا منصفانہ تقسیم

ہر ملک و قوم میں دو طبقے موجود ہیں ۔ ایک وہ طبقہ جو ضروری اشیاء کے لئے ترس رہا ہے ، دوسرا وہ جو عیش و عشرت میں غرق
ہے ۔

دولباخ اٹھارہویں صدی کا بہت بڑا مادیت پسند تھا۔ اسکے ہاں اپنے زمانے کے مشاہیر ہیوم، سٹرن، گیرک، ہیلویس، والپول، گبن، فرینکلن، پریسٹلے، آدم سمتھ وغیرہ مہمان ہو کر ٹھہرا کرتے تھے۔ دولباخ پادریوں سے سخت نفرت کرتا تھا۔ اس کی کتاب "عیسائیت کا کچا چٹھا" میں کلیسا اور ریاست کے اتحاد کو تنقید و تعریض کا ہدف بنایا گیا ہے۔ اس نے مذہب کو عوام کے لئے افیم کہہ کر کارل مارکس کی پیش قیاسی کی تھی۔

"مذہب لوگوں کو جوش جنوں سے سرشار کرتا ہے تاکہ وہ ان مظالم کے انسداد کی طرف متوجہ نہ ہو سکیں جو ان کے حکام ان پر ڈھاتے ہیں۔ حکومت کرنے کا فن ان اوہام و خرافات سے استفادہ کرنے کا نام ہے جو عوام کے ذہنوں پر مسلط ہیں۔ ریاست اور کلیسا عوام کو نامعلوم اور غیر مرئی قوتوں کا خوف دلا کر انہیں ان جور و ستم کو خاموشی سے برداشت کرنے پر مائل کر لیتے ہیں جو مروجہ قوانین ان پر کر رہے ہیں۔ عوام کو یہ امید دلائی جاتی ہے کہ اگر وہ اس دنیا میں زبوں حالی کی زندگی قبول کر لیں گے تو اگلے جہان میں مسرت سے بہرہ ور ہوں گے۔"

دولباخ کے خیال میں ریاست اور کلیسا کا اتحاد فرانس کا بنیادی شر ہے۔" میں مذہب پر حملہ کرتا ہوں کیونکہ یہ ٹھوس اخلاق کے خلاف ہے"۔ وہ کہتا ہے کہ اخلاق کو مذہبی عقائد پر قائم کرنا خطرناک ہے۔ کیونکہ مذہبی عقائد بدلتے رہتے ہیں۔ اور ان کا خاتمہ اخلاق کا بھی خاتمہ کر دیتا ہے لہٰذا مذہبی اخلاق کے بجائے طبیعی اخلاق کی ترویج مناسب ہو گی۔ دولباخ اپنی کتاب "نظام فطرت" میں کہتا ہے۔

"عقل و خرد کی دنیا میں انسان کو ان تمام تعصبات کا انسداد کرنا چاہئے جن کے شکار بنی نوع انسان صدیوں سے ہو رہے ہیں۔ انسان کے لئے ضروری ہے کہ وہ دلیرانہ اقدام کرے۔ عقل و خرد کا احترام واجب ہے۔ صداقت کی محبت لازم ہے تاکہ انسان اپنے تجربات پر حصر کرے اور مذہبی ڈگم[1] کے تحت اپنے تخیل کا غلام ہو کر نہ رہ جائے۔ انسان اپنی

---

[1] DOGMA

> فطرت پر اخلاق کی بنیاد رکھے، اپنی ضروریات کے مطابق اسے ڈھالے، معاشرے کے مفاد کو ملحوظ رکھے۔ اپنی ذات کے ساتھ پیار کرے تاکہ وہ عقلیت اور زندگی سے بہرہ یاب ہو سکے، اسی صورت میں وہ مسرت سے بہرہ اندوز ہو سکتا ہے۔"

دولباخ نے مادے کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ جو کچھ ہماری حسیات پر اثر انداز ہوتا ہے وہی مادہ ہے۔ وہ کہتا ہے۔

> "کائنات کی ہر شے حرکت میں ہے۔ مادے کا جوہر فعالیت ہی ہے ہم غور سے مشاہدہ کریں تو معلوم ہوگا کہ جہالت اور دہشت نے دیوتاؤں کی تخلیق کی تھی تخیل، جوش وخروش اور مکر نے اس میں رنگ بھرا یا ان کی صورت مسخ کر دی کمزور لوگ انہیں پوجتے ہیں۔ تشدد انہیں تقویت دیتا ہے۔"

وہ کہتا ہے۔ "جو لوگ چاہتے ہیں کہ ان کی بات سمجھ میں آجائے تو انھیں اپنی گفتگو میں "خدا" اور "تخلیق" جیسی ترکیب کے استعمال سے اجتناب کرنا چاہیئے۔"

دولباخ نے لا مذہبیت کا ایک باقاعدہ مسلک مرتب کیا تھا وہ کہتا ہے کہ خدا کا تصور ہی نوع انسان کے لئے ایک مصیبت بنا ہوا ہے طبیعیات پر یقین رکھنے والا مذہبی عقائد کو قبول نہیں کر سکتا نہ فریب نفس میں مبتلا ہو سکتا ہے۔ صداقت کا شیدائی باطل کے ساتھ کیسے سمجھوتا کر سکتا ہے۔

دولباخ کو اس بات میں شک ہے کہ مذہب انسان کے تزکیہ اخلاق کا باعث ہوا ہے۔ وہ کہتا ہے۔

> "ایک بزدل کے مقابلہ میں جو دوزخ سے ڈرتا ہے ہزاروں لوگ ایسے بھی ہیں جو اس سے خوفزدہ نہیں ہیں، لاکھوں ایسے ہیں جو اس سے دہشت زدہ ہو کر عقل و ہوش سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں اور دوسروں پر وحشیانہ مظالم ڈھاتے ہیں۔ اور بدگمان مذہبی دیوانے بن جاتے ہیں، لاکھوں ایسے ہیں جو دوزخ کے ڈر سے فہم سلیم کھو بیٹھتے ہیں اور معاشرے کی جانب سے جو فرائض

ان پر عائد ہوتے ہیں انھیں نظر انداز کر دیتے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ضمیر خدا کی آواز نہیں ہے بلکہ پولیس کا خوف ہے ہم دیکھتے ہیں کہ امیروں کو ضمیر کی خلش کبھی محسوس نہیں ہوتی نہ انہیں اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ انھوں نے غریب شہریوں پر ظلم کر کے دولت اکٹھی کی ہے ۔ مذہبی دیوانے نہایت بے رحمی سے ان لوگوں کا قتل عام کر دیتے ہیں جو ان سے اختلاف رائے کی جسارت کریں ۔"

دولباخ بھی لاک اور کارل مارکس کی طرح کہتا ہے ، کہ محنت ہی تمام دولت کا ماخذ ہے ۔ وہ کہتا ہے ۔

"ایک کاروباری شخص سے زیادہ خطرناک کوئی آدمی نہیں ہوتا ۔ وہ ہر روز اپنے شکار کی تلاش میں رہتا ہے ۔ کئی اقوام تاجروں کے ہاتھوں تباہ ہو جاتی ہیں ۔ ملک تباہ ہو جاتے ہیں محصولات میں اضافہ ہوتا ہے عوام فاقے کرنے لگتے ہیں تاکہ چند لوگوں کی ہوس زر کی تسکین ہو سکے ۔"

اس کا قول ہے ۔ "ایک امیر آدمی یا تو خود لفنگا ہوتا ہے یا کسی لفنگے کا وارث ہوتا ہے ۔"

وہ پوچھتا ہے "کیا دنیا کے عوام چند بے کار ، بد اخلاق خونخواروں کی عیش و عشرت کا سامان اکٹھا کرنے اور ان کی حرص اور خود نمائی کی تسکین کے لئے محنت و مشقت کرتے رہیں گے ؟"

پھر کہتا ہے ۔ "دنیا بھر میں عوام کی کم و بیش تین چوتھائی تعداد فاقہ زدہ ہے جب کہ گنتی کے کچھ لوگ املاک اور دولت پر قابض ہیں ۔ عوام کے آقا بنے بیٹھے ہیں اور دوسروں کی کمائی پر گلچھرے اڑا رہے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ انسان خبیث اس لئے نہیں ہے کہ وہ خبیث پیدا ہوتا ہے بلکہ اسے خبیث بنا دیا جاتا ہے ۔ طاقت ور اُمرا افلاس زدہ عوام کو کچل کر رکھ دیتے ہیں ۔ اور ان سے باز پرس کرنے والا کوئی نہیں ہوتا ۔ باز پرس کرے گا بھی کون ؟ حکومت کی باگ ڈور جو انھی کے ہاتھوں میں ہوتی ہے ۔"

اٹھارہویں صدی کی مادیت پسندی کا ذکر کرتے ہوئے برٹرنڈ رسل نے اس کے تین عناصر گنوائے ہیں ۔

۱۔ حقائق مشاہدے پر مبنی ہونے چاہئیں نہ کہ اس سند پر جو محض تحکم پر مبنی ہو۔

۲۔ مادی دنیا ایک ایسا نظام ہے جو خود کار ہے اور جس میں تمام تغیرات طبیعی قوانین کے تحت ہوتے ہیں۔

۳۔ کرۂ ارض کائنات کا مرکز نہیں ہے اور نہ اس کا کوئی مقصد و معنی ہے۔

یہی تینوں عناصر میکانکی نقطۂ نظر کے اہم پہلو ہیں جس کا آغاز گلیلیو اور نیوٹن سے ہوا تھا اور جو ۱۹ ویں صدی میں بار آور ہوا جو انیسویں صدی کی میکانکی مادیت کے دو ترجمان خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں، چارلس ڈارون اور ارنسٹ ہیکل۔ ڈارون نے ذی حیات پر طبیعی قوانین کا اطلاق کرتے ہوئے کہا کہ انسان آسمان سے گرا ہوا فرشتہ نہیں ہے بلکہ زمین سے اوپر اٹھا ہوا حیوان ہے۔ ہیکل کے خیال میں نیچر کی تشریح کے لئے کسی ماورائی ہستی سے رجوع لانے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ ذہن نیچر ہی سے متفرع ہوا ہے۔ نیچر ایک عظیم کل ہے جو قوانین ستاروں پر جاری ہیں وہی انسانی طرزِ عمل پر بھی مسلط ہیں۔ کائنات کی ہر شے سلسلۂ سبب و مسبّب میں جکڑی ہوئی ہے۔ اس لئے خوارقِ عادات کا کوئی وجود نہیں ہو سکتا۔ وہ کہتا ہے کہ طبیعی حقیقت ہی اصل حقیقت ہے۔ اس پر مافوق الطبع ہستی کا تصرف نہیں ہے "کائنات کا معمہ" میں ہیکل نے کہا ہے کہ شعور نفسیاتی منعکس فعالیت سے بتدریج صورت پذیر ہوا ہے۔

ہمارے زمانے کا عظیم فلسفی کارل مارکس ابتداء میں ہیگل کا پیرو تھا۔ اس نے ڈاکٹریٹ کے لئے اپیکورس پر مقالہ لکھا تو مادیت پسندی کی طرف مائل ہو گیا۔ اس کے ساتھ وہ فوئرباخ کی اس تنقید سے بھی متاثر ہوا جس نے ہیگل کی مثالیت پسندی کو تہس نہس کر کے رکھ دیا تھا۔ فوئرباخ نے نہایت شرح و بسط سے مذہب اور مثالیت پسندی کے ربط باہم سے بحث کی اور دلائل و شواہد سے ثابت کیا کہ مثالیت پسندی کے مباحث مسائل مذہب ہی سے ماخوذ ہیں۔ دونوں میں خدا، روح اور بقا کے عقاید مشترک ہیں۔ مثالیت پسندوں کی عالمِ ظواہر اور عالمِ حقیقی یا ظاہر و باطن کی تفریق مذہب سے یادگار ہے۔ مثالیت پسند بھی اہلِ مذہب کی طرح انسان کو ذی اختیار مانتے ہیں۔ ان کے ہاں بھی عقل و وجدان کا تقابل موجود ہے۔ مثالیت پسندی میں خرد دشمنی کی روایت مذہبی اثرات کی غمازی کرتی ہے۔ مثالیت پسند بھی کائنات میں مقصد و غایت کے قائل ہیں۔ فوئرباخ کے مطالعے سے کارل مارکس نے مثالیت پسندی کو رد کر دیا لیکن وہ فوئرباخ کی ازلی و ابدی اخلاقی قدروں کا منکر تھا اور کہتا تھا کہ ان قدروں کے حوالے سے فوئرباخ نے دوبارہ مثالیت پسندی کو فلسفے

۱۔ ACTIVITY

میں داخل کردیا ۔ کارل مارکس کے بقول فویرباخ مابعد الطبیعیات میں تو مثالیت پسندی کا منکر ہے لیکن اخلاقیات میں مثالیت پسند بن گیا ہے ۔ کارل مارکس نے مادیت پسندی سے مابعد الطبیعیات کو خارج کر کے اس میں جدلیات کو داخل کیا اور جدلیاتی مادیت پسندی کی بنیاد رکھی ۔ وہ فرانسیسی قاموسیوں کی عقلیت اور انقلابیت سے بھی متاثر ہوا لیکن وہ ان کی میکانکی مادیت سے مطمئن نہیں تھا

جدلیاتی مادیت پسندی کے اصل اصول درج ذیل ہیں ۔

۱ ۔ مادہ شعور پر مقدم ہے یعنی مادہ پہلے تھا ۔ شعور ذہن انسانی کے ارتقاء کے ساتھ صورت پذیر ہوا ۔ ذہن و شعور مادے کی ایک صفت ہے ۔ کیونکہ ذہن و شعور مغز سر کی کیفیت ہے اور مغز سر مادی ہے ۔ مثالیت پسندوں کا یہ دعویٰ درست نہیں ہے کہ ذہن نے مادے کو خلق کیا ہے ۔ کرۂ ارض کے سورج کے گرد گھومتے پر پچاس ارب برس گزر چکے ہیں جب کہ انسان کا ظہور دس لاکھ برس قبل ہوا تھا ۔

۲ ۔ مادہ ذہن و شعور سے الگ اپنی مستقل بالذات صورت میں موجود ہے ۔ کائنات میں کسی قسم کے ماورائی ذہن و شعور کا کوئی وجود نہیں ہے ۔

۳ ۔ کائنات میں کوئی بھی شے مطلق ، قطعی اور اٹل نہیں ہے سب اشیاء مسلسل حرکت و تغیر کی حالت میں ہیں ۔

۴ ۔ ہر شے میں اس کی ضد موجود ہے جو اس کی نفی کرتی ہے ۔ اس نفی کی بھی نفی ہو جاتی ہے اور مثبت اور منفی کے اتحاد سے پھر جدلیاتی عمل شروع ہو جاتا ہے ۔ یہ قانون ہیگل کی جدلیات سے ماخوذ ہے ۔ کارل مارکس نے ہیگل کی جدلیات کو افکار سے مادے میں منتقل کر دیا ہے اور طبقاتی کشمکش کا اصل اصول بھی بنا دیا ہے ۔

۵ ۔ کائنات کی اشیاء یا معاشرے کے اعمال ایک دوسرے سے الگ تھلگ موجود نہیں ہیں بلکہ ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے رہتے ہیں ۔ چنانچہ سیاسیات ، اخلاقیات معاشیات اور ادبیات کا آپس میں گہرا رابطہ قائم ہے ۔ اور وہ ایک دوسرے کو متاثر کرتی رہتی ہیں ۔

۶ ۔ عالم یا معاشرہ دو قسم کی اشیاء پر مشتمل ہے ۔ ۱۔ بنیاد یا وجود ۲۔ فکر یا بالائی عمارت ۔ مثلاً مادی احوال

پیداواری قوتیں اور پیداواری علائق بنیاد بناتے ہیں جن پر سیاسیات، فلسفہ، مذہب، اخلاق، ادب و فن کی بالائی عمارت تعمیر کی جاتی ہے۔

٧ ۔ جدلیاتی مادیت اور تاریخی مادیت ایک ہی اصل اصول کے دو پہلو ہیں۔ معاشرہ انسانی پر جدلیاتی مادیت کا اطلاق کیا جائے تو اسے تاریخی مادیت کہیں گے جس طرح ذہن پر مادے کا عکس پڑتا ہے۔ اسی طرح معاشرے کے معاشی نظام کا عکس اس کے مذہب، سیاسیات، فنون لطیفہ اور اخلاقیات پر پڑتا ہے۔ تاریخی مادیت میں پیداواری قوتوں اور پیداواری علائق کا تضاد معاشرے میں تبدیلیوں کا باعث ہوتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں معاشی احوال ہی عمل تاریخ کے اصل محرک ہیں اور سیاسی، معاشرتی، اخلاقی، مذہبی اور فنی قدروں کا تعین کرتے ہیں۔

٨ ۔ ذہن مادی نہیں ہے جیسا کہ مثالیت پسندوں کا ادعا تھا بلکہ حقیقی اشیاء کا عکس ہے یہ عکس فوٹوگراف نہیں ہوتا کیونکہ حقیقی اشیاء ذہن میں منعکس ہو کر بدل جاتی ہیں۔ ذہن میں اشیاء نہیں ہوتیں بلکہ ان کا عکس ہوتا ہے مثلاً جب بھی کوئی شخص ایک کتاب دیکھتا ہے تو اس کے ذہن میں کتاب نہیں چلی جاتی بلکہ اس کا عکس ہوتا ہے یعنی پہلے کتاب ہے پھر اس کا عکس ذہن پر پڑتا ہے۔ لہٰذا فکر و احساس حقیقت کا عکس ہے۔

٩ ۔ فکری نتائج حتمی اور قطعی نہیں ہوتے کیونکہ خارجی عالم ذہن میں منعکس ہو کر بدل جاتا ہے اور ذہن بذات خود خارجی حقائق پر اثر انداز ہو کر بدلتا رہتا ہے۔ یہ جدلیاتی عمل ذہن میں جاری رہتا ہے۔ علم اس وقت صداقت بنتا ہے جب وہ عمل سے مطابقت رکھتا ہو اور اس کی تصدیق عمل ہی سے کی جاسکے۔ گویا عمل ہی صداقت کا مصدر بھی ہے اور اس کا معیار بھی ہے۔ پہلے حسیات معلومات کی صورت اختیار کرتی ہیں پھر ان معلومات سے نتائج فکر اخذ کئے جاتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں محسوسات و مدرکات سے معقولات و تجریدات اخذ کیے جاتے ہیں۔

۱۰۔ علم کو عمل سے اور عمل کو علم سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ جو نظریہ عمل میں نہ ڈھل سکے وہ بانجھ ہے۔ اور جس عمل کے پیچھے کوئی نظریہ نہ ہو وہ بے مصرف ہے۔

۱۱۔ انسان فطرتی قوانین کے ہاتھوں مجبور ہے لیکن ان قوانین کی تفہیم سے وہ قدر و اختیار کو پا لیتا ہے گویا جبر و اختیار ایک دوسرے سے جدا نہیں ہیں۔ اختیار جبر ہی میں مخفی ہے۔ یہ ایک عظیم ثمر آور خیال ہے جس نے جبر و قدر کے مسئلے کو جو شروع سے فلاسفہ کو پریشان کر رہا تھا شافی طور پر حل کر دیا ہے۔ جبر و اختیار کے اتحاد پر بحث کرتے ہوئے کارل مارکس نے مثال دی ہے کہ جب تک انسان برق کی ماہیت سے بے خبر تھا، وہ اس کے سامنے بے بس اور مجبور تھا لیکن جب اس نے برق کو سمجھ لیا تو وہ اسے اپنے کام میں لانے میں مختار ہو گیا۔ اسی طرح جب محنت کشوں پر قدر زائد کا راز کھل جاتا ہے اور انہیں محنت اور سرمائے کے تضاد کا شعور ہو جاتا ہے۔ تو سرمایہ داروں کے استحصال سے نجات پانے کے لئے کشمکش کرنے کا اختیار انہیں مل جاتا ہے۔ اور یوں وہ جبر میں اختیار کو پا لیتے ہیں۔

ہیگل کا قول ہے۔ "جبر اسی وقت تک اندھا ہوتا ہے جب تک اسے سمجھا نہ جا سکے"۔

لینن نے کہا "قدر و اختیار وہ جبر ہے جس کا وقوف ہو جائے"۔ کارل مارکس کے یہاں قدر و اختیار کا مطلب نیچر یا معاشرے کے قوانین سے آزادی پانے کا نہیں ہے۔ بلکہ ان کے جبر کے دائرے میں رہ کر قدر و اختیار حاصل کرنا ہے۔

۱۲۔ زمان کی حرکت نہ مستقیم ہے جیسا کہ اہل مذہب سمجھتے ہیں اور نہ دولابی ہے جیسا کہ قدما کا خیال تھا۔ جیسے آدمی گول زینے پر چڑھتے ہوئے چکر لگاتا ہوا اوپر جاتا ہے۔ اسی طرح ہمیں بظاہر یہ گمان ہوتا ہے کہ تاریخ دائرے میں چکر لگا رہی ہے لیکن فی الواقع وہ ان چکروں میں گھومتی ہوئی آگے بڑھ رہی ہے۔

مارکس کے فلسفے پر محاکمہ کرتے ہوئے برٹرنڈ رسل اپنی تاریخ فلسفۂ مغرب میں لکھتے ہیں۔

"کارل مارکس آخری فلسفی ہے جس نے کوئی باقاعدہ نظام فلسفہ مرتب کیا ہو۔ ابتدا میں

وہ ہیگل کا پیرو تھا لیکن بعد میں اس کے نظریات سے منحرف ہو گیا۔ اگرچہ اس نے بدلی ہوئی صورت میں ہیگل کی جدلیات کو اپنایا۔ وہ خود مادیت پسند ہونے کا مدعی تھا لیکن اس نے قدیم مادہ پسندی میں جدلیات کا اضافہ کیا۔ اس نے کہا کہ صداقت یا حقیقت وہ ہے جس کا اثبات عمل سے کیا جائے ورنہ اس کا وجود محض نظریاتی ہوگا۔ اس کا نظریہ تاریخ ہیگل سے متاثر ہے وہ کہتا ہے کہ دنیا ایک جدلیاتی مادے کے تحت ترقی کرتی ہے لیکن جیسا کہ ہیگل نے کہا ہے اس ارتقاء کا محرک روح نہیں ہے بلکہ مادہ ہے یا دوسرے الفاظ میں محرک وہ علائق انسانی ہیں جو مادے سے متعلق ہیں۔ ان میں سب سے اہم طریقہ پیداوار ہے۔ اس کے خیال میں تاریخ کے کسی عہد کی سیاسیات، فلسفہ، مذہب، آرٹ اس عہد کے طریقہ پیداوار کی تخلیقات ہیں۔ اس نظریے کو تاریخ کی مادی ترجمانی کا نام دیا گیا ہے۔ میں بھی ایک حد تک اس نظریے سے متاثر ہوا ہوں۔"

یں صدی میں سائنس کا بہ محاورۂ انگریزی ایک زبردست 'دھماکہ' ہوا جس کے سامنے گزشتہ تین صدیوں کے سائنسی افات ماند پڑ گئے اور جس نے کائنات کے بارے میں ہمارے زاویہ نگاہ کو یکسر بدل کے رکھ دیا ہے۔ میرا اشارہ "نظریات اضافیت" ر مقادیر عنصری کی طرف ہے۔ آئن سٹائن کے نظریہ اضافیت نے زمان و مکان کے بارے میں وہ تصورات بدل دیئے ہیں لیو اور نیوٹن سے یادگار تھے۔ منکوسکی، لورنز اور آئن سٹائن کی تحقیقات سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی ہے کہ زمان، زمان/ ان کی غیر منقسم اکائی[1] کی چوتھی بعد[2] ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اب کوئی ایک آفاقی زمان[3] نہیں رہا بلکہ زمان/مکان اکائی کی تھی بُعد بن کر رہ گیا ہے عالم چار ابعاد کی اکائی ہے۔ زمان/مکان کے تین ابعاد مکانی ہیں۔ اور چوتھی بعد زمانی ہے گویا اضافیت" رو سے زمان و مکان ایک دوسرے سے علیحدہ مستقل بالذات حقیقت میں موجود نہیں ہیں بلکہ اضافی ہیں اور باہم دگر وابستہ ہیں۔ نظریۂ ضافیت کا ایک پہلو یہ ہے کہ کشش ثقل کے نظریے کا خاتمہ ہو گیا ہے اور اس کی جگہ تفریقی قوانین تعلیل[4] نے لے لی ہے۔

---

[1] SPACE-TIME CONTINUUM [2] DIMENSION [3] COSMIC TIME
[4] DIFFENTIAL CAUSAL LAWS

دوسرے نظریے مقادیر عنصری[1] نے مادے اور توانائی کو باہم متبادل قرار دیا ہے جس کی تصدیق آئن سٹائن نے بھی کی ہے۔ نظریۂ مقادیر عنصری کی شروعات انیسویں صدی کے نصف میں اس تجربے کے ساتھ ہوئی کہ جب ویکیوم ٹیوب میں بجلی کی رو گزاری جاتی ہے تو ٹیوب میں عجیب سی شعاعیں نمودار ہو جاتی ہیں۔ انہیں کیتھوڈ ریز کا نام دیا گیا۔ ایک سائنس دان جوزف تھامسن نے کہا کہ بجلی کی لہریں ہیں جنہیں آج کل ہم الیکٹران کہتے ہیں اور جو توانائی کے ریزے[2] ہیں۔ ۱۹۱۹ء میں لارڈ رتھر فورڈ نے نائٹروجن گیس میں ان ذرات سے دھماکہ کیا جس سے نائٹروجن بھاری آکسیجن میں تبدیل ہو گئی یعنی ایک عنصر دوسرے عنصر میں بدل گیا۔ یہیں سے ایٹم کے تجزیے کی بنیاد پڑ گئی اور اسی عمل سے بعد میں پلوٹونیم نامی عنصر دریافت کیا گیا جو ایٹم بم میں بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ ایک سائنس دان لوئی ڈکر نے ثابت کیا کہ الیکٹران ایک ننھا منا ذرہ ہی نہیں ہے بلکہ روشنی کی لہروں جیسی لہروں پر مشتمل ہے۔ بعد میں پروٹان اور نیوٹران دریافت کئے گئے۔ جیمز چیڈوک نے جس نے نیوٹران دریافت کیا تھا کہا کہ نیوٹران میں برقی چارج نہیں ہوتا۔ ڈنمارک کے ایک سائنس دان نیلز ڈبوہر نے کہا کہ الیکٹران اپنے مرکز کے گرد گھومتے ہیں۔ جیسے نظام شمسی میں سیارے سورج کے گرد چکر لگاتے ہیں۔ ان انکشافات سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی کہ مادہ ٹھوس نہیں ہے بلکہ توانائی کے ریزوں پر مشتمل ہے یعنی توانائی ہی کی ایک صورت ہے جو نامعلوم قوانین کے تحت مربوط ہو کر ٹھوس مادے کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ ایٹم کا مرکزہ دو قسم کے توانائی کے ریزوں سے مرکب ہے مثبت چارج والے الیکٹران اور بغیر چارج کے نیوٹران۔ اس مرکزے کے گرد منفی ریزے تیزی سے گردش کرتے ہیں۔ ہائزن برگ اور شروڈنگر نے ثابت کیا کہ مادہ کوئی ٹھوس شے نہیں ہے میز کرسیاں، درخت، انسان، پتھر، سورج، چاند وغیرہ تجریدات[3] ہیں اور ایسے واقعات کے سلسلے ہیں جو چند قوانین کے تحت صورت پذیر ہوتے ہیں۔ شروڈنگر نے یہ انکشاف کیا کہ ایٹم کے اجزا یعنی توانائی کی لہروں میں آزادہ روی پائی جاتی ہے البتہ اس دعوے کی کوئی توجیہ نہیں کی جا سکی۔ ہائزن برگ نے اس پر صاد کیا ہے اور اصول آزادہ روی[4] سے اس کی تصدیق کی ہے۔ اس دریافت سے کلاسیکی مادیت پسندی کا خاتمہ ہو گیا ہے۔ انیسویں صدی کی جبریت کو پلانک کے اس نظریے سے ٹھیس لگی کہ فطرت ایک مسلسل عمل کی پابند نہیں ہے بلکہ جستوں اور جھٹکوں سے کام لیتی ہے۔ قدیم فلاسفہ کا خیال تھا کہ فطرت خلا سے نفرت کرتی ہے۔ اب یہ کہا جانے لگا ہے کہ فطرت تسلسل و توازن سے بیزار ہے۔ ہمارے زمانے

---

[1] QUANTUM THEORY [2] PARTICLES [3] ABSTRACTIONS
[4] INDETERMINACY

کے فلاسفۂ اضافیت کے نظریے کی فلسفیانہ تعبیریں کر رہے ہیں ۔ ان نظریات کے نتائج جو فلسفیانہ نقطۂ نظر سے اہم ہیں ۔ درج ذیل ہیں ۔

۱ ۔ مادہ اور توانائی متبادل ہیں ۔

۲ ۔ کلاسیکی مادیت کا خاتمہ ہو گیا ہے ۔

۳ ۔ توانائی کی لہروں میں آزادہ روی پائی جاتی ہے ۔

۴ ۔ زمان مکان / زمان اکائی کی چوتھی بُعد ہے ۔

۵ ۔ توانائی کی لہروں میں تاثر کا سبب و مسبب موجود نہیں ہے ۔

سائنس کے ان انکشافات کی حسب مطلب ترجمانی کرتے ہوئے اہل مذہب اور مثالیت پسند کہہ رہے ہیں کہ مادہ غائب ہو گیا ہے ۔ اس لئے مذہب کی صداقت کا ثبوت مل گیا ہے وہ ایٹم کی لہروں کو ذہنی یا روحانی کہہ کر غلط فہمی پیدا کر رہے ہیں حالانکہ نہ مادہ غائب ہوا ہے اور نہ ایٹم کی لہروں، پروٹان، الیکٹران وغیرہ کو ذہنی یا روحانی کہنے کا کوئی قرینہ ہی موجود ہے ۔ حقیقت یہ ہے کہ مادے اور توانائی کے متبادل ہونے کا ثبوت ملا ہے الیکٹران، پروٹان وغیرہ برقی لہریں ہیں اور ایٹم کے اجزائے ترکیبی ہیں اس لئے انہیں مادی ہی کہا جا سکتا ہے ۔ کلاسیکی مادیت پسندی کا خاتمہ ہو چکا ہے لیکن مادیت پسندی کی جدید ترین صورت یعنی جدلیاتی مادیت پسندی جدید سائنس کے عین مطابق ہے ۔ یہ کہنا کہ مادیت پسندی کے ساتھ تو جدلیاتی مادیت پسندی کا بھی خاتمہ ہو گیا ہے محض ہرزہ دری ہے ۔ جدلیاتی مادیت پسندوں نے خود کلاسیکی مادیت پسندی کو رد کر دیا ہے مادے اور توانائی کے متبادل ثابت ہونے سے اُن کے اس نظریے کی نفی نہیں ہوتی کہ مادہ ایک معروضی حقیقت کے طور پر موجود ہے یعنی وہ ذہن انسانی سے آزادانہ اپنا مستقل بالذات وجود رکھتا ہے اس لحاظ سے مادہ ٹھوس تھا تو بھی معروضی تھا اور توانائی کی لہروں میں تحلیل ہو جانے کے باوجود وہ معروضی ہی ہے کیونکہ توانائی کی لہریں اپنے وجود کے لئے ذہن انسانی کی محتاج نہیں ہیں ۔

دوسری قابل غور بات یہ ہے کہ توانائی کی لہروں میں بے شک آزادہ روی پائی جاتی ہے لیکن یہ لہریں

جب مادی شکل اختیار کر لیتی ہیں تو سلسلہ سبب و مسبب کی گرفت میں آ جاتی ہیں۔ یہاں ایک حکایت کا ذکر بے محل نہ ہوگا۔ کہتے ہیں کہ ایک دن ڈاکٹر جانسن اپنے کسی دوست کے ساتھ گلی میں جا رہا تھا اور مادے کی ماہیت پر دونوں میں بحث ہو رہی تھی۔ ڈاکٹر جانسن کا دوست بشپ بارکلے کے انداز میں مادے کے وجود سے انکار کر رہا تھا۔ ڈاکٹر جانسن نے چلتے چلتے راستے میں پڑے ہوئے ایک پتھر کو ٹھوکر سے پھینک دیا اور کہا "میرے لئے مادے کے وجود کے لئے یہی ثبوت کافی ہے۔ یہ پتھر آج کل کی تحقیقات کی رو سے توانائی کی آزادہ رو لہروں ہی کی منجمد صورت تھی لیکن اپنی ٹھوس صورت میں یہ پتھر قانون سبب و مسبب کی گرفت میں تھا۔ اسی لئے ڈاکٹر جانسن نے ٹھوکر ماری تو وہ پرے جا گرا۔ اس مفہوم میں ہم مرئی کائنات کو مادی کہہ سکتے ہیں۔ جہاں بھی قانون سبب و مسبب کارفرما ہے۔ آزادہ روی یا قدرِ اختیار توانائی کی لہروں کی حرکت میں ہو تو ہو لیکن جب یہ لہریں ٹھوس مادے کی صورت اختیار کر لیتی ہیں تو ان پر قانون سبب و مسبب حاوی ہو جاتا ہے۔

جدلیاتی مادیت پسندوں کو اس بات سے کوئی غرض نہیں ہے کہ مادے کی ماہیت کیا ہے کیونکہ اس بات کو معلوم کرنا سائنس دانوں کا کام ہے وہ تو اتنا جانتے ہیں کہ مادے کی ماہیت خواہ کچھ بھی ہو وہ معروضی صورت میں موجود ہے۔ اڈنگٹن کہتا ہے کہ ایٹم کے اجزا کی حرکت آزادانہ ہے۔ ہائزن برگ کے خیال میں الیکٹران آزادہ رو ہیں لیکن اس سے عالم طبیعی میں قانون سبب و مسبب کی نفی نہیں ہوتی گویا اس مرئی کائنات پر طبیعی قوانین کا تصرف باقی و برقرار ہے۔ پلانک اور آئن سٹائن بھی کائنات کی معروضیت کے قائل ہیں میکس پلانک کہتا ہے۔

" خارجی عالم کا انحصار ہم پر نہیں ہے بلکہ وہ مستقل بالذات حیثیت میں موجود ہے۔ ہمیں اسی حقیقت کو تسلیم کر لینا چاہئے۔ خارجی عالم پر حاوی و مطلق قوانین کا انکشاف ہی میرے خیال میں سائنس دانوں کی زندگی کا حیرت انگیز معمول رہا ہے۔" آئن سٹائن کے الفاظ ہیں۔

" تمام طبیعی علوم کی بنیاد یہ عقیدہ ہے کہ خارجی عالم ادراک کرنے والے موضوعات سے آزاد و بے نیاز ہے"

نو حقیقت پسند بھی عالم کے حقیقی و معروضی ہونے کے قائل ہیں۔ نو حقیقت پسندوں کے خیال میں خارجی عالم حقیقی عالم ہے اور اسے

حرفِ آخر

جے، جی فریزر "گولڈن بو" میں لکھتا ہے۔

"انسان کی آرزوئیں، حسرتیں اور تمنائیں ہر کہیں ایک ہی جیسی رہی ہیں۔ البتہ اس نے ان کی تکمیل اور تشفی کے لئے جو وسائل اختیار کئے ہیں وہ بھی ملتے جلتے ہیں۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس مقصد کے لئے پہلے اس نے جادو کا ہاتھ تھاما اور پھر مذہب کے توسط سے سائنس تک جا پہنچا۔ پہلے پہل اس نے ایک بچے کی طرح یہ جانا کہ اس کی ہر خواہش ہی اس کی تشفی کا سامان فراہم کر دیتی ہے جیسے بچے کو بھوک لگے تو وہ روتا ہے۔ اور اسے فوراً دودھ مل جاتا ہے مرورِ زمانہ سے جب اسے یہ احساس ہوا کہ ہر خواہش لازمی تشفی مہیا نہیں کرتی تو اس نے ان غیر مرئی ہستیوں کا سہارا لیا جو مظاہرِ فطرت کے عقب میں کارفرما ہیں۔ اور جنہیں اس نے اپنی ہی طرح کے مگر اپنے سے بہت بڑے انسان تصور کر لیا اور انہیں دیوتا بنا کر ان سے حاجات طلب کرنے لگا۔ اس مرحلے پر مذہب نے جادو کی جگہ لے لی لیکن وقت کے گزرنے کے ساتھ اس کا شعور بیدار ہوا۔ تو اسے معلوم ہوا کہ یہ فوق الطبع ہستیاں اس کے اپنے ہی تخیل کی مخلوق ہیں۔ اور اس کے بگڑے ہوئے کام سنوارنے سے عاجز ہیں تو اس نے فطری مظاہر پر دوبارہ غور کیا اور قانونِ سبب و مسبب دریافت کیا جس پر تحقیقی علوم کی بنیادیں رکھی گئیں اسے معلوم ہو گیا کہ کائنات پر چند ایسے قوانین حاوی ہیں جو غیر متبدل ہیں۔ اور جنہیں بخوبی سمجھ لینے ہی سے وہ اپنے مقاصد کی تکمیل کر سکتا ہے۔ یہ مرحلہ سائنس کا ہے۔ سائنس ہی کے ساتھ انسان کا مستقبل وابستہ ہے"۔

ہم نے اپنا سفر زروان کے مت سے شروع کیا تھا جو سائنس پر آ کر ختم ہو گیا۔ ہم نے دیکھا کہ زروان کے مت سے انسان نے

اس بے کراں کائنات کے ساتھ تخلیقی اور جذباتی رشتہ جوڑ کر اپنی بے بسی اور دہشت کا مداوا کرنا چاہا ۔ اُس نے مظاہر کائنات سے دیوتا منسوب کیے تاکہ وہ ان کے ساتھ دلی یگانگت پیدا کر سکے ۔ کائنات سے مناسبت اور مطابقت کی یہ کاوشیں جادو ، دیومالا ، مذہب اور روحانیت پسندی کی صورت میں جاری رہیں حتیٰ کہ ذہنی ارتقا کے ساتھ انسان کی دہشت جذبۂ تجسس و حیرت میں بدل گئی قوانینِ فطرت کا کھوج لگانے اور ان سے کام لینے کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے اعتمادِ نفس کو تقویت ہوئی ، روحوں کے مت سے لے کر روحانیت پسندی تک اس کی ساری کوششوں کا حاصل یہ تھا کہ کسی طرح وہ موت اور فنا پر قابو پالے اور اپنی روح کی بقا کے حصول پر قادر ہو جائے ۔ سائنس کے ارتقا کے ساتھ اس نے روح اور حیات بعد الممات سے قطع نظر کر لی اور کائنات میں از سرِ نو اپنے مقام کا تعین کرنے کی ٹھان لی تاکہ عالمِ عقبیٰ کے بارے میں پریشان ہونے کی بجائے وہ اسی دنیا میں اپنی فرصتِ مستعار کو احسن طریقے سے گزار سکے ۔ سائنس نے اسے ایک نیا حقیقت پسندانہ اندازِ نظر بخشا اور اس نے مذہبیت ، باطنیت اور روحانیت سے دامن بچا کر اپنے معاشرتی عقدوں کو سلجھانا چاہا ۔ اس کوشش میں اس کے ذہن پر یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ نااتفاقی کا خاتمہ کر کے ہی وہ ایک ایسا معاشرہ قائم کر سکتا ہے جس کے تمام افراد مسرت ، خوشحالی اور آسودگی کی زندگی بسر کریں ۔ جدید ہیئت نے کائنات کی بے کراں وسعتوں اور اتھاہ پہنائیوں کا انکشاف کیا ہے لیکن اب انسان ان سے خوف زدہ نہیں ہے بلکہ مردانہ وار ان کا مشاہدہ کرنا چاہتا ہے ۔ اب وہ اپنی ذات کے سوا کسی مافوق الفطرت ہستی کا سہارا لینے کے بارے میں نہیں سوچتا ۔ وہ جانتا ہے کہ موت اٹل ہے اس لئے وہ اپنی زندگی سے پوری طرح فیض یاب ہونے کا متمنی ہے ۔ جہاں سائنس نے اس سے خیالی سہارے اور جذباتی بیساکھیاں چھین لی ہیں وہاں اسے اپنی ہی ذات پر بھروسہ کرنے کی ہمت بھی دلائی ہے ۔ اسے معلوم ہو گیا ہے کہ اب وہ جذباتی لحاظ سے بچہ نہیں رہا بلکہ بالغ ہو گیا ہے ۔ ظاہر ہے ایک بالغ شخص اپنی ذات کے سوا کسی دوسرے کا سہارا تلاش نہیں کیا کرتا ۔ گزشتہ ہزاروں برسوں کے توہمات اس کے ذہن و قلب میں اس درجے راسخ ہو چکے ہیں کہ ان سے پیچھا چھڑانا گویا گوشت کو ناخن سے جدا کرنا ہے لیکن وہ جانتا ہے کہ خواہ کتنے ہی عذاب ناک ذہنی کرب سے گزرنا پڑے ایک نہ ایک دن حقائق کا سامنا کرنا ہی پڑتا ہے ۔ انسان کو امید واثق ہے کہ وہ ایک نہ ایک دن اپنے سیاسی ، معاشی اور عمرانی عقدے

سمجھانے میں کامیاب ہو جائے گا۔ رُوحوں، کرامت، جادو، دیو مالا، مذہب اور مثالیت پسندی موت اور فنا کے دہشت پروردہ تھے۔ سائنس نے حیات سے جنم لیا تھا۔ سائنس کا تعلق [illegible] آثار کیلئے جس حیات کی روشنی سے ہے۔ اور قرین دانش یہی ہے کہ موت کے گھور اندھیاروں میں کھو جانے سے پہلے آدمی زیادہ سے زیادہ حیات کی روشنی سمیٹنے پر آمادہ ہو جائے اور پھولوں کی طرح مرجھانے سے پہلے اپنے چاروں طرف مہک اور مسکراہٹیں بکھیرتا رہے کہ اسی حیات فانی میں یہی اس کا اصل مقام ہے۔

اُردو کُتب خانہ
URDUKUTABKHANAPK.BLOGSPOT